BAUL(N) - 121

بی.اے.اُردو

سمسٹر دوم

BACHELOR OF ARTS (URDU)

SECOND SEMESTER

MINOR VOCATIONAL

خاکہ نگاری اور سوانح نگاری

KHAKA NIGARI AUR SAWANIH NIGARI

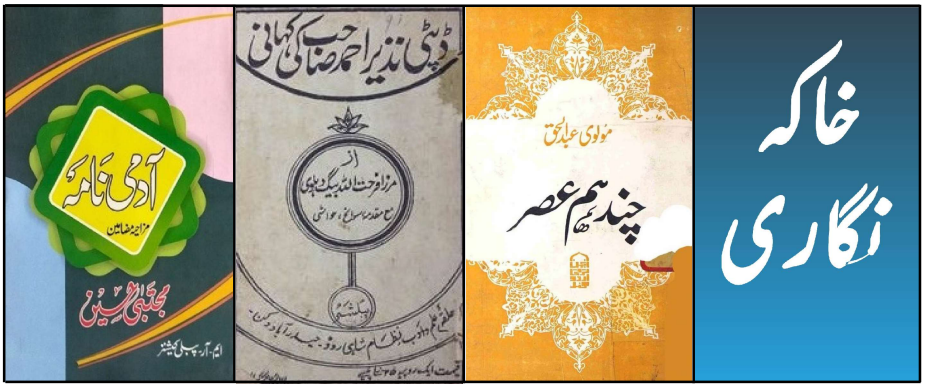

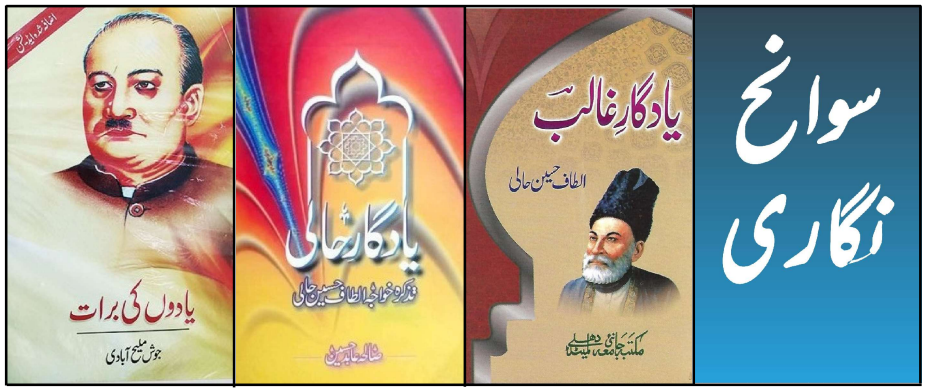

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

بی.اے.اُردو

BACHELOR OF ARTS (URDU)

سالِ اوّل

FIRST YEAR

سمسٹر دوم

SECOND SEMESTER

بی.اے. یو.ایل (این.) - ۱۲۱ - خاکہ نگاری اور سوانح نگاری

BAUL(N) - 121, KHAKA NIGARI AUR SAWANIH NIGARI

MINOR VOCATIONAL

اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

سرپرستِ اعلیٰ:

پروفیسر او. پی. ایس. نیگی، وائس چانسلر، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

کمیٹی بورڈ آف اِسٹڈیز:

پروفیسر رینو پرکاش (ڈائریکٹر اسکول آف ہیومنٹیز (SOH) اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی (UOU)، ہلدوانی۔

پروفیسر توقیر احمد خاں، ریٹائرڈ پروفیسر شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی۔

پروفیسر سید محمد ارشد رضوی، گورنمنٹ رضا پی. جی. کالج، رام پور، اُتر پردیش۔

شہپر شریف، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

محمد افضل حسین، اسسٹنٹ پروفیسر و کورس کوآرڈِنیٹر شعبۂ اُردو، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

رجسٹرار:

پروفیسر پی. ڈی. پنت، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

کورس کوآرڈِنیٹر وایڈیٹر:

محمد افضل حسین (اُستاد بریلوی)، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

C جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

اس کتاب کا کوئی بھی حصّہ کسی بھی شکل میں یونی ورسٹی کی تحریری اجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔ یہ کتاب ''اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی'' کے بی. اے. اُردو سالِ اوّل، سمسٹر دوم، خاکہ نگاری اور سوانح نگاری کے نصاب کا جزو ہے۔ مزید معلومات کے لئے یونی ورسٹی حکام یا صدرِ شعبۂ اردو سے یونی ورسٹی کے حسبِ ذیل پتے پر رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

DEPARTMENT OF URDU

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

UNIVERSITY ROAD, BEHIND TRANSPORT NAGAR (Teenpani Bypass)

HALDWANI-263139 Phone:05946-261122

پیش لفظ

اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی کا قیام اُترا کھنڈ قانون ساز اسمبلی کے ایک ایکٹ کے تحت ۳۱/اکتوبر ۲۰۰۵ء کو عمل میں آیا جس کا مقصد فاصلاتی نظامِ تعلیم کے ذریعے آبادی کے بڑے حصے کے ایسے اَفراد کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل ہے جو کسی مصروفیت یا مجبوری کے سبب کالجوں یا یونی وَرسٹیوں تک نہیں پہنچ پاتے ہیں۔ یونی ورسٹی کے تعلیمی پروگرام ''بیچلر آف آرٹ'' کے تحت ''بی.اے. اردو'' کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بی.اے. اردو سالِ اوّل، سمسٹر دوم، خاکہ نگاری اور سوانح نگاری کے نصاب کا جزو ہے۔ یہ کتاب ۱۲/اکائیوں پر مشتمل ہے جو الگ الگ موضوعات پر مختلف اسباق کی شکل میں ہیں۔

عزیز طلبا و طالبات!

فاصلاتی نظامِ تعلیم کی کتابوں کو {خودتدریسی مواد{SLM}(Self Learning Material) کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو یہ مواد خود ہی پڑھنا ہے۔ روایتی درس گاہوں کے برخلاف اِسے پڑھانے کے لئے آپ کے سامنے استاد موجود نہیں ہوگا۔ اِس صورتِ حال کے تحت اسباق کو اِس طرح تیار کیا گیا ہے کہ آپ کو کلاس میں اپنی اور استاد کی موجودگی کا احساس ہو سکے۔ اِسی لئے ہر اکائی کا آغاز ''اغراض و مقاصد'' سے کیا گیا ہے تا کہ آپ کو اِس بات کا اندازہ ہو سکے کہ اکائی کو پڑھنے کا مقصد کیا ہے؟ اُس کے بعد ''تمہید'' دی گئی ہے جس میں سبق کو مختصر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اکائی کے درمیان ''اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے'' کے تحت کچھ سوالات بھی دِیے گئے ہیں تا کہ آپ نے جو کچھ پڑھا ہے، اُسے کس حد تک ذہن نشین کیا ہے؟ اِس بات کا بھی اندازہ لگایا جا سکے۔ کتاب کے آخر میں اُن سوالات کے جوابات بھی دِیے گئے ہیں لیکن آپ کو چاہیے کہ پہلے خود اُن سوالات کو حل کریں پھر آخر میں دِیے گئے جوابات سے اپنے جوابات ملالیں تا کہ آپ کو اپنی صلاحیت کا اندازہ بھی ہو اور آپ کی ذہنی ورزش بھی ہو جائے۔ امتحان میں آپ سے جس طرح کے سوالات پوچھے جائیں گے اُس کے نمونے بھی دِیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ہر اکائی کے آخر میں مشکل الفاظ کی ''فرہنگ'' اور ''حوالہ جاتی کتب'' کی فہرست بھی دی گئی ہے تا کہ آپ اُن کتابوں کے مطالعے سے اپنی معلومات میں مزید اضافہ کر سکیں۔

ہم آپ کی کامیابی کے لئے دعائیں اور نیک خواہشات پیش کرتے ہیں۔

ایڈیٹر

بی.اے.اُردو

(B.A.URDU)

سالِ اوّل

FIRST YEAR

سمسٹر دوم

SECOND SEMESTER

ایم.اے. یو.ایل.(این.) - ۱۲۱ - خاکہ نگاری اور سوانح نگاری

BAUL(N) - 121, KHAKA NIGARI AUR SAWANIH NIGARI

اکائی نمبر مضمون	مضمون نگار	
بلاک نمبر 01:		5
اکائی 1 خاکہ نگاری کا فن	محمد افضل حُسین	6
اکائی 2 اُردو میں خاکہ نگاری	ڈاکٹر ساجدہ قریشی	15
اکائی 3 نثری اصناف میں خاکہ نگاری	غلام جیلانی	26
اکائی 4 عبدالحق : ''حالیؔ''	ڈاکٹر رضی الرحمٰن	43
اکائی 5 فرحت اللہ بیگ : نذیر احمد کی کہانی	ڈاکٹر شریف احمد قریشی	58
اکائی 6 مجتبیٰ حُسین : آدمی نامہ	غلام جیلانی	72
بلاک نمبر 02:		91
اکائی 7 سوانح نگاری کا فن	محمد افضل حُسین	92
اکائی 8 اُردو میں سوانح نگاری کی روایت	ڈاکٹر شریف احمد قریشی	102
اکائی 9 حالیؔ: یادگارِ غالبؔ	ڈاکٹر سید محمود کاظمی	113
اکائی 10 صالحہ عابد حُسین : یادگارِ حالی	محمد سالم	128
اکائی 11 یادگارِ حالیؔ : صالحہ عابد حسین	ڈاکٹر اختر علی	141
اکائی 12 یادوں کی برات: جوشؔ ملیح آبادی	ڈاکٹر دبیر احمد	164

بلاک نمبر 01

اکائی 01	خاکہ نگاری کا فن	محمد افضل حُسین
اکائی 02	اُردو میں خاکہ نگاری	ڈاکٹر ساجدہ قریشی
اکائی 03	نثری اصناف میں خاکہ نگاری	غلام جیلانی
اکائی 04	عبدالحق : ''حالؔی''	ڈاکٹر رضی الرحمٰن
اکائی 05	فرحت اللہ بیگ : نذیر احمد کی کہانی	ڈاکٹر شریف احمد قریشی
اکائی 06	مجتبیٰ حُسین : آدمی نامہ	غلام جیلانی

اکائی 01 : خاکہ نگاری کا فن

ساخت

01.01 : اغراض ومقاصد
01.02 : تمہید
01.03 : اُردو میں خاکہ نگاری کی روایت
01.04 : خاکہ کی تعریف
01.05 : خاکہ کے اَجزاے ترکیبی
01.06 : خاکہ اور سوانح میں فرق
01.07 : موضوع اور مواد
01.08 : خاکہ نگاری کے اُصول وضوابط
01.09 : خلاصہ
01.10 : فرہنگ
01.11 : نمونہ امتحانی سوالات
01.12 : حوالہ جاتی کتب

01.01 اغراض ومقاصد

اِس اکائی میں آپ خاکہ نگاری کی تعریف، روایت اَور اَجزاے ترکیبی کے بارے میں تفصیل سے جانیں گے۔ خاکہ نگاری کے موضوع ومواد اَور اُصول وضوابط کا مطالعہ کریں گے۔ اِس کے ساتھ ساتھ خاکہ اور سوانح میں خطِّ اِمتیاز کھینچ سکیں گے۔ آخر میں الفاظ ومعانی، نمونۂ امتحانی سوالات اَور معاون کتب کی فہرست بھی ملاحظہ کریں گے۔

01.02 تمہید

خاکہ نگاری ایک علاحدہ صنف کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اِس کے نقوش داستانوں میں تلاش کریں یا محمد حسین آزاؔد کے تذکرے ''آبِ حیات'' میں ڈھونڈیں۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کا مضمون ''نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی، کچھ میری زبانی'' کے بعد خاکہ نگاری کی اپنی پہچان قائم ہو چکی ہے۔

ترقی کی ابتدائی منازل میں اُردو خاکہ نگاری پر انگریزی اَدب کا اَثر نظر آتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اُردو کے اَدیبوں نے نہایت جاں فشانی سے اِس کی پرورش وپرداخت کا ذِمّہ اُٹھایا اور اِس کو رعنائی وزیبائی عطا کی۔ خاکہ نگاری کے کاکل وگیسو سنوارے۔ اُن اصحاب میں تذکرہ نویس، سوانح نگار، افسانہ نگار اور مزاح نگار وغیرہ تمام لوگوں کی اپنی اپنی کاوشیں شامل تھیں۔ اِس طرح خاکہ نگاری نے کئی اصناف کی

خوبیوں سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ اِس کے علاوہ خاکہ کے منفرد اُسلوب کا بھی اِس فن کی تشکیل میں اہم حصہ رہا ہے۔ انگریزی ادب نے اِسے نئی کیفیات سے رُوشناس کرایا۔ اب خاکہ نگاری اُردو ادب ایک مضبوط و مستحکم صنف بن چکی ہے جس کے دامن میں تخلیقات کا بہترین اور کثیر سرمایہ موجود ہے۔

01.03 اردو میں خاکہ نگاری کی روایت

اُردو ادب میں خاکہ نگاری کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی؟ اِس کے متعلق حتمی طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں۔ چوں کہ خاکہ ایک نثری صنف ہے۔ اِس وجہ سے اِس کے اِبتدائی نقوش نثری اصناف میں تلاش کیے جا سکتے ہیں لیکن نثر سے پہلے شاعری کا رواج تھا جس میں قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی تین بڑی اصناف ہیں اور تینوں میں شخصی خاکے ملتے ہیں خصوصاً قصیدہ اور مرثیہ اِس سلسلے کی اہم و معتبر کڑیاں ہیں۔ نثر میں خاکہ کے نقوش تذکروں میں بھی موجود ہیں۔ خواہ وہ ''نکات الشعرا'' (میر تقی میرؔ)، ''گلشنِ بے خار'' (نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ)، ''طبقاتِ شعرائے ہند'' (مولوی کریم الدین)، یا ''آبِ حیات'' (محمد حسین آزادؔ) ہوں لیکن اِن تذکروں میں ''آبِ حیات'' کو چھوڑ کر اکثر و بیش تر میں موجود شخصی خاکے ناقص و نامکمّل ہیں۔ سرسید اور اُن کے رُفقا نے جو سوانحِ عمریاں لکھی ہیں اُن میں خاکے کی جھلک صاف پر طور نظر آتی ہے۔ چوں کہ یہ سوانحِ عمریاں کسی بھی شخصیت کا مکمّل احاطہ کرتی ہیں، اِس لئے اِن میں اختصار کے بجائے طوالت کو اپنا گیا ہے۔ اِس کے علاوہ اِن میں ہر ضروری و غیر ضروری بات کو عیاں کیا گیا ہے جو خاکے کے لئے ضروری نہیں ہے۔

درج بالا حضرات میں سے محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں جن چند شعرا کی یعنی اِنشاؔ، مصحفیؔ اور ذوقؔ و غالبؔ کی قلمی تصاویر پیش کی ہیں وہ ہر حال میں دل چسپ اَور اَہم ہیں۔ اُن کے بعد خواجہ حسن نظامی نے اِس میدان میں باضابطہ اپنے قدم آگے بڑھائے اور دلّی کی معروف و مشہور ہستیوں کی منہ بولتی اور چلتی پھرتی تصاویر ''قلمی چہرے'' کے نام سے پیش کیں۔ خواجہ صاحب کے بعد مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکوں ''نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی، کچھ میری زبانی'' اور ''دلّی کا یادگار مشاعرہ'' وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ اِس میدان میں مولوی عبدالحق کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔ اُن کے خاکوں کا مجموعہ ''چند ہم عصر'' کے نام سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔ رشید احمد صدیقی کے خاکوں کے مجموعے ''گنج ہائے گراں مایہ'' ۱۹۳۷ء، اور ''ہم نفسانِ رفتہ'' ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئے جو بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اِن کے علاوہ ''آشفتہ بیانی میری''، مضامینِ رشیدؔ'' اور ''خنداں'' میں بھی دل چسپ خاکے ملتے ہیں۔

درج بالا ادیبوں کے علاوہ جن دیگر ادیبوں نے خاکوں کی مدد سے اُردو ادب کو ثروت مند بنانے کی کاوشیں کیں، اُن میں سید عابد حسین (کیا خوب آدمی تھا)، مولوی عبد الرزاق (یادِ اَیّام)، فکر تونسوی (خدوخال)، عصمت چغتائی (دوزخی)، سعادت حسن منٹو (گنجے فرشتے، لاؤڈ اسپیکر، شخصیتیں)، اَشرف صبوحی دہلوی (دلّی کی چند عجیب ہستیاں)، شوکت تھانوی (شیش محل، قاعدہ بے قاعدہ)، ڈاکٹر اعجاز حسین (ملکِ ادب کے شہزادے)، شاہد احمد دہلوی (گنجینۂ گوہر)، محمد طفیل مدیرِ نقوش (صاحب، جناب، محترم، مکرم، آپ)، رئیس احمد جعفری (مردم دیدہ)، چراغ حسن حسرتؔ (مداوا، نارَوا، خوں بہا)، غلام احمد فرقتؔ (حسرتؔ موہانی)، عبدالمجید سالکؔ (یارانِ کہن)، مجتبیٰ حسین (آدمی نامہ، سو ہے وہ بھی آدمی، چہرہ دَر چہرہ)، مظہر امام (اَکثر یاد آتے ہیں)، اَنور ظہیر خاں (مت سہل ہمیں جانو)، کشمیری لال ذاکرؔ (آشنا چہرے)، امداد اللہ ندوی (انجمن کے چند روشن چراغ)، ندا فاضلی (چہرے) اور خالد محمود (شگفتگی دل کی) وغیرہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

01.04 خاکہ کی تعریف

خاکہ اُردو زبان کا لفظ ہے جس کا لغوی معنیٰ ''ڈھانچا، کچا نقشہ، تصویر کا مسودہ یا لکیروں سے بنائی ہوئی تصویر'' ہے۔ اصطلاح میں خاکہ سے مراد وہ تحریر ہے جس میں نہایت مختصر طور پر اِشارے اَور کنایے میں کسی شخصیت کے ناک نقشے، عادات واَطوار اَور گفتار و کردار کو سیدھے سادے اور اچھے انداز میں مبالغے کے بغیر اِس طرح پیش کیا جائے کہ اُس کی چلتی پھرتی تصویر نگاہوں کے سامنے آجائے۔

انور ظہیر خاں خاکہ سے متعلّق اپنا خیال پیش کرتے ہیں:

> ''خاکہ کسی جسمانی اور ذہنی وجود کا ایکسرے ہوتا ہے یا پوسٹ مارٹم رپورٹ.........اس میں شخصیت کو اُس کے اصلی چہرے مہرے، رفتار وافکار اور احوال وآثار کے ساتھ ایک شگفتہ، شیریں، سلیس اور رَواں دَواں پیرایے میں پیش کیا جاتا ہے۔ جہاں دال میں نمک کے برابر تخّیل کی کارفرمائی تو ہوسکتی ہے لیکن ابہام، مبالغے اور غلو کی آمیزش ناقابلِ قبول ہوتی ہے۔ اس میں داخلی اور خارجی عناصر کو ہم آمیز کرکے دُودھیا کاغذ پر اِس طرح رکھ دیا جاتا ہے کہ تمام تر حقیقت بیانیوں اور سفّاکیوں کے ساتھ خاکے کے کردار سے ذاتی ربط وضبط اور ہم دَردی کا جذبہ موجِ تہ نشین کی طرح موجود ہو وَرنہ خاکہ پایۂ اعتبار سے ساقط ہوجائے گا اور خاکہ نگار کا وقار مجروح ہوگا۔''
>
> (دیباچہ....مت سہل ہمیں جانو....ص۱۰)

نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

> ''خاکہ نگاری سوانحِ عمری سے مختلف چیز ہے کہ سوانحِ عمری میں خاکے کی گنجائش ہوتی ہے لیکن خاکے میں سوانحِ عمری مشکل سے سماتی ہے۔''
>
> (دید و دریافت...از...نثار احمد فاروقی ۱۹۶۴ء)

مذکورہ اقتباس سے یہ نتیجہ اَخذ نہیں کرنا چاہیے کہ خاکے میں زندگی سے الگ حقائق ہوتے ہیں کیوں کہ جس شخصیت پر خاکہ لکھا جاتا ہے، اُس کی زندگی کے واقعات اور اُس کے خدوخال کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ البتہ بطورِ فن دونوں میں اختصار وطوالت، آزادی اور پابندی کے لحاظ سے کچھ نہ کچھ فرق ضرور پایا جاتا ہے۔ خاکہ اور سوانح دونوں کی بنیاد حقیقی مواد پر ہوتی ہے۔

01.05 خاکہ کے اَجزاے ترکیبی

کسی بھی خاکہ کے حسبِ ذیل اَجزاے ترکیبی ہوتے ہیں:

﴿۱﴾ اختصار ﴿۲﴾ وحدتِ تاثر ﴿۳﴾ کردار ﴿۴﴾ اُسلوب

﴿۱﴾ **اختصار:** کسی بھی خاکہ کے لئے اختصار کا ہونا لازمی ہے۔ کیوں کہ خاکہ میں سوانح عمری یا خودنوشت کی طرح زیادہ طوالت کی گنجائش نہیں لہٰذا اس بنیاد پر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اس فن میں ایجاز واختصار کا طریقہ اپنایا جاتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ خاکہ

نگاری کم وبیش غزل کے فن سے مماثلت رکھتی ہے۔ جس طرح غزل کے اشعار میں طویل مفہوم یا فلسفۂ حیات کو بھی آسانی سے پیش کر دیا جاتا ہے ٹھیک اسی طرح خاکہ میں بھی کم سے کم الفاظ میں کسی شخصیت کا مرقّع پیش کر دیا جاتا ہے۔

جس طرح خراب مبتدی شاعر غزل میں اپنے موضوع کی پیش کش سے انصاف نہیں کر سکتا ٹھیک اسی طرح اگر خاکہ نگار بھی نثری اوصاف اور بالخصوص ایجاز کے فنّی رُموز و اسرار واقف نہ ہو تو ایک کامیاب خاکہ تحریر نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ خاکہ شخصیت کی اختصار بیانی ہے اس لیے اس میں بے جا طوالت کی کوئی گنجائش نہیں۔ ایسے بہت کم لوگ ہیں جو مرزا فرحت اللہ بیگ کی طرح طویل خاکہ تحریر کر سکیں۔ چونکہ خاکہ میں اختصار سے کام لیا جاتا ہے اور اختصار سے مراد یہ ہے کہ کسی بھی شخص کے اوصاف و معائب اس طرح بیان کیے جائیں کہ جس کے اندر اختصار، جامعیت اور اَثر بھی لازمی ہونا چاہیے۔

﴿۲﴾ **وحدت تاثر:** ۔ خاکہ میں افسانہ کے مثل وحدت تاثر کا ہونا بھی انتہائی ناگزیر ہے اور یہ وصف اسی وقت پیدا ہوتا ہے جس وقت کے خاکہ میں اختصار بیانی سے کام لیا جائے۔ خاکہ نگار ''تاثر'' پیدا کرنے کے لیے انتہائی مہارت اور باریک بینی سے خاکہ کی ابتدا کرتا ہے۔ پھر واقعات کے سہارے وہ اسے وسط سے لے جاتا ہے اور پھر اس کا خاتمہ مؤثر انداز میں کرتا ہے۔ ''ابتدا، وسط اور خاتمہ'' واقعات و تجربات اور مشاہدات کی مدد سے مربوط انداز میں پیش کرتا ہے جس سے وحدت تاثر کا پیدا ہونا لازمی ہے۔

﴿۳﴾ **کردار:** ۔ کردار کسی بھی خاکے کے لیے ایک بنیادی عنصر ہے جس کے گرد خاکے کی عمارت بڑے تزک واحتشام سے تعمیر کی جاتی ہے۔ اس کے بغیر خاکہ کا تصوّر بے سود و محال ہے۔ افسانوی ادب میں جس طرح کردار کی اہمیت ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح خاکہ میں ہوتی ہے۔ ناول، افسانہ اور ڈرامے میں جس طرح مرکزی کردار ہوتے ہیں اسی طرح اس میں ایک مرکزی کردار لازمی ہوتا ہے دیگر اصناف میں چند ضمنی کرادر بھی ہوتے ہیں لیکن خاکے میں ضمنی کرداروں کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک آدھ کردار کی شمولیت محض اپنی بات کو پُر زور بنانے کے لیے ہوتی ہے۔ اس لیے ہم یہ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اکثر خاکے ایک کردار والے ہوتے ہیں اور اگر دوسرا کوئی اہم کردار ہوتا بھی ہے تو وہ راوی خود ہے۔ دیگر اصناف میں کرداروں کی جو اہمیت بتائی گئی ہے وہ اس میں بڑی حد تک لازمی ہے۔

یوں تو خاکہ میں کسی شخصیت کا محض سرسری اخلاق واطوار کا بیان کر دینا بھی کافی ہوتا ہے لیکن ایک اچھے خاکے کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ اسے انسانی فطرت، انسانی نفسیات، جذبات و احساسات، عقائد و نظریات، پسند و ناپسندیدگی، عصبیت و کجروی، غرض یہ کہ خوبیوں کے ساتھ ہی خامیاں، کوتاہیوں کے حوالے سے بھی دیکھا اور دکھایا جائے۔ تب کہیں جا کر کسی کردار یا شخصیت کا مطالعہ مکمّل اور مؤثر سمجھا جائے گا۔ خاکہ نگار کے لیے یہاں یہ ضروری ہے کہ وہ بڑی حد تک معروضیت سے کام لے۔ کذب و افتراء اور بہتان طرازی سے بچے اور حقیقی تجربات و مشاہدات کی روشنی میں ہی کردار کو نمایاں کرے کیوں کہ ایسا کرنے سے ہی خاکہ میں ایک جاندار کردار بن کر اُبھرے گا۔

﴿۴﴾ **اُسلوب:** ۔ خاکہ نگاری ایسی صنف نثر ہے جس کی اپنی شناخت ہے اور یہ شناخت اسی وقت قائم ہو سکتی ہے جب کہ اس کا اپنا کوئی منفرد اسلوب ہو۔ خاکوں میں مزاح کے پھول کھلائے جا سکتے ہیں لیکن خاکے کی نثر میں بذلہ سنجی کی کثرت اور مزاح کے بیجا بوجھ سے نثر بوجھل نہیں ہونی چاہیے۔ فطری طور پر اگر شگفتگی پیدا ہو جائے تو یہ اس کے ٹھوس اُسلوب کی دلیل ہوگی۔ انشائیہ نگاری کا اسلوب اس کی آزادی

میں پوشیدہ ہے لیکن خاکہ نگاری میں ایسی کوئی آزادی نہیں۔ خاکہ نگاری میں خاکہ نگار کا خلوص اور اس کا ذاتی اندازِ تحریر ہی خاکہ کا اسلوب طے کرتا ہے۔ اسلوب بیان کے لیے خاکہ نگار بھاری بھرکم اصطلاحات اور ادق اور مغلق لفظیات سے اپنے ممدوح کو پس پردہ ڈالنا پسند نہیں کرتا۔ چوں کہ خاکہ میں کوئی نہ کوئی پیغام ضرور پوشیدہ ہوتا ہے لہٰذا اس کی ترسیل میں کسی طرح کی رکاوٹ بھی خاکے کے مقصد کو مجروح کرتی ہے۔ خاکہ ایک خود مکتفی صنف کے طور پر اردو ادب میں رائج ہو چکا ہے اس لیے اس کے پیرایۂ اظہار کو اہمیت حاصل ہے۔ اس کا اُسلوب اب دوسرے اسالیب سے مستعار نہیں رہا البتہ اکتساب کے نشانات ضرور ملتے ہیں اگرچہ خاکوں میں معروضیت کی تلاش بے معنی ہے لیکن اس کے اسلوب میں ایک طرح معروضیت ہوتی ہے۔ یہ معروضیت اور قطعیت اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ خاکہ نگار اپنی ساری توجہ اپنے ممدوح و موصوف پر مرکوز رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں انشائیے کی طرح بہکنے کے مواقع بہت کم آتے ہیں۔

خاکے بیانیہ نثر میں لکھے جاتے ہیں۔ چوں کہ اس صنف میں خاکہ نگار اور ممدوح کے ابعاد ہوتے ہیں اس لیے اگر بیانیہ اسلوب نثر سے کام نہ لیا جائے تو دونوں میں تعلق پیدا کرنا مشکل ہو جائے۔ اس بیانیہ اُسلوب میں لفظوں اور محاوروں کے برتنے میں خاص احتیاط کی ضرورت پڑتی ہے۔ ضرب الامثال اور روزمرّوں پر اگر خاکہ نگار کو قدرت حاصل ہے تو اُسلوب سادہ و پرکار، شگفتہ اور اثر انگیز تشکیل پاتا ہے۔ انشائیہ نگاری میں یہی اُسلوبِ نگارش دل کشی پیدا کرتا ہے لیکن جہاں انشائیہ میں ہر طرح کی آزادی ہوتی ہے، خاکہ نگاری میں بے جا طوالت، بے جا مبالغہ آرائی، لفظوں کا اسراف، موضوع سے الگ ہٹنا وغیرہ عیوب کے زُمرے میں آتے ہیں۔

خاکہ نگاری میں حد درجہ شعری اسلوب اپنانے سے بھی غیر فطری پن پیدا ہو جاتا ہے۔ لفظی تحشّم اور تراکیب کی گراں باری سے پرہیز کرنے کے بعد ہی خاکہ نگاری کا اپنا اسلوب وضع ہو سکتا ہے۔ اچھا خاکہ وہی لکھ سکتا ہے جس کا ذہن اصطلاح سازی میں نہیں اُلجھے۔ اسی لئے آپ نے دیکھا ہوگا کہ کسی بڑے ناقد نے اچھے خاکے نہیں لکھے۔ کسی بھی خاکہ کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار خاکہ نگار کے اُسلوب اور طرزِ نگارش پر ہی ہے اس لیے یہ کسی بھی خاکہ کا سب سے اہم عنصر ہے۔

01.06 خاکہ اور سوانح میں فرق

خاکے میں جہاں کسی شخصیت کی جھلک پیش کی جاتی ہے تو وہیں سوانح میں کسی کی زندگی کی تفصیلات مکمّل جزئیات کے ساتھ پیش کرنا ہوتی ہیں۔ خاکے میں یہ گنجائش نہیں ہوتی کہ کسی شخصیت کے علمی فتوحات اور دیگر کارناموں کا جائزہ پیش کیا جائے البتّہ سوانح میں اس کی پوری گنجائش موجود ہوتی ہے۔ سوانح میں مکمّل تفصیل کے ساتھ ممدوح کی شخصیت کو پیش کیا جاتا ہے لیکن خاکے میں اس طرح غیر ضروری تفصیلات کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔

اسی لئے خاکہ نگار کے لئے لفظوں کو برتنے کی حد تک کفایت شعاری پر دَست رَس ہونا لازمی ہے۔ کسی کی سیرت میں مضحکہ پہلو کے عناصر ہو سکتے ہیں لیکن خاکے یا مرقعے میں اس کی گراں باری سے خاکہ نگاری کے فن کا توازن بگڑ سکتا ہے۔ اس لئے خاکہ نگار کو محتاط طریقے سے اپنے اُسلوب کو قائم رکھنا پڑتا ہے۔ اگر ماہر نثر نگار نہ ہو تو خاکہ اور وہ بھی ایک کامیاب خاکہ لکھنا اس کے لئے مزید مشکل ہو جائے گا۔ اور اگر اس نے کوشش کی تو ممکن یہ ہے کہ خاکہ کسی کارٹون میں تبدیل ہو جائے جو کہ بلاشبہ فن خاکہ نگاری کے منصب کے منافی ہوگا۔ حالاں کہ انگریزی میں اسٹیل اور ایڈیسن کے کرداری خاکوں میں انشائیہ اور مزاح کے عناصر سے شگفتگی و تازگی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مگر اردو میں اس ڈگر پر چلنا خطرے سے خالی نہیں۔ البتہ اتنی بات طے ہے کہ اگر خاکہ نگار خوش مذاق اور بذلہ سنج ہے تو اس کی تحریروں میں شگفتگی اور بے تکلّفی اپنے آپ ہی پیدا ہو جائے گی۔ جیسے مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریر ''نذیر احمد کی کہانی'' سے ایک مختصر اقتباس پر نظر ڈالتے ہیں جس میں حقیقت حال سے انحراف نہ ہونے کے باوجود بھی خوش مذاقی اور شگفتہ اندازِ تحریر سے مزاح کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

ملاحظہ کیجیے:

''خوش خوراک تھے اور مزے لے لے کر کھانا کھاتے تھے۔ ناشتے میں دو نیم برشت انڈے ضرور ہوتے تھے۔ میوے کا بڑا شوق تھا۔ ناشتہ اور کھانے کے ساتھ میوے کا ہونا لازمی تھا۔ پڑھاتے جاتے تھے اور کھاتے جاتے تھے مگر مجھ کو ایک حسرت رہ گئی کہ کبھی شریکِ طعام نہ ہو سکا۔ خیر پٹھانوں کی جماعت کی کیا صلاح لیتے، ان کے منھ میں مولوی صاحب کا ناشتہ اونٹ کی داڑھ میں زیرہ ہو جاتا، البتہ ہم دونوں صلاح نہ کرنا غضب تھا۔ کہتے بھی جاتے تھے ''بھئی کیا خربوزہ ہے، میاں کیا مزے کا آم ہے'' مگر بندۂ خدا نے کبھی یہ نہ کہا کہ بیٹا ذرا چکھ کر تو دیکھو کہ یہ کیسا ہے۔ میں نے تو یہ تہیّہ کر لیا تھا (میاں دانی اب انکار کریں تو کریں، لیکن ان کا بھی ارادہ یہی تھا) کہ مولوی صاحب اگر جھوٹے منھ سے شریک ہونے کو کہیں تو سچ مچ شریک ہو جائیں''

اسی طرح ڈاکٹر خلیق انجم کی تحریر ''استاد رسا دہلوی'' سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''ایک دفعہ ہندوستان کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے استاد پٹھانوں کو من من بھر گالیاں دے رہے تھے۔ میں خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ اچانک استاد کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ یعنی انہیں خیال آ گیا کہ میں بھی پٹھان ہوں۔ فوراً بات بدل دی، ''میاں سب پٹھان ایک سے تھوڑے ہوتے ہیں ان میں کچھ ایسے شریف اور نیک بھی ہوتے ہیں جن کے آگے سیّد کچھ بھی نہیں۔ اب جیسے یہ میرا بھتیجا ہے اس کے خاندان کے کسی فرد سے ملیے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں سے ملاقات ہو رہی ہے۔'' (حالاں کہ استاد کی میرے خاندان کے بارے میں ایمان داری سے یہ رائے نہیں ہے۔)''

01.07 موضوع اور مواد

اصنافِ ادب میں سے کسی بھی صنف کو کامیابی سے برتنے کے لئے موضوع اور مواد کا مناسب انتخاب اور اس سے متعلّق دل چسپی لازمی و ضروری ہے۔ یہ نظریہ خاکہ نگاری کے مزید اہم ہو جاتا ہے۔ چوں کہ اس میں وسعت کم ہونے کے باوجود بہت کچھ بیان کرنا ہوتا ہے اسی لئے موضوع کے انتخاب میں بڑے حزم و احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ خاکے میں منتخب کردہ شخصیت کے بارے میں خاکہ نگار کو جتنی بھی واقفیت ہوتی ہے اس میں یہ دیکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ کس کس گوشے کو خاکے کا حصّہ بنایا جا سکتا ہے اور کس گوشے کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

موضوع اور مواد یعنی پہلے شخصیت (ممدوح) کا انتخاب پھر اس سے متعلق مواد مہیّا کرنا ایک بڑا اور اہم کام ہوتا ہے۔ اس مرحلے کے بعد خاکہ نگار یہ بھی دیکھتا ہے کہ اس شخصیت سے متعلق جمع کیے گئے یا ذاتی واقفیت پر مبنی مواد کیا کچھ ہے جو کہ خاکہ میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ موضوع کے لئے بڑی شخصیت کا ہونا ضروری نہیں۔ البتہ خاکہ اس آدمی کا دل چسپ ہو سکتا ہے جس کی زندگی میں ڈرامائی عناصر ہوں یا اس کی زندگی کے نشیب و فراز اور روز و شب معمولاتِ زندگی سے قدرے مختلف ہوں۔ لیکن جو ماہر اور منجھے ہوئے فن کار اور خاکہ نگار ہوتے ہیں وہ

لوگ عام اور غیر دل چسپ موضوعات میں بھی اپنی قوّتِ تخلیق اور فنّی بصیرت کی مدد سے خاکے میں جان ڈال دیتے ہیں۔

اسی تعلق سے پروفیسر شمیم حنفی لکھتے ہیں:

''باکمال لکھنے والوں نے، بہ ظاہر عام اور غیر دل چسپ دکھائی دینے والی شخصیتوں کے بھی ایسے خاکے لکھے ہیں جو ہماری بصیرتوں، ہمارے احساسات، ہماری فکر اور ہمارے جذبات کو کسی نہ کسی طرح اپنے حصار میں لے لیتے ہیں۔ مانوس حقیقتیں غیر مانوس بن جاتی ہیں اور عام انسانی اوصاف غیر معمولی نظر آنے لگتے ہیں۔ کامیاب خاکہ نگار وہ ہے جس کی آستین میں روشنی کا سیلاب چھپا ہوا ہو اور جو واقعات کی اُوپری پرت کے نیچے، معمولات کے ہجوم میں کھوئی ہوئی، ایسی حقیقتوں کو بھی اپنی گرفت میں لے سکے جن تک عام لکھنے والوں کی نگاہ پہنچتی ہی نہیں۔ اسی لئے ہر اچھا خاکہ ایک دریافت ہوتا ہے، کسی کہانی یا شعر کی طرح۔ ہم اس کے واسطے زندگی کی کسی عام سچائی تک پہنچنے کے بعد بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سچائی کو ہم نے آج ایک نئے زاویے سے دیکھا ہے۔ اور یہ کہ معنی کی ایک نئی جہت ہم پر روشن ہوئی ہے۔''

(مقدمہ..''آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ..شائع کردہ..اردو اکادمی...ص۱۰)

خاکہ کے حوالے سے موضوع (ممدوح) کے انتخاب میں کیا بات اہم ہوتی ہے اس کا اندازہ مذکورہ بالا اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے ہماری نظر مولوی عبدالحق کے ذریعے تحریر کردہ دو خاکوں پر پڑتی ہے ان میں ایک کا نام ''دیو...مالی'' اور دوسرے کا نام ''گدڑی کا لال...نورخاں'' ہے۔ اس بات کی مزید تصدیق کے لئے مولوی عبدالحق کے مشہور خاکے ''گدڑی کا لال..نورخاں'' سے شروع کا اقتباس کا مطالعہ کرتے ہیں جس سے خاکہ نگاری سے متعلق ان کی تنقیدی فکر کا اندازہ ہوجاتا ہے:

''لوگ بادشاہوں اور امیروں کے قصیدے اور مرثیے لکھتے ہیں۔ نام وَر اور مشہور لوگوں کے حالات قلم بند کرتے ہیں۔ میں ایک غریب سپاہی کا حال لکھتا ہوں اس خیال سے کہ شاید کوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولت مندوں، امیروں اور بڑے لوگوں کے ہی حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لئے سبق آموز ہوسکتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں کوئی امیر اور غریب کا کوئی فرق نہیں۔''

اب یہ بات مزید واضح ہوگئی کہ سوانح نگاری کی طرح خاکہ نگاری میں بھی ممدوح کا عظیم یا بہت اہم ہونا ضروری نہیں۔ ایمرسن نے کسی موقع پر لکھا تھا کہ ایک عظیم آدمی کی ضرورت ہے تاکہ ایک عظیم تر آدمی کی تشریح ہوسکے۔

01.08 خاکہ نگاری کے اُصول وضوابط

﴿۱﴾ خاکہ نگار یہ کوشش کرے کہ ممدوح کی شخصیت کے کھولنے میں اس کے ذہنی میلانات اور نفسیات تک رسائی حاصل ہوجائے۔

﴿۲﴾ جس شخصیت کا خاکہ تحریر کیا جارہا ہے اس کے چہرے بشرے اور اس کی نشست وبرخاست کی پیش کش میں خاکہ نگار زیادہ نمک مرچ نہ لگا کر پیش کرے۔

﴿۳﴾ حد درجہ جزئیات نگاری اور علمی فتوحات سے پرہیز کرے۔

﴿۴﴾ کسی بڑی شخصیت کا خاکہ لکھنے کے لئے اس کے عہد کے سیاسی وسماجی، ادبی خیالات اور سرگرمیوں سے بھی واقف ہونا بہت ضروری ہے۔

﴿۵﴾ شخصیت یا اس کے کسی کارنامے پر خاکہ نگار اپنی تنقیدی رائے دینے پر ہیز کرے۔

﴿۶﴾ ذاتی پسند و ناپسند سے زیادہ خاکہ نگار ممدوح کے سچے حالاتِ زندگی اور حرکات وسکنات پر نظر رکھے۔

﴿۷﴾ خاکہ نگار اپنے ممدوح سے ہم دَردی ضرور رکھے لیکن جانب داری سے بھی پرہیز کرے۔

﴿۸﴾ خاکہ محض زبان کے چٹخارے کے لئے نہیں لکھا جائے بلکہ اس میں کوئی نہ کوئی سبق آموز پہلو بھی ہو۔

﴿۹﴾ ممدوح کی شخصیت کو خاکہ نگار خود پر کبھی بھی حاوی نہ ہونے دے اور نہ خود اس پر حاوی ہونے کی کوشش کرے۔

﴿۱۰﴾ خاکہ میں زبردستی مزاح پیدا کرنے سے اس کا پورا نظامِ نثر مجروح ہوسکتا ہے۔

01.09 خلاصہ

اُردو کی نثری اصناف میں خاکہ نگاری ایک اہم صنف ہے۔ خاکہ اُردو زبان کا لفظ ہے جس کا لغوی معنی ''ڈھانچا، کچا نقشہ، تصویر کا مسودہ یا لکیروں سے بنائی ہوئی تصویر'' ہے۔ اصطلاح میں خاکہ سے مراد وہ تحریر ہے جس میں نہایت مختصر طور پر اِشارے اَور کنایے میں کسی شخصیت کے ناک نقشے، عادات واَطوار اَور گفتار وکردار کو سیدھے سادے اور اچھے انداز میں مبالغے کے بغیر اِس طرح پیش کیا جائے کہ اُس کی چلتی پھرتی تصویر نگاہوں کے سامنے آجائے۔

اِس اکائی میں آپ نے خاکہ نگاری کی تعریف، روایت اَور اَجزاے ترکیبی کے بارے میں تفصیل سے جانا۔ خاکہ نگاری کے موضوع ومواد اَور اُصول وضوابط کا مطالعہ کیا۔ اِس کے ساتھ ساتھ خاکہ اور سوانح میں فرق کو سمجھا۔ آخر میں الفاظ ومعانی، نمونۂ امتحانی سوالات اَور معاون کتب کی فہرست بھی ملاحظہ کی۔

01.10 فرہنگ

آمیزش	: ملاوٹ، ملونی	روشناس	: واقف کار
ابہام	: پوشیدگی	سفّاکی	: خوں ریزی
اختتام	: آخر ہونا، ختم ہونا	ضمن	: اندر، تحت
افتراق	: جدائی، پھوٹ ڈالنا	عیاں	: ظاہر
افکار	: فکر کی جمع، سوچ، غور	کاکل وگیسو	: بال، زلفیں
بنیاد	: نیو، جڑ	مبہم	: پوشیدہ
پرورش وپرداخت	: پالنا پوسنا اور سنوارنا	متبادل	: بدل
تشکیل	: شکل بنانا	مذکورہ	: ذکر کیا ہوا

ثروت مند	:	مال دار	مستعمل	:	استعمال میں لایا ہوا
جاں فشانی	:	کڑی محنت	مشترک	:	شرکت
خدوخال	:	ابتدائی شکلیں	ملحوظ	:	لحاظ کیا ہوا
رفقاء	:	رفیق کی جمع، دوست	نکتہ	:	چھپی ہوئی اچھی باتیں

01.11 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : خاکہ کی تعریف کیجیے؟

سوال نمبر۲ : خاکہ اور سوانح کا فرق واضح کیجیے؟

سوال نمبر۳ : خاکہ نگاری سے متعلق شرائط و ہدایات بیان کیجیے؟

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : خاکہ سے متعلق اہم اَجزا کی نشان دہی کیجیے؟

سوال نمبر۲ : اردو خاکہ نگاری کی روایات پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کیجیے؟

سوال نمبر۳ : موضوع اور مواد سے متعلق اپنا اظہارِ خیال سپردِ قرطاس کیجیے

01.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ از پروفیسر شمیم حنفی

۲۔ اردو کے بہترین شخصی خاکے از مبین مرزا

۳۔ دید و دریافت از نثار احمد فاروقی

۴۔ مت سہل ہمیں جانو، ممبئی از انور ظہیر خاں

اکائی 02 : اُردو میں خاکہ نگاری

ساخت

02.01 : اغراض ومقاصد

02.02 : تمہید

02.03 : خاکہ کی تعریف

02.04 : خاکہ کے عناصرِ ترکیبی

02.05 : خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش

02.06 : اُردو میں خاکہ نگاری کی روایت

02.07 : اردو کے تین اہم خاکہ نگار

02.08 : اردو کے تین اہم خاکوں کے مختصر اقتباسات

02.09 : خلاصہ

02.10 : فرہنگ

02.11 : نمونہ امتحانی سوالات

02.12 : حوالہ جاتی کتب

02.01 اغراض ومقاصد

اُردو نثر کی دیگر اصناف کی طرح خاکہ نگاری بھی ایک اہم صنف ہے۔اس لئے اُردو کے ہر طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاکہ کی صنف، خاکہ نگاری کے فن اور خاکہ نگاری کی روایت سے اچھّی طرح واقف ہو۔انہیں مقاصد کے مدِّنظر اس اکائی میں خاکہ نگاری کی تعریف، فن اور روایت سے متعلّق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔مزید معلومات کے لئے تین اہم خاکہ نگاروں کا تعارف اور تین اہم خاکوں کے اقتباسات بھی پیش کیے گئے ہیں۔

02.02 تمہید

اُردو ادب میں خاکہ کی روایت زیادہ قدیم نہیں ہے۔اس کا شمار نثر کی جدید صنف میں کیا جاتا ہے۔نثر کی دیگر اصناف کے مقابلے میں یہ ایک نوخیز صنف ہے۔خاکہ کے ابتدائی نقوش داستانوں، قصّوں، کہانیوں، مثنویوں اور تذکروں میں نظر آتے ہیں۔تاریخی اور سوانحی کتب میں بھی بعض اشخاص کی صورت وسیرت کے غیر واضح نقوش اُبھرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

اگر آپ نے خاکہ کے بارے میں کبھی کچھ پڑھا ہوگا تو آپ کو یہ پتہ ہوگا کہ خاکہ کے ذریعہ کسی شخص کی نہ صرف صورت وسیرت کو اُجاگر کیا جاتا ہے بلکہ اُس کی خارجی اور داخلی خوبیوں اور خامیوں کو بھی جیوں کا تیوں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔شاید اسی لئے خاکہ نگاری یا شخصی تصویر کشی کو مشکل فن سے تعبیر کیا گیا ہے۔خاکے میں انسان کو نہ تو فرشتہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور نہ صرف اُس کی خامیوں ہی کی عکّاسی کی جاتی ہے بلکہ ایک انسان کو اُس کی صفات کے ساتھ انسانی پیکر ہی میں پیش کیا جاتا ہے۔

اگر آپ کسی عمدہ خاکہ کے ذریعہ کسی شخص کی شخصیت وکردار کا مطالعہ بہ غائر نظر کریں گے تو اُس کے نقوش آپ کے دل وذہن پر ثبت ہو جائیں گے اور متعلّقہ شخص متحرک ہو کر آپ کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے گا۔صنف خاکہ اس قدر اہم اور دل چسپ ہے کہ یہ تفریحِ طبع کے ساتھ اہم ہستیوں سے متعارف بھی کراتی ہے۔

02.03 خاکہ کی تعریف

انگریزی میں خاکہ کو اسکیچ (Sketch) کہا جاتا ہے جس کے لغوی معانی ڈھانچہ یا تصویر کا مسودہ ہے۔اُردو میں اسکیچ کے لئے خاکہ کے علاوہ متعدد اصطلاحات وضع کی گئی ہیں جن میں سے قلمی تصویر، مرقع، شخصی مرقع، شخصی تصویر اور شخصی خاکہ قابلِ ذکر ہیں۔قلمی تصویر یا مرقع میں متعلّقہ شخص کے سراپا، عادات واطوار وغیرہ پر زیادہ توجّہ دی جاتی ہے جب کہ خاکے کا مفہوم زیادہ وسیع ہے یعنی خاکہ میں حقیقی یا خیالی شخص کی شخصیت اور کردار کی خصوصیات اُس کی نفسیات کی تہوں کو کھولنے کے ساتھ اُس کی خوبیوں اور خامیوں کو بھی اُجاگر کیا جاتا ہے۔قلمی تصویر، مرقع اور شخصی مرقع کی اصطلاحات حقیقی یا اصلی شخصیات اور کرداروں کے لئے تو موزوں معلوم ہوتی ہیں مگر خیالی شخصیتیں اور کردار ان کے دائرے سے خارج ہیں کیوں کہ خاکہ کا تعلّق اصلی اور خیالی دونوں طرح کی شخصیات وکردار سے ہے اس لئے اسکیچ کا مکمّل مفہوم خاکہ ہی سے واضح ہوتا ہے۔

ادب میں اسکیچ یعنی خاکہ کی تعریف بھی یہی ہے کہ اصلی، حقیقی یا خیالی شخص کی شخصیت وخدوخال، نفسیات اور بعض پوشیدہ گوشوں کی نقاب کشائی اس طرح کی جائے کہ قاری کے ذہن ودل پر اُس کے نقوش ثبت ہو جائیں اور متعلّقہ کردار زندہ ومتحرک نظر آنے لگے۔

اُردو ادب میں اصلی یا حقیقی اشخاص کے خاکوں کی بہتات اور خیالی افراد کے خاکوں کی تعداد بہت کم ہے اس لئے اُردو میں اسکیچ یا خاکہ کی اصطلاح صرف کرداری خاکہ (Character Sketch) کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ بیش تر ادیبوں اور مضمون نگاروں نے خاکہ کو ''شخصیت کا معروضی مطالعہ'' کہا ہے۔

چند الفاظ میں خاکہ کی تعریف اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ خاکہ صفحۂ قرطاس پر الفاظ سے بنائی ہوئی متحرک اور جان دار شبیہ ہوتی ہے۔اس کی ہیئت انشائیہ سے مشابہ ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ کسی حقیقی یا خیالی شخص کی شخصیت، سیرت وصورت اور اُس کے دل چسپ کارناموں کی جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں۔

02.04 خاکہ کے عناصرِ ترکیبی

دیگر اصنافِ ادب کی طرح خاکہ نگاری کے لئے بھی کچھ عناصرِ ترکیبی ضروری ہیں جیسے: اختصار، کردار نگاری، واقعہ نگاری، منظر نگاری اور وحدت تاثر۔

﴿۱﴾ **اختصار:** عمدہ خاکہ کا ایک اہم وصف اختصار ہے۔ اختصار سے مُراد محض لفظی کفایت شعاری یا حجم نہیں ہے بلکہ الفاظ کے ایسے اختصار سے مُراد ہے جس میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کیفیت ہو۔ ایک عمدہ خاکہ میں اختصار کے اس عمل کو الفاظ و بیان کے علاوہ خاکہ کے دیگر اجزا میں بھی ہونا چاہیے۔ اختصار یا کفایت کی خصوصیت کے مدِّنظر طویل اور مختصر یعنی دونوں طرح کے خاکے قلم بند کیے گئے ہیں جیسے مرزا فرحت اللہ بیگ کا طویل خاکہ ''نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی'' اور مولوی عبدالحق کا تحریر کردہ حکیم امتیاز الدّین کا صرف ڈیڑھ صفحہ کا مختصر خاکہ۔ دراصل کسی خاکہ کے طویل اور مختصر ہونے کا دارومدار مواد پر منحصر ہے۔ ایک طویل خاکہ متعلّقہ شخصیت سے زیادہ قربت کی وجہ سے وجود میں آسکتا ہے کیوں کہ خاکہ نگار اُس کی بہت سی خوبیوں اور خامیوں سے واقف ہوتا ہے اور انہیں رقم بھی کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے کردار کی اہم خصوصیات میں سے کسی خصوصیت کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اگر انتخاب و ایجاز کے باوجود خاکہ طویل ہو جاتا ہے تو یہ کوئی نقص نہیں۔ مختصر خاکہ میں واقعات اس قدر جامع ہونا چاہیے کہ متعلّقہ شخص کی کوئی خاص یا اہم خصوصیت نظر انداز نہ ہونے پائے۔

﴿۲﴾ **کردار نگاری:** خاکہ کے فنّی لوازم یا عناصرِ ترکیبی میں کردار نگاری کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بغیر خاکہ کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ دراصل خاکے کا تعلّق شخصیت سے ہوتا ہے اور شخصیت اپنی انفرادی خصوصیت یعنی کردار کے بغیر مکمّل نہیں ہوسکتی۔ خاکہ نگار کا اصل کام انہیں خصوصیت کو اُبھارنا ہے۔

ادب میں کردار نگاری کی روایت بہت قدیم ہے۔ قدیم تذکروں، قصّوں، کہانیوں، داستانوں اور مثنویوں میں اس کے بہترین نمونے پائے جاتے ہیں۔ کردار نگاری کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے یعنی عام طور پر کردار دو قسم کے ہوتے ہیں۔ **اوّل** مثالی کردار اور دوم اِرتقای کردار۔ مثالی کردار فن پارے میں ابتدا ہی سے پختہ اور کسی خاص اہمیت یا خصوصیت کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ حادثات و واقعات اور زمانہ کے نشیب و فراز سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ وہ خود اُن پر اثر انداز ہو جاتے ہیں۔ اُن کی سیرتیں اور ذہنی کیفیتیں اپنے آپ میں مکمّل ہوتی ہیں۔ دوسری قسم کے کردار اِرتقای ہوتے ہیں۔ وہ عمر اور زمان و مکان کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ حادثات و واقعات اور نشیب و فراز کا بھی ان پر اثر پڑتا ہے۔ انہیں فطری کردار بھی کہا جاتا ہے۔ اصلی اور حقیقی شخصیات عام طور پر زمانہ اور ماحول کے موافق بدلتی رہتی ہیں۔

شخصی خاکوں کے کردار دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔ اُردو میں بیشتر خاکوں کے کردار اِرتقای یا فطری بھی نظر آتے ہیں مگر اُن کا اِرتقا کسی خاص مقام پر جا کر ٹھہر سا جاتا ہے۔ اُردو کے خاکوں میں کرداروں کے اِرتقای مراحل کم ہونے کی کئی وجوہات ہیں جن میں سے ایک اختصار بھی ہے۔ اختصار کی وجہ سے متعلّقہ شخصیت کے مختلف اِرتقای مراحل ذرا کم ہی پیش کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اکثر خاکہ نگار متعلّقہ شخص سے اُس وقت متعارف ہوتا ہے جب اُس کا کردار کسی خاص سانچے میں ڈھل چکا ہوتا ہے۔

کردار نگاری میں شبیہ نگاری کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ خاکہ نگار یا شبیہ نگار کو انسانی صورت و سیرت کے ساتھ فطرت کا راز داں بھی ہونا چاہیے تاکہ وہ صورت و شبیہ کے ذریعے اُس کے خدوخال کو بھی نمایاں کرسکے۔ ایک ماہر شبیہ نگار اپنے کردار کی سیرت کی اہم خصوصیات کا انتخاب اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ نہایت دل چسپ اور پُر معانی ہو جاتی ہیں۔

خاکہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ خوردبیں اور نفسیات داں بھی ہو تاکہ وہ اپنے کردار کی مخصوص خصوصیات و صفات، حرکات و سکنات اور عادات و اطوار کو اس طرح اُبھارے کہ وہ دیگر انسانوں سے ممیّز معلوم ہو۔

﴿۳﴾ **واقعہ نگاری:** ایک عمدہ خاکہ واقعہ نگاری کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ خاکہ میں متعلقہ شخص کی خصوصیت کو واقعاتی پس منظر کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ شخصی خاکے میں کردار کی زندگی سے متعلّق اہم واقعات کا انتخاب اس طرح کیا جاتا ہے کہ متعلّقہ کردار کی اہم خصوصیات بے نقاب ہو جائیں۔ ایک ماہر خاکہ نگار سُنے سُنائے واقعات کی بہ نسبت آنکھوں دیکھے واقعات یعنی اپنے مشاہدات کو ترجیح دیتا ہے۔ اگر کسی شخص کی سیرت کے کسی ایک پہلو یا ایک ہی طرح کے پہلوؤں کو اُبھارنے کے لئے کئی واقعات پیش کیے جاتے ہیں تو وحدتِ تاثر قائم نہیں رہتا۔ اس لئے فن کار کو ایک ہی طرح کے یا ایک جیسے دو سے زائد واقعات کے انتخاب سے گریز کرنا چاہیے۔

خاکہ نگار غیر شخصی یا خیالی خاکوں کی تخلیق کے لئے خود واقعات اختراع کرتا ہے۔ اس لئے اُسے واقعات کے انتخاب میں دشواری نہیں ہوتی۔ البتّہ اُس کی تخلیقی صلاحیتوں اور واقعات کے اختراع کی آزمائش ضرور ہوتی ہے۔ دراصل واقعات کو پیش کرنے کا طریقہ ہی خاکہ میں دل چسپی اور اثر انگیزی پیدا کرتا ہے۔ خاکہ میں واقعات کو اس طرح پیش کرنا چاہیے کہ قاری کو یہ محسوس ہو کہ تمام واقعات اُس کے سامنے رونما ہو رہے ہیں۔

واقعہ نگاری کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلی قسم کی واقعہ نگاری میں بے کم و کاست اصل واقعہ کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے خاکہ نگار کو زبان و بیان پر عبور حاصل ہونا چاہیے۔ دوسری قسم کی واقعہ نگاری کے لئے خاکہ نگار خود واقعات اختراع کرتا ہے اور انہیں واقعات کی تمام جزئیات کو فن کارانہ مہارت کے ساتھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ اصلی یا حقیقی معلوم ہونے لگتے ہیں۔

﴿۴﴾ **منظر نگاری:** واقعہ نگاری کا ایک اہم جزو منظر نگاری ہے۔ کسی واقعہ یا واقعات کی جزئیات کی عکّاسی کو منظر نگاری یا منظر کشی کہا جاتا ہے۔ اگر کسی واقعہ، حادثہ، حالت یا کیفیت کا بیان اس طرح کیا جائے کہ اُس کی ہو بہو تصویر قاری کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے تو اُسے منظر کشی یا منظر نگاری کہتے ہیں۔ منظر نگاری ہی کے سبب زمان و مکان کا تعیّن ہوتا ہے۔

ایک ماہرِ فن مقامات اور اشیا کے خاکے، آبادیوں اور شہروں کی گہما گہمی موسموں کی کیفیت، میلے ٹھیلے، جلسے جلوسوں کے رنگ ڈھنگ، دریاؤں کی روانی، جنگل اور ویرانوں کی ویرانی، باغوں کی شادابی، پھولوں کی طراوت، سبزہ کی لہک، خوشبوؤں کی لپٹ، بادِ نسیم کے جھونکوں کی لطافت، تاریکیوں اور تیرہ شبی کی ظلمات، دھوپ کی تمازت، سردیوں کی ٹھٹھرن، شفق کی دل آویزی، صبح کی شگفتگی، سُرمئی شام کے مناظر کا بیان اس طرح کرتا ہے کہ تمام مناظر نہ صرف نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں بلکہ ذہن و دل پر بھی ثبت ہو جاتے ہیں۔

خاکہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس کیفیت یا منظر کی منظر نگاری کرے اُس میں تصنع، بناوٹ اور تکلّف کا شائبہ بھی نہ ہو۔ خاکہ کے کرداروں کی شخصیت کے متعدد اور منفرد پہلوؤں کو اُبھارنے میں منظر نگاری کا اہم رول ہوتا ہے۔ یہ اُسی وقت ممکن ہے جب خاکہ نگار کا مشاہدہ گہرا ہو اور اُس کو زبان و بیان پر بھی غیر معمولی عبور حاصل ہو۔ اُردو ادب میں ایسے متعدد خاکے ہیں جو بہترین منظر کشی کے سبب قبولِ خاص و عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ مختصر طور پر کہا جاسکتا ہے کہ منظر نگاری کے بغیر خاکہ میں دل کشی پیدا نہیں کی جاسکتی وہ محض خاکہ تو ہوگا مگر بے روح اور بے کیف۔

﴿۵﴾ **وحدتِ تاثر:** خاکہ کے فنّی لوازم کا ایک اہم عنصر وحدتِ تاثر بھی ہے۔ اُدبا اور نقّادِ فن اکثر وحدتِ زماں، وحدتِ مکاں اور وحدتِ عمل پر زور دیتے ہیں۔ بعض نقّادانِ ادب نے مندرجہ بالا وحدتوں کے علاوہ نہ صرف وحدتِ تاثر کی بھی نشان دہی کی ہے بلکہ فن پارے

کے لئے اسے ضروری قرار دیا ہے۔ دراصل وحدتِ زماں، وحدتِ مکاں اور وحدتِ عمل کا اصل مقصد فن پارے میں وحدتِ تاثر کا پیدا کرنا ہے۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ ان تینوں وحدتوں کا منطقی نتیجہ وحدتِ تاثر ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

افسانہ، ڈرامہ اور خاکہ وغیرہ کے وحدتِ تاثر میں کافی فرق ہے۔ تخلیق کار افسانہ یا ڈرامہ میں کسی واقعہ یا کردار کا نقش پلاٹ کی مدد سے ترتیب دے کر خاص توازن کے ساتھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ وحدتِ تاثر پیدا ہو سکے۔ چوں کہ خاکہ میں افسانہ یا ڈرامہ کی طرح پلاٹ نہیں ہوتا ہے بلکہ اُس کا پلاٹ متعلّقہ کردار کے تابع ہوتا ہے۔ اس لئے خاکہ نگار کسی پلاٹ کے بجائے خاکہ کے ابتدائی حصّہ ہی سے متعلّقہ شخص کی انفرادی خصوصیات کو خاص ترتیب و تنظیم سے پیش کرنے لگتا ہے اور جیسے جیسے کردار یا شخصیت کے نقوش اُبھرتے جاتے ہیں ویسے ویسے ابتدائی تاثر میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

ایک کامیاب خاکہ کے لئے ضروری ہے کہ حالات، واقعات، مکالمات، بیانات وغیرہ کو اس طرح ترتیب و تنظیم سے تحریر کیا جائے کہ سرعت و شدّت سے وحدت تاثر قائم ہونے لگے۔ خاکہ کے تمہیدی اور درمیانی حصّوں کو منتہا اور اختتام سے اس طرح پیوست ہونا چاہیے کہ شروع سے آخر تک وحدتِ تاثر قائم رہے۔

02.05 خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش

اُردو ادب میں خاکہ اور خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کا تعیّن آسانی سے نہیں کیا جا سکتا۔ بعض اصناف جیسے مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، ہجو اور داستان میں اس کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ان اصناف میں واقعات و حالات کے ساتھ متعلّقہ کردار کی سیرت و صورت کے کچھ ہلکے سے نقوش اُبھرتے سے معلوم ہوتے ہیں جنہیں خاکہ یا خاکہ نگاری کے اوّلین نقوش کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد شعرائے اُردو کے تذکروں میں بھی خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش نظر آتے ہیں۔

تذکروں کا وجود کیسے ہوا، قطعی طور پر کچھ کہنا محال ہے مگر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بعض شائقینِ شعر و شاعری کے اپنے پسندیدہ اشعار اپنی بیاضوں میں لکھتے ہوں گے۔ اُنہیں میں سے کچھ شوقین اپنے پسندیدہ یا منتخب اشعار کے ساتھ شاعر کا نام بھی تحریر کرنے لگے ہوں گے۔ کچھ ایسے اہلِ ذوق بھی ہوں گے جو شاعر کے تخلص اور نام کے علاوہ حالات بھی درج کرتے ہوں گے۔ اسی شوق کو تذکرہ نگاری کی ابتدا کہا جا سکتا ہے۔ بیاضوں اور تذکروں میں قدیم شعرا کا ذکر اُردو کے بجائے فارسی زبان میں کیا گیا ہے کیوں کہ اُس وقت کے رواج کے مطابق تصنیف و تالیف کی زبان فارسی تھی۔ میر تقی میرؔ کے تذکرہ نکات الشعرا اور اس کے بعد تحریر کیے گئے تذکروں میں شعرا کا کلام اور اُن کے مختصر حالات اس طرح لکھے گئے ہیں کہ اُن کی شخصیت کے دھندلے نقوش اُبھرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں مگر اُنہیں کسی بھی طرح خاکہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس طرح کے تذکروں میں میر تقی میرؔ، غلام ہمدانی مصحفیؔ، نوّاب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ، قدرت اللہ قاسمؔ اور سعادت یار خاں کے تذکرے نہایت اہم ہیں۔

مندرجہ بالا بیش تر تذکروں میں شاعروں کی شخصیات کے جو نقوش اُبھرتے ہیں وہ کسی حد تک خاکوں سے مشابہ تو ضرور ہیں مگر اُنہیں خاکوں کی فہرست میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ ان خاکوں میں شعرا کی شخصیت کو نہایت اختصار و ایجاز سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کی شخصیت کی وضاحت سے زیادہ انتخابِ کلام پر توجّہ مرکوز کی گئی ہے۔ شاعر کی ذات یا عادت و اطوار سے متعلّق چند تعریفی یا تعارفی جملے نظر آتے ہیں جن

سے نہ تو وحدتِ تاثر قائم ہوتا ہے اور نہ اُس کی انفرادیت ہی واضح ہوتی ہے۔ شاعروں کی شخصیت، سیرت اور کردار کو ''یار باش خوش اختلاط'' اور ''دیر آشنا بیار آدمی خوب است'' لکھ کر واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قدرت اللہ قاسمؔ نے اپنے تذکرہ 'مجموعۂ نغز' اور سعادت یار خاں نے اپنے تذکرہ ''خوش معرکۂ زیبا'' میں کسی قدر تفصیل سے وہ معلومات یکجا کر دی ہیں جو اُس وقت اُن کے علم میں تھی مگر پیش کی گئی معلومات اس قدر نا کافی ہیں کہ شاعروں کی مکمّل شخصیت کے نقوش اُجاگر نہیں ہوتے۔

ان تذکروں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بیشتر تذکرہ نگار غیر جانب دار بھی نہیں تھے۔ وہ جن سے خوش ہوتے تھے یا جن سے اُنہیں لگاؤ ہوتا تھا اُن کی بڑھ چڑھ کر تعریفیں کرتے تھے اور جن سے ناراض ہوتے تھے اُن کی شخصیت کو مسخ کر کے پیش کرتے تھے۔ اس لئے ایسے خاکوں کو خاکہ نما تذکرے تو کہا جا سکتا ہے مگر خاکے کی روایت میں شامل کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔

تذکروں کے بعد انشاء اللہ خاں اِنشاؔ کی تحریروں میں خاکہ کے واضح نقوش نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب ''دریائے لطافت'' میں میر غفر غینی، بی نورن، مولوی عبدالفرقان، بھاڑامل اور مرزا صدرالدّین صفاہانی کی شخصیت، سیرت وفطرت سے زیادہ حلیہ اور ہیئت نگاری پر توجّہ مرکوز کی ہے۔ اس لئے اُن کے پیش کردہ خاکوں کو مکمّل خاکوں کی فہرست میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

قدیم تذکروں کے مطالعہ سے نہ تو کسی شاعر کی سرگزشت معلوم ہوتی ہے اور نہ اُس کے مزاج اور عادات واطوار کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا محمّد حُسین آزاد کی تصانیف ''آبِ حیات'' اور ''دربارِ اکبری'' میں اُردو شعرا کی صورت وسیرت کے کسی قدر واضح نمونے نظر آتے ہیں۔ اُنہوں نے شاعروں کے حالات بزرگوں سے معلوم کر کے اور مختلف تذکروں میں متفرق مذکور کو یکجا کر کے اپنے مخصوص انداز واُسلوب میں بیان کیے ہیں۔ اگرچہ ''آبِ حیات'' اُردو شعرا کی تاریخ وتذکرہ کا امتزاج ہے تاہم اس میں مرقع نگاری یا خاکہ نگاری کے نمونے بھی جا بجا نظر آتے ہیں۔ مولانا محمّد حُسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں مختلف اَدوار کے مشاعروں کی محفلوں کا انعقاد کیا ہے اور ڈرامہ کی سی تکنیک کے ذریعہ شاعروں کی صورت، ہیئت، لباس، وضع قطع اور کلام پڑھنے کے انداز اور دیگر پہلوؤں کو بڑے سلیقہ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل قاری ''آبِ حیات'' میں پہلی بار تمام شاعروں کو چلتے پھرتے اور گوشت پوست کا انسان محسوس کرتا ہے۔ شاعروں کی نفسیاتی کیفیت کی طرف توجّہ کم دینے اور سوانحی کوائف کی طرف زیادہ متوجّہ ہونے کے سبب شاعروں کے حالات کو خاکہ کے بجائے نیم خاکے کہنا زیادہ مناسب ہے مگر خاکہ نگاری کی روایت میں اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ یہ پہلی کتاب ہے جس کے ذریعہ خاکہ نگاری کا شعور حاصل ہوا ہے۔

02.06 اُردو میں خاکہ نگاری کی روایت

اُردو ادب میں خاکہ نگاری سے قبل اس کے ابتدائی نقوش داستانوں، مثنویوں، مرثیوں، قصیدوں، ہجوؤں اور تذکروں میں نظر آتے ہیں جو مرقع نگاری سے کسی حد تک مماثلت رکھتے ہیں۔ انشاء اللہ خاں اِنشاؔ کی دریائے لطافت میں بی.نورن اور میر غفر غینی، بی نورن، مولوی عبدالفرقان، بھاڑامل اور مرزا صدرالدّین صفاہانی وغیرہ کے مرقعوں میں بھی خاکہ نگاری کا عکس نظر آتا ہے۔ محمّد حُسین آزادؔ نے اپنی کتاب ''آبِ حیات'' میں اُردو شاعروں کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں مگر اُنہیں خاکہ نگاری کی روایت میں اس لئے شامل نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خاکہ نگاری کے اُصول پر کھری نہیں اُترتیں۔ عبدالحلیم شرؔر اور مرزا محمد ہادی رسواؔ نے چند اشخاص کی سیرتوں کو اپنی تحریروں میں اُجاگر کیا ہے اور خواجہ حسن نظامی نے بھی چند ہستیوں کی تصویر کشی اپنے مضامین کے ذریعہ کی ہے۔

اُردو میں جدید خاکہ نگاری کی ابتدا ۱۹۲۷ء میں مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضمون ''نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی'' سے ہوتی ہے۔ ''ایک وصیت کی تعمیل'' اور ''دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ'' کا شمار اُن کے اہم خاکوں میں کیا جاتا ہے۔ تقریباً اسی زمانہ میں آغا حیدر حسن اور مولوی عبدالحق نے کئی عمدہ شخصی خاکے رقم کیے ہیں۔ سیّد عابد حُسین، بشیر احمد ہاشمی، خواجہ غلام السیّدین، خواجہ محمد شفیع دہلوی، عبدالرزّاق کان پوری، عبدالماجد دریا آبادی اور رشید احمد صدّیقی نے بھی متعدد شخصی خاکے تحریر کیے ہیں۔

آغا حیدر حسن کے خاکوں سروجنی نائڈو، سیّد حسن اور مسٹر حیات اللہ انصاری اور مولوی عبدالحق کے خاکوں نام دیو مالی اور نور خاں کا شمار عمدہ خاکوں میں کیا جاتا ہے۔ عبدالماجد دریا آبادی کے خاکے اکبرالہٰ آبادی، شبلی اور مہدی افادی قابلِ ذکر ہیں۔ خنداں، کندن اور ذاکر صاحب رشید احمد صدیقی کے بہترین خاکے ہیں۔ کرشن چندر نے سعادت حسن منٹو، سردار جعفری نے مخدوم محی الدین، عصمت چغتائی نے مجاز اور ساحر لُدھیانوی نے سردار جعفری کے خاکے لکھ کر صنف خاکہ نگاری میں اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ فکر تونسوی کے چودہ خاکوں کا مجموعہ ''خدوخال'' ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔ عصمت چغتائی کے خاکہ ''دوزخی'' کا شمار اُردو کے منفرد خاکوں میں کیا جاتا ہے۔ منٹو کے شخصی خاکوں کے تین مجموعے گنجے فرشتے، لاؤڈ اسپیکر اور فلمی شخصیتیں کا انداز منفرد ہے۔ اُن کے خاکوں میں تجسس، تحیّر خیزی اور ڈرامائی عناصر نظر آتے ہیں۔

اشرف صبوحی، سردار دیوان سنگھ مفتوں، شوکت تھانوی، مالک رام، تمکین کاظمی، غلام احمد فرقت کاکوروی، رئیس احمد جعفری اور چراغ حسن حسرت کے خاکے بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اشرف صبوحی کی کتاب ''دلّی کی چند عجیب ہستیاں'' میں میر ٹوٹرو، ملن بائی اور میر باقر علی جیسے معمولی انسانوں کے دل چسپ خاکے ہیں۔ دیوان سنگھ مفتوں کی کتاب ''ناقابلِ فراموش'' میں بھی چند ہستیوں کے ہلکے پھلکے خاکے نظر آتے ہیں۔ شوکت تھانوی کے مجموعے ''شیش محل'' اور ''قاعدہ بے قاعدہ'' صنف خاکہ نگاری میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ مالک رام نے بھی چند عمدہ خاکے تحریر کیے ہیں جن میں سے مرزا غالب، نواب صدر یار جنگ، سیّد سلیمان ندوی قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر اعجاز حُسین کے خاکوں کے مجموعہ کا نام ''مُلک ادب کے شہزادے'' ہے جس میں ۴۴ شاعروں کے مختصر خاکے ہیں۔ چراغ حسن حسرت کے خاکوں کے مجموعہ کا نام ''مردم دیدہ'' ہے۔ تمکین کاظمی نے حیدر آباد کی چند اہم ہستیوں کے خاکے لکھے ہیں جن میں سوانحی رنگ زیادہ ہے۔ غلام احمد فرقت کاکوروی کا خاکہ حسرت موہانی قابلِ ذکر ہے۔ اُن کے مجموعہ مضامین ''صید و ہدف'' میں بھی کئی عمدہ خاکوں کی شمولیت ہے۔ رئیس احمد جعفری کی کتاب ''دید و شنید'' میں مختلف ہستیوں کا ذکر ہے مگر اُنہیں عمدہ خاکوں کی فہرست میں نہیں رکھا جا سکتا۔

محمد طفیل کے خاکوں کے پانچ مجموعے صاحب، جناب، آپ، محترم اور مکرم شائع ہو چکے ہیں جن میں شخصی خاکوں کے علاوہ اجتماعی اور سوانحی خاکے بھی ہیں۔ عبدالمجید سالک کے بیس خاکوں کے مجموعہ کا نام ''یارانِ کہن'' اور ضیاء الدین احمد برنی کے ۹۳ خاکوں کے مجموعہ کا نام ''عظمتِ رفتہ'' ہے۔ دونوں مجموعوں کے بیشتر خاکے تاثراتی ہیں۔ شاہد احمد دہلوی کو حلیہ نگاری میں کمال حاصل ہے۔ اُن کی تصنیف ''گنجینۂ گوہر'' ۱۷ خاکوں پر مشتمل ہے۔ علی جواد زیدی نے بھی کئی عمدہ خاکے تخلیق کیے ہیں۔ اُن کے خاکوں کے مجموعہ کا نام ''آپ سے ملیے'' ہے۔ عبدالاحد خاں تخلص بھوپالی کا خاکہ ''پاندان والی'' مزاحیہ ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔ اُن کے ۲۱ طنزیہ و مزاحیہ خاکوں کا مجموعہ ''پوسٹ مارٹم'' شائع ہو چکا ہے۔ معین الدین دردائی نے اپنے خاکوں کے مختصر مجموعہ ''جلوے'' میں چند ہستیوں کی خوبیوں اور کمزوریوں کی تصویر کشی کی

ہے۔الطاف حسن قریشی کی کتاب ''ملاقاتیں''۱۶ عظیم ہستیوں کی ملاقاتوں کی بہترین روداد ہے۔نریش کمار شاؔد نے اپنی کتاب ''جان پہچان'' میں کئی ادیبوں اور شاعروں سے اپنی جان پہچان کا حال درج کیا ہے۔

اُردو خاکہ نگاری کی روایت میں مجتبیٰ حُسین کے مجموعے آدمی نامہ، سو ہے وہ بھی آدمی، چہرہ در چہرہ، مظہر امام کی تصنیف اکثر یاد آتے ہیں، کشمیر لال ذاکر کی کتاب آشنا چہرے، انور ظہیر خاں کی تخلیق مت سہل ہمیں جانو، امداد اللہ ندوی کا مجموعہ انجمن کے چند روشن چراغ اور ندا فاضلی کا مجموعہ چہرے قابلِ ذکر ہیں۔

02.07 اردو کے تین اہم خاکہ نگار

﴿۱﴾ **مرزا فرحت اللہ بیگ:** مرزا فرحت اللہ بیگ کو اُردو کا پہلا خاکہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔اُنہوں نے اُردو میں شخصی خاکہ نگاری کو ایک مستقل صنف کے درجہ پر پہنچایا۔اُن کے پہلے خاکہ کا نام ''نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی'' ہے۔اُنہوں نے وحید الدین سلیم کی فرمائش پر اُنہیں کا ایک خاکہ ''ایک وصیت کی تعمیل'' کے عنوان سے قلم بند کیا تھا جس کا شمار اُردو کے بہترین خاکوں میں کیا جاتا ہے۔لالہ سری رام، یادِ ایّام، عشرتِ فانی، العظمتہ اللہ، خواجہ بدر الدین، حکیم آغا جان عیش، نواب عبید الرحمٰن احسان اُن کے شخصی خاکوں کے نام ہیں۔ اُنہوں نے ''دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ'' میں ایک خاص عہد کے شاعروں کے بہترین مرقع پیش کیے ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ اپنے کرداروں کی عادات، اطوار، سیرت، صورت، مزاج، نفسیات وغیرہ کا مطالعہ نہایت گہرائی سے کرتے ہیں اور پھر اپنے تخیل کی رنگ آمیزی سے ایسی متحرک اور دل کش تصویر کھینچتے ہیں کہ اُن کے نقوش قاری کے ذہن و دل پر ثبت ہو جاتے ہیں۔ اُن کا طرزِ بیان صاف ستھرا اور تصنّع سے پاک ہے اور تحریر میں شوخی و ظرافت جا بجا نظر آتی ہے۔اُنہیں زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔وہ الفاظ کی ترتیب سے مزاح پیدا کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اُن کے لکھے ہوئے تمام خاکوں کا شمار اُردو کے عمدہ خاکوں میں کیا جاتا ہے۔

﴿۲﴾ **مولوی عبدالحق:** مولوی عبدالحق کا شمار اُردو کے اہم خاکہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔اُن کے خاکوں کے مجموعہ کا نام ''چند ہم عصر'' ہے جس میں چوبیس ہم عصر ہستیوں کی شخصیت پر مضامین شامل ہیں۔اس میں معاصرین کی سیرتوں کو لفظی تصاویر کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے جو کسی نہ کسی طرح اُن کے قریب رہی تھیں۔ان ہستیوں میں نامور اور مشاہیر افراد ہی کے خاکے نہیں ہیں بلکہ وہ معمولی اور عام ہستیاں بھی ہیں جو صاف گوئی، وفاداری، جفاکشی، وضع داری، جاں نثاری، انسان دوستی وغیرہ کا بہترین نمونہ تھیں۔

مولوی عبدالحق کے خاکوں کی اہم خصوصیت غیر جانب داری ہے۔وہ کسی شخص کی مرقع کشی کرنے میں نہ تو تعلّقات یا دوستی کو آڑے آنے دیتے ہیں اور نہ اُس کی عظمت و شہرت سے مرعوب ہوتے ہیں۔مولانا محمد علی مرحوم، نام دیو مالی، نور خاں اور سیّد محمود کا شمار اُن کے بہترین خاکوں میں کیا جاتا ہے۔سرسیّد، حالی اور محسن الملک کے خاکے ان بزرگوں کی نجی زندگی کے اہم گوشوں کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔مولوی عبدالحق کی تحریروں میں پرکاری، سلاست، رنگینی اور بے تکلفی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔اُن کا اندازِ بیان معروضانہ ہے۔اُن کے یہاں ذاتی واقفیت اور سماجی پس منظر کے عکس بھی نظر آتے ہیں۔اُنہوں نے تنقید و طنز سے بھی کام لیا ہے۔اُن کا طنز نہایت تیکھا اور چبھتا ہوا ہوتا ہے۔

﴿۳﴾ **رشید احمد صدّیقی**: رشید احمد صدّیقی کا شمار صفِ اوّل کے خاکہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ اُن کے مضامین اور خاکوں کے مجموعوں کے نام مضامینِ رشید، خنداں، گنج ہائے گراں مایہ، ذاکر صاحب اور ہم نفسانِ رفتہ ہیں۔ مضامینِ رشید میں اقبال سہیل سے متعلّق ایک خاکہ ہے۔ خنداں میں ایک خاکہ شیخ پیرو کا اور دوسرا ڈاکٹر خنداں کا ہے۔ اُنہوں نے ''ذاکر صاحب'' میں ڈاکٹر ذاکر حُسین کے اخلاق، کردار، عادات، مزاج وغیرہ پر خاطر خواہ روشنی ڈالی ہے۔ گنج ہائے گراں مایہ میں اُن تیرہ نام وَر ہستیوں کے تعزیتی مضامین ہیں جو اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ مولانا محمد علی جوہؔر، ابوالکلام آزؔاد، پنڈت جواہر لال نہرو سے متعلّق خاکوں میں ذاتیات کے پرتَو کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہ خاکہ تقلید کرتے وقت فرد کی اہمیت پر زیادہ توجّہ مرکوز رکھتے ہیں اور اپنے کرداروں کا تعارف اس طرح کراتے ہیں کہ اُن کی تصویریں اُبھر کر نظروں کے سامنے متحرک سی ہو جاتی ہیں۔ یہ تصویریں اس قدر شگفتہ اور دل چسپ ہوتی ہیں کہ قاری مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

02.08 اردو کے تین اہم خاکوں کے مختصر اقتباسات

﴿۱﴾ **خاکے کا نام : نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی خاکہ نگار : مرزا فرحت اللہ بیگ**

رنگ سانولا مگر روکھا، قد خاصا اونچا تھا مگر چوڑان نے لمبان کو دَبا دیا تھا، دُہرا بدن گدرایا ہی نہیں بلکہ موٹاپے کی طرف کسی قدر مائل۔ فرماتے تھے کہ بچپن میں ورزش کا شوق تھا۔ ورزش چھوڑ دینے سے بدن جس طرح مُرمُروں کا تھیلا ہو جاتا ہے، بس یہی کیفیت تھی، بھاری بدن کی وجہ سے چوں کہ قد ٹھنگنا معلوم ہونے لگا تھا اس لئے اس کا تکملہ اونچی تُرکی ٹوپی سے کر دیا جاتا تھا مگر کمر کا پھیر ضرورت سے زیادہ تھا۔ توند اس قدر بڑھ گئی تھی کہ گھر میں ازار بند باندھنا بے ضرورت ہی نہیں تکلیف دہ سمجھا جاتا تھا اور محض ایک گرہ کو کافی خیال کیا گیا تھا۔ گرمیوں میں تہمد (تہ بند) باندھتے تھے، اس کے پلّو اُڑسنے کی بجائے اِدھر اُدھر ڈال لیتے تھے مگر اُٹھتے وقت بہت احتیاط کرتے تھے۔ اوّل تو قطب سے بیٹھے رہتے تھے اگر اُٹھنا ہوا تو پہلے اندازہ کرتے تھے کہ فی الحال اُٹھنے کو ملتوی کیا جا سکتا ہے یا نہیں، ضرورت نے بہت ہی مجبور کیا تو ازار بند کی گرہ یا تہمد کے کونوں کو اُڑسنے کا دَباؤ توند پر ڈالتے تھے۔ سر بہت بڑا تھا مگر بڑی حد تک اس کی صفائی کا انتظام قدرت نے اپنے اختیار میں رکھا تھا، جو تھوڑے رہے سہے بال تھے وہ اکثر نہایت احتیاط سے صاف کرا دیے جاتے تھے، ورنہ بالوں کی یہ گگر سفید مقیّش کی صورت میں ٹوپی کے کناروں پر جھالر کا نمونہ ہو جاتی تھی۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی ذرا اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ بھوئیں گھنی اور آنکھوں کے اُوپر سایہ افگن تھیں۔ آنکھوں میں غضب کی چمک تھی، وہ چمک نہیں جو غُصّہ کے وقت نمودار ہوتی ہے، بلکہ وہ چمک تھی جس میں شوخی اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اگر مَیں ان کو ''مُسکراتی ہوئی آنکھیں'' کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ کلّہ، جبڑا، بڑا زبردست پایا تھا۔ چوں کہ دہانہ بھی بڑا تھا اور پیٹ کے محیط نے سانس کے لئے گنجائش بڑھا دی تھی، اس لئے نہایت اونچی آواز میں بغیر سانس کھینچے بہت کچھ کہہ جاتے تھے۔ آواز میں گرج تھی، مگر لوچ کے ساتھ، کوئی دوُر سے سُنے تو یہ سمجھے کہ مولوی صاحب کسی کو ڈانٹ رہے ہیں لیکن پاس بیٹھنے والا ہنسی کے مارے لوٹ رہا ہو۔

﴿۲﴾ **خاکے کا نام : مولانا محمد علی مرحوم خاکہ نگار : مولوی عبدالحق**

مولانا محمد علی مرحوم عجیب وغریب شخص ہوئے ہیں۔ وہ مختلف ومتضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے۔ اگر انہیں ایک آتش فشاں یا گلیشیر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان دونوں میں عظمت وشان ہے لیکن دونوں میں خطرہ وتباہی بھی موجود ہے۔ وہ آزادی کا

دل دادہ اور جبر و استبداد کا پکّا دُشمن تھا۔ اگر کبھی اس کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو وہ بہت بڑا جابر اور مستبد ہوتا۔ وہ محبت و مروّت کا پُتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لئے تیار رہتا تھا، لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولہ ہو جاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی۔ دوست بھی اس کے جان نثار اور فدائی تھے لیکن اس طرح بچتے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے۔

﴿۳﴾ خاکے کا نام : کندن خاکہ نگار : رشید احمد صدیقی

کندن مر گیا اور گھنٹے بجتے رہے۔ کندن کالج کا گھنٹہ بجاتا تھا۔ معلوم نہیں کب سے، کم و بیش تیس پینتیس سال سے۔ اتنے دنوں سے اتنی پابندی سے کہ اس طرف خیال کا جانا بھی بند ہو گیا کہ وہ مر جائے گا یا گھنٹہ بجانے سے باز آ جائے گا۔ طالب علمی کا زمانہ ختم کر کے اسٹاف میں آیا تو یہ گھنٹہ بجا رہا تھا۔ اس کے گھنٹوں کے مطابق کام کرتے کرتے پوری مدتِ ملازمت ختم کی۔ یونیورسٹی سے رُخصت ہُوا تو اسے گھنٹہ بجاتے چھوڑا۔ گھنٹہ کی آواز روز مرّہ کے اوقات میں ایسی گھل مل گئی تھی جیسے وہ کہیں باہر سے نہیں میرے ہی اندر سے آ رہی ہو جیسے وہ وظائف جسمانی کے معمولات میں داخل ہو گئی ہو جن کا شعوری طور پر احساس نہیں ہوتا۔ کئی دن بعد کسی نے بتایا کندن مر گیا۔ ایک دھچکا سا لگا، ارے کندن مر گیا۔ اتنے دنوں سے گھنٹوں کی آواز آتی رہی اور حسبِ معمول یہی سمجھتا رہا کہ کندن بجا رہا ہے۔ بتائے بغیر کیوں نہ معلوم ہو گیا۔

02.09 خلاصہ

انگریزی ادب کی صنف اسکیچ (Sketch) کو اُردو میں خاکہ کہتے ہیں۔ اُردو میں خاکہ کے علاوہ اسکیچ کے لئے متعدد اصطلاحات بھی وضع کی گئی ہیں جن میں سے مرقع، شخصی مرقع، شخصی تصویر، قلمی تصویر قابلِ ذکر ہیں مگر اسکیچ کا مکمّل مفہوم ''خاکہ'' ہی میں واضح ہوتا ہے۔ خاکہ کے ذریعہ اصلی یا حقیقی اور خیالی شخص کے خدوخال، شخصیت، سیرت، نفسیات وغیرہ کے اہم گوشوں کی نقاب کشائی کی جاتی ہے۔ اُردو میں حقیقی افراد کے خاکوں کی بہتات اور خیالی افراد کے خاکوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اُردو ادب میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کی جھلکیاں داستانوں، مرثیوں، قصیدوں، ہجویات، مثنویوں اور شعرائے اُردو کے تذکروں میں نظر آتی ہیں۔ تذکروں کے بعد انشاءاللہ خاں اِنشاؔ کی کتاب دریائے لطافت اور مولانا محمد حُسین آزاد کی تصانیف ''آبِ حیات'' اور ''دربارِ اکبری'' میں بعض کرداروں اور اُردو شاعروں کے کسی حد تک واضح مرقعے نظر آتے ہیں۔

دیگر اصنافِ ادب کی طرح خاکہ نگاری کے لئے بھی کچھ فنّی عناصر ضروری ہیں جن میں سے اختصار، کردار نگاری، واقعہ نگاری، منظر نگاری اور وحدتِ تاثر نہایت اہم ہیں۔ اُردو میں جدید خاکہ نگاری کی بنیاد مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکہ ''نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی'' سے پڑی۔ آغا حیدر حسن، مولوی عبدالحق، سیّد عابد حُسین، بشیر احمد ہاشمی، خواجہ غلام السیّدین، خواجہ محمد شفیع دہلوی، عبدالرزّاق کان پوری، عبدالماجد دریا آبادی اور رشید احمد صدّیقی نے بھی عمدہ خاکے تخلیق کیے ہیں۔ کرشن چندر اور عصمت چغتائی نے بھی چند خاکے رقم کیے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کا شمار منفرد خاکہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ اشرف صبوحی، سردار دیوان سنگھ مفتوں، شوکت تھانوی، مالک رام، تمکین کاظمی، غلام احمد فرقت کاکوروی، رئیس احمد جعفری اور چراغ حسن حسرت نے بھی عمدہ خاکے تخلیق کیے ہیں۔ محمد طفیل، عبدالمجید سالک، ضیاء الدین احمد برنی، شاہد احمد دہلوی، علی جوّاد زیدی، عبدالاحد خاں تخلص بھوپالی، معین الدین دردائی، الطاف حسن قریشی، نریش کمار شادؔ، مجتبیٰ حُسین، کشمیری لال ذاکر، انور ظہیر خاں، امداداللہ ندوی، ندا فاضلی وغیرہ نے بھی اُردو خاکہ نگاری کی روایت میں اضافہ کیا ہے۔

02.10 فرہنگ

آکسفورڈ : (Oxford) انگلینڈ کی ایک مشہور یونیورسٹی کا نام

اٹھکھیلیاں کرنا : الّڑھ پنے کی حرکتیں کرنا، شوخیاں دکھلانا، ناز نخرے دکھانا

اُڑسنا : کھونسنا، اٹکانا، کسی چیز کو کسی چیز میں اُڑس دینا

اُوتھیلو : (Othello) شیکسپیر کے ایک مشہور و مقبول ڈرامہ کا نام

جل پری : ایک روایتی یا خیالی مخلوق جس کا چہرہ عورت سے اور جسم مچھلی سے مشابہ ہوتا ہے

طاق پر دھری رہ جانا : کسی کام کی نہ رہنا، بیکار ہو جانا، کچھ کام نہ آنا

کستوری : مُشک، وہ خوشبودار چیز جو کستورے ہرن کی ناف میں ہوتی ہے

کشمیری جُبّہ : کشمیر کا بنا ہُوا ایک قسم کا ڈھیلا کوٹ جس کی آستینیں کلائی سے اوپر ہوتی ہیں

کھلنڈرا : کھلاڑی، کھیل کود میں مشغول رہنے والا، تفریح کرنے والا

مٹھّیاں بھینچنا : مُشت کو جکڑنا، ہاتھ کی پانچوں اُنگلیوں کو آپس میں بھینچنا

مُرمُروں کا تھیلا : موٹا یا فربہ آدمی، ایسا شخص جس کے جسم کی ہیئت مُرمُروں کے تھیلے جیسی ہو

مہاوٹ : جاڑے کی بارش جو کہ ماگھ کے مہینے میں ہوتی ہے

02.11 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : خاکہ کی کسی ایک خوبی تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۲ : خاکہ کی تعریف چند الفاظ میں بیان کیجیے۔

سوال نمبر۳ : اجتماعی خاکہ کسے کہتے ہیں؟ اظہارِ خیال کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : خاکے کی مختلف اقسام کی نشان دہی کیجیے۔

سوال نمبر۲ : خاکے میں کردار نگاری کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۳ : خاکہ کے اَجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

02.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اُردو ادب میں خاکہ نگاری از ڈاکٹر صابرہ سعید

۲۔ اُردو نثر کا فنّی اِرتقا از ڈاکٹر فرمان فتح پوری

۳۔ مرزا فرحت اللہ بیگ بحیثیت انشائیہ نگار اور خاکہ نگار از ڈاکٹر خالد حُسین خاں

۴۔ مصنّفینِ اُردو از سیّد وزارت حُسین

اکائی 03 : نثری اصناف میں خاکہ نگاری

ساخت

03.01 : اغراض ومقاصد
03.02 : تمہید
03.03 : خاکہ نگاری کی تعریف
03.04 : خاکہ نگاری کے اجزاے ترکیبی
03.05 : خاکہ نگاری کی اقسام
03.06 : نثری اصناف میں خاکہ نگاری
03.07 : خلاصہ
03.08 : فرہنگ
03.09 : نمونہ امتحانی سوالات
03.10 : حوالہ جاتی کتب
03.11 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات
03.12 : معروضی سوالات کے جوابات

03.01 اغراض ومقاصد

خاکہ نگاری اُردو نثر کی ایک اہم صنف ہے۔ اِس لئے اُردو کے ہر طالبِ علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ صنفِ خاکہ نگاری سے پوری طرح واقف ہو۔ اِسی مقصد کے پیشِ نظر اِس اکائی میں خاکہ نگاری کی تعریف، اُس کے اجزاے ترکیبی، اُس کی اقسام اور خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اِس اکائی کے ذریعے طلبا صنفِ خاکہ نگاری سے آشنا ہوں گے اور ساتھ ہی ساتھ اُردو کی دیگر نثری اصناف مثلاً داستان، تذکرہ، خطوط، سوانح، خودنوشت سوانح، سفرنامہ، رپورتاژ، کالم اور اِنٹرویو وغیرہ میں خاکہ نگاری کے ابتدائی آثار بھی ملاحظہ کریں گے۔

03.02 تمہید

خاکہ نگاری ایک مشکل صنف ہے۔ خاکہ نگاری کے ذریعے کسی شخصیت کی دُھندلی تصویر کو چمکایا جاسکتا ہے اور چمکتی ہوئی تصویر کو مدھم کیا جاسکتا ہے۔ خاکہ نگاری کا شمار اُردو نثر کی جدید اصناف میں کیا جاتا ہے۔ اُردو کی دیگر نثری اصناف کے مقابلے میں خاکہ نگاری ایک نَو خیز صنف ہے۔ خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش ''داستان، تذکرہ، خطوط، سوانح، خودنوشت سوانح، سفرنامہ، رپورتاژ، کالم اور اِنٹرویو'' وَغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔

03.03 خاکہ نگاری کی تعریف

''خاکہ'' اُردو زبان کا لفظ ہے جس کا لغوی معنی ''تصویر کا ڈھانچا یا خدوخال وغیرہ کی نقل جو اصل کے مشابہ ہو'' ہے۔ اصطلاح میں خاکے سے مراد وہ تحریر ہے جس میں اجمالی طور پر کسی شخصیت کے ظاہری خدوخال، عادات واَطوار اور کردار وغیرہ کو بغیر کسی مبالغے کے سیدھے سادے انداز میں اِس طرح پیش کیا جائے کہ اُس شخصیت کی چلتی پھرتی تصویر نگاہوں کے سامنے آجائے۔ صرف چلتی پھرتی تصویر ہی نہیں بلکہ اُس شخصیت کے اَفکار وخیالات بھی اُبھر کر سامنے آجائیں۔ چند الفاظ میں خاکے کی تعریف اِس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ ''صفحۂ قرطاس پر الفاظ کے ذریعے بنائی گئی متحرک اور جان دار تصویر کو خاکہ کہتے ہیں۔ خاکے کی ہیئت انشائیہ کے مشابہ ہوتی ہے اور اُس کے ذریعے کسی حقیقی یا خیالی شخص کی شخصیت، سیرت وصورت اور اُس کے دل چسپ کارناموں کی جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں۔

نثار احمد فاروقی کہتے ہیں:

> ''خاکہ نگاری، سوانحِ عمری سے بھی مختلف چیز ہے۔ سوانحِ عمری میں خاکے کی گنجائش ہوتی ہے لیکن خاکے میں سوانحِ عمری مشکل سے سماتی ہے۔''
>
> (دیدودریافت، نثار احمد فاروقی، ص/۱۸، ۱۹۶۴ء)

رشید احمد صدیقی کہتے ہیں:

> ''خاکہ نگاری کی بڑی اور اولین شرط میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ معمولی کو غیر معمولی بنادے۔ بڑے کو کتنا بھی بڑا دِکھانا آسان ہوگا بہ نسبت اِس کے کہ چھوٹے کو بڑا دِکھایا جائے، یہ فن اور فن کار کی معراج ہوگی۔''
>
> (پرانے چراغ، حصہ دوم، ابوالحسن علی ندوی، ص/۵۸۱، ۱۹۸۰ء)

03.04 خاکہ نگاری کے اجزاے ترکیبی

خاکہ نگاری کے اجزاے ترکیبی درجِ ذیل ہیں:

﴿۱﴾ **اختصار:** خاکہ نگاری کا ایک اہم وصف اختصار ہے۔ اختصار سے الفاظ کا ایسا اختصار مُراد ہے جس میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کیفیت ہو۔ ایک عمدہ خاکے میں اختصار کے اِس عمل کو الفاظ وبیان کے علاوہ خاکے کے دیگر اجزا میں بھی ہونا چاہیے۔ اختصار کی خصوصیت کے پیشِ نظر طویل اور مختصر دونوں طرح کے خاکے قلم بند کیے گئے ہیں جیسے مرزا فرحت اللہ بیگ کا لکھا ہوا طویل خاکہ ''نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی، کچھ میری زبانی'' اور مولوی عبدالحق کا لکھا ہوا حکیم امتیاز الدین کا صرف ڈیڑھ صفحات کا مختصر خاکہ۔

﴿۲﴾ **کردار نگاری:** خاکہ نگاری میں ''کردار نگاری'' کو بنیادی اہمیت حاصل ہے جس کے بغیر خاکے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ دراصل خاکے کا تعلق شخصیت سے ہوتا ہے اور شخصیت کردار کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ خاکہ نگار کا اصل کام اِسی خصوصیت کو اُبھارنا ہے۔ کردار عموماً دو طرح کے ہوتے ہیں۔ (۱) مثالی کردار (۲) اِرتقای کردار۔ مثالی کردار ابتدا ہی سے پختہ اور کسی خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ کردار حادثات وواقعات اور زمانے کے نشیب وفراز سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ خود اُن پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اِرتقای کردار عمر اور زمان و

مکان کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ کردار حادثات و واقعات اور زمانے کے نشیب وفراز سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اِنہیں ''فطری کردار'' بھی کہتے ہیں۔ شخصی خاکوں میں دونوں طرح کے کردار ہوتے ہیں۔

﴿۳﴾ واقعہ نگاری: ''واقعہ نگاری'' کے بغیر ایک عمدہ خاکہ مکمل نہیں ہوسکتا۔ خاکے میں کسی شخصیت کی زندگی کے اہم واقعات کا انتخاب اِس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اُس کی اہم خصوصیات بے نقاب ہو جائیں۔ ایک ماہر خاکہ نگار سُنے سُنائے واقعات کی بہ نسبت اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوئے واقعات کو ترجیح دیتا ہے۔ اگر کسی شخصیت کی سیرت کے کسی ایک پہلو یا ایک ہی طرح کے کئی پہلوؤں کو اُبھارنے کے لئے کئی واقعات پیش کیے جائیں تو وحدتِ تاثر قائم نہیں رہتا۔ اِس لئے خاکہ نگار کو ایک ہی طرح کے یا ایک سے زائد واقعات کے انتخاب سے گریز کرنا چاہیے۔

﴿۴﴾ منظر نگاری: کسی واقعے کی جزئیات کی عکاسی کو ''منظر نگاری'' کہتے ہیں۔ اگر کسی واقعے، حادثے، حالت یا کیفیت کو اِس انداز میں بیان کیا جائے کہ اُس کی جیتی جاگتی تصویر نگاہوں کے سامنے پھرنے لگے تو اُسے منظر نگاری کہیں گے۔ منظر نگاری ہی کی وجہ سے زمان ومکان کا تعین ہوتا ہے۔ خاکہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس کیفیت یا منظر کی تصویر کھینچے، اُس میں تصنع، بناوٹ اور تکلف کا شائبہ تک نہ ہو، اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب خاکہ نگار کا مشاہدہ گہرا ہو اور اُسے زبان وبیان پر بھی غیر معمولی دَست رَس حاصل ہو۔

﴿۵﴾ وحدتِ تاثر: ''وحدتِ تاثر'' خاکہ نگاری کا ایک اہم جزو ہے۔ اکثر وبیش تر ناقدینِ ادب نے وحدتِ زمان، وحدتِ مکان اور وحدتِ عمل پر زور دیا ہے جب کہ بعض ناقدینِ ادب نے وحدتِ زمان، وحدتِ مکان اور وحدتِ عمل کے علاوہ وحدتِ تاثر کی بھی نشان دہی کی ہے بلکہ اُسے خاکہ نگاری کے لئے ضروری بھی قرار دیا ہے۔ دراصل وحدتِ زمان، وحدتِ مکان اور وحدتِ عمل کا اصلی مقصد خاکہ نگاری میں ''وحدتِ تاثر'' پیدا کرنا ہے۔ اِس لئے اگر یہ کہا جائے کہ اِن تینوں وحدتوں کا منطقی نتیجہ ''وحدتِ تاثر'' ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ایک کامیاب خاکے کے لئے ضروری ہے کہ حالات، واقعات، مکالمات اور بیانات وغیرہ کو اِس طرح ترتیب دیا جائے کہ وحدتِ تاثر قائم ہو جائے۔ خاکے کے ابتدائی اور درمیانی حصّوں کو اختتامیے سے اِس طرح پیوست ہونا چاہیے کہ شروع سے آخر تک وحدتِ تاثر قائم رہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ خاکہ کا لغوی معنی کیا ہے؟

﴿۲﴾ اختصار کسے کہتے ہیں؟

﴿۳﴾ منظر نگاری کسے کہتے ہیں؟

03.05 خاکہ نگاری کی اقسام

خاکہ نگاری کا شمار اُردو نثر کی جدید اصناف میں کیا جاتا ہے۔ خاکہ نگاری کی ہیئت، مواد، مقاصد اور محرکات وغیرہ کے لحاظ سے اس کی درجِ ذیل اقسام ہیں:

﴿۱﴾ تعارفی خاکہ

جس خاکے میں کسی شخصیت کا تعارف پیش کیا جاتا ہے، اُسے تعارفی خاکہ کہتے ہیں۔ اِس قسم کے خاکے اکثر مختصر ہوتے ہیں۔ خاکہ نگار متعلقہ شخصیت کی زندگی کے کسی ایسے گوشے کو بے نقاب کرتا ہے جس سے دوسرے لوگ ناواقف ہوتے ہیں۔

﴿۲﴾ سرسری خاکہ

جس خاکے میں تفصیل کے بجائے مختصر تاثرات پیش کیے جاتے ہیں، اُسے سرسری خاکہ کہتے ہیں۔ کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں کہ خاکہ نگار کو اُن کی قربت کے بہت کم مواقع میسر ہوتے ہیں۔ چند لمحوں کی ملاقات ہی خاکے کی تخلیق کا سبب بن جاتی ہے۔ خاکہ نگار ایسے افراد کی جن صفات سے متاثر ہوتا ہے، اُنہی کو اپنے خاکے کا موضوع بنا کر پیش کر دیتا ہے۔ اِس قسم کے خاکوں میں کردار کے ذاتی حالات کم اور صورت وسیرت کے نقوش زیادہ اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔

﴿۳﴾ تاثراتی خاکہ

جس خاکے میں خاکہ نگار کسی شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کرتا ہے، اُسے تاثراتی خاکہ کہتے ہیں۔ خاکہ نگار متعلقہ شخصیت کو جیسا دیکھتا یا محسوس کرتا ہے اُس کو اُسی رنگ میں اپنے تاثرات کے ساتھ پیش کر دیتا ہے۔ اِس قسم کے خاکوں میں خاکہ نگار اُن روابط، تعلقات اور جذبات کو ضرور اُبھارتا ہے جو اُس کے اور متعلقہ شخصیت کے درمیان ہوتے ہیں۔

﴿۴﴾ مدحیہ خاکہ

جس خاکے میں کسی شخصیت کی خوبیاں مدحیہ انداز میں بیان کی جائیں، اُسے مدحیہ خاکہ کہتے ہیں۔ خاکہ نگار جذباتی عقیدت، محبت، اُنسیت اور لگاؤ کی وجہ سے متعلقہ شخصیت کی ایسی تصویر کشی کرتا ہے کہ اُس کے اَوصاف نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اِس قسم کے خاکوں میں عقیدت، احترام، آداب، خلوص اور ہم دَردی وغیرہ کے جذبات کارفرما ہوتے ہیں۔

﴿۵﴾ بیانیہ خاکہ

جس خاکے میں خاکہ نگار کسی شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات بیانیہ انداز میں قدرے سنجیدگی کے ساتھ تفصیل سے بیان کرتا ہے، اُسے بیانیہ خاکہ کہتے ہیں۔ بیانیہ خاکہ انشائیہ کی طرح ہوتا ہے۔ اِس قسم کے خاکے متعلقہ شخصیت کی صورت وسیرت کے بھی عکاس ہوتے ہیں اور خود خاکہ نگار کے مزاج کے بھی آئینہ دار ہوتے ہیں۔ خاکہ نگار متعلقہ شخصیت کے آئینے میں زندگی کے حقائق یا خود اپنے خیالات کا عکس دیکھتا اور دِکھاتا ہے نیز مختلف واقعات کی مدد سے اپنے تاثرات رقم کرتا ہے۔

﴿۶﴾ کرداری خاکہ

جس خاکے میں خاکہ نگار کسی شخصیت کے معروضی کردار کے ساتھ ساتھ اپنے تاثرات بھی پیش کرتا ہے، اُسے کرداری خاکہ کہتے ہیں۔ کرداری خاکہ افسانے کی طرح ہوتا ہے۔ خاکہ نگار کو کرداری خاکہ تخلیق کرنے کے لئے نفسیاتی بصیرت کا حامل ہونا چاہیے۔ متعلقہ شخصیت کی زندگی کے واقعات کو اِسی نقطۂ نظر سے منتخب کر کے خاکہ نگاری کے پیکر میں ڈھالا جاتا ہے۔

﴿۷﴾ سوانحی خاکہ

جس خاکے میں کسی شخصیت کی زندگی کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے، اُسے سوانحی خاکہ کہتے ہیں۔ سوانحی خاکہ، مختصر سوانحِ عمری کی طرح ہوتا ہے۔ خاکہ نگار متعلقہ شخصیت کی پیدائش سے لے کر اُس کے آخری وقت تک کے حالات تسلسل سے قلم بند کرتا ہے۔ اِس قسم کا خاکہ لکھنے کے

لئے خاکہ نگار کا متعلقہ شخصیت کی ذاتی زندگی اور سیرت و کردار سے پوری طرح واقف ہونا ضروری ہے تاکہ وہ متعلقہ شخصیت کی زندگی کے تاب ناک و تاریک دونوں پہلوؤں کو اُجاگر کر سکے۔

﴿۸﴾ معلوماتی خاکہ

جس خاکے میں کسی شخصیت کی زندگی کے ایسے پہلو کی نشان دہی کی جائے جس سے دوسرے لوگ ناوقف ہوں لیکن خاکہ نگار اُس پہلو سے واقف ہو، اُسے معلوماتی خاکہ کہتے ہیں۔ اِس قسم کے خاکے ایسے مواد کے حامل ہوتے ہیں جو قارئین کے لئے نئے ہوتے ہیں کیوں کہ وہ اُس سے واقف نہیں ہوتے ہیں۔

﴿۹﴾ اجتماعی خاکہ

جس خاکے میں ایک ساتھ کئی شخصیات کا تعارف پیش کیا جاتا ہے، اُسے اجتماعی خاکہ کہتے ہیں۔ انفرادی خاکے میں کسی ایک شخصیت کا تعارف پیش کیا جاتا ہے جب کہ اجتماعی خاکے میں ایک سے زیادہ شخصیات کی صورت و سیرت کی عکاسی کی جاتی ہے۔ اِس قسم کے خاکوں میں خاکہ نگار ایک ساتھ دو یا دو سے زائد شخصیات کا تعارف پیش کرتا ہے۔

﴿۱۰﴾ مزاحیہ خاکہ

جس خاکے میں کسی شخصیت کی صورت و سیرت کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا جائے، اُسے مزاحیہ خاکہ کہتے ہیں۔ مزاحیہ خاکے کا مقصد متعلقہ شخصیت کی زندگی کے مضحک پہلوؤں کو نمایاں کر کے قارئین کے لئے تفریحِ طبع کا سامان فراہم کرنا ہوتا ہے جس کے لئے خاکہ نگار دل چسپ واقعات اور لطائف کا سہارا لیتا ہے۔

﴿۱۱﴾ طنزیہ خاکہ

جس خاکے میں کسی فرد، ماحول، معاشرے یا نظام وغیرہ کو طنز کا نشانہ بنایا جاتا ہے، اُسے طنزیہ خاکہ کہتے ہیں۔ طنزیہ خاکے میں الفاظ اور لہجے کا رول نہایت اہم ہوتا ہے۔ خاکہ نگار اپنے مخصوص لب و لہجے اور موزوں الفاظ کے استعمال سے سنجیدہ قارئین کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھیر دیتا ہے۔

﴿۱۲﴾ ذاتی خاکہ

جس خاکے میں خاکہ نگار اپنی داخلی زندگی کی کیفیات، سیرت و کردار اور ذاتی حالات وغیرہ کو بیان کرے، اُسے ذاتی خاکہ کہتے ہیں۔ ذاتی خاکہ لکھنا ایک مشکل فن ہے کیوں کہ اِس میں خاکہ نگار کو غیر جانب داری کے ساتھ اپنے ایسے اہم خدوخال کو پیش کرنا پڑتا ہے جو واقف اور ناواقف ہر ذہن میں اصل کی یاد تازہ کر دیں۔

﴿۱۳﴾ اِنٹرویو خاکہ

جس خاکے میں کسی شخصیت کی زندگی کے اہم پہلوؤں کی نشان دہی کی جائے اور اُس میں خاکہ نگار کے تاثرات و مشاہدات بھی شامل ہوں، اُسے اِنٹرویو خاکہ کہتے ہیں۔ اِنٹرویو بھی خاکے کی ایک قسم ہے۔ اِس قسم کے خاکے میں خاکہ نگار ایسے سوالات قائم کرتا ہے جن کے ذریعے متعلقہ شخصیت کی ذاتی زندگی، مشاغل اور ادبی خدمات وغیرہ کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۴﴾ تعارفی خاکہ کسے کہتے ہیں؟

﴿۵﴾ سوانحی خاکہ کسے کہتے ہیں؟

﴿۶﴾ طنزیہ خاکہ کسے کہتے ہیں؟

03.06 نثری اصناف میں خاکہ نگاری

خاکہ نگاری ایک مشکل صنف ہے۔خاکہ نگاری کے ذریعے کسی شخصیت کی دُھندلی تصویر کو چمکایا جاسکتا ہے اور چمکتی ہوئی تصویر کو مدھم کیا جاسکتا ہے۔خاکہ نگاری کا شمار اُردو نثر کی جدید اصناف میں کیا جاتا ہے۔اُردو کی دیگر نثری اصناف کے مقابلے میں خاکہ نگاری ایک نَو خیز صنف ہے۔خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش ''داستان، تذکرہ، خطوط، سوانح، خودنوشت سوانح، سفرنامہ، رپورتاژ، کالم اور اِنٹرویو'' وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ذیل میں اُردو کی نثری اصناف میں خاکہ نگاری کی کچھ جھلکیاں پیش کی جارہی ہیں تاکہ آپ خاکہ نگاری کے ابتدائی آثار سے پوری طرح واقف ہوجائیں۔

﴿۱﴾ داستان میں خاکہ نگاری

اُردو زبان کی داستانوں میں اُردو شعرا کے حالات، اُن کی وضع قطع، ہیئت، مزاج، عادات واَطوار، کردار، لباس، عیب وہنر اور اُن کے شعری محاسن ومعائب وغیرہ کے بارے میں بہت ساری باتیں درج ہیں جن کو خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔آیئے کچھ داستانوں کی روشنی میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کا جائزہ لیتے ہیں:

فضل علی خان فضلی کی ''کربل کتھا'' (۱۱۴۵ھ) اُردو زبان کی ایک اہم داستان ہے۔اُس کی آٹھویں مجلس میں فضلی نے سیدنا قاسم بن حسن (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کے میدانِ کربلا میں آنے اور کوفیوں کو اپنی شمشیرِ بے نیام کے جوہر دِکھانے کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''عمر ملعون نے ایک لعین اَرزق نام کوں (کو) کہ سپہسار (سپہ سالار) شام کا تھا، بولا، کہا، اے اَرزق! ہر سال دو ہزار دینار یزید سے لیتا اور بہادروں کے کان میں شہرہ اپنی بہادری کا پہونچاتا۔بارے اِس جوان کوں (کو) ہمارے سر سے دَفع کر۔اُوس (اُس) نے کہا، اے عمر! یہ بات تجہ (تجھ) سے بعید ہے کہ مجہے (مجھے) ملکِ شام میں ہزار سوار کے برابر گنتے اَورتوں (تُو) مجہے (مجھے) ایک لڑکے سے لڑنے کو بھیجنا چاہتا ہے کہ نام وننگ میرا توڑے؟ مجھے ننگ آتا ہے کہ اِس سے لڑوں۔عمرِ نحس گہڑک (گھڑک) کہا، اے ملعون! یہ لڑکا کیوں کر ہے؟ فرزند حسن مجتبیٰ کا، پوتا شیرِ خدا کا، نواسا محمد مصطفیٰ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کا، کئی سَو بہادروں کوں (کو) اَبہی (ابھی) تجہ (تجھ) آگے مار چوکا (چکا)، جا، بہانہ نہ کر اور لا اُس کا سَر، تا یزید و اِبنِ زیاد آگے عمدہ کہلائے اور آبرو پاوے''۔
>
> (کربل کتھا، فضل علی خان فضلی، ص/۱۰۹، ۱۷۳۲ء)

فضلی نے ''کربل کتھا'' کی دسویں مجلس میں سیدنا امام حسین (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے بڑے شہزادے ''سیدنا علی اَکبر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)'' کا ذکرِ خیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''علی اکبر جوان تہا (تھا) اٹہارنہ (اٹھارہ) برس کا، مونہہ (منہ) مانندآفتاب کے اور گیسو مانندِ مشکِ ناب، خُلق و خِلقت وصورت میں شبیہِ رسولِ خدا (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)، جس وقت شوقِ دیدارِ سیدِ اَبرار (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) اہلِ مدینہ پر غالب ہوتا، آتے اور جمالِ باکمالِ علی اَکبر کوں (کو) دیکہتے (دیکھتے) اور جب اشتیاقِ کلامِ خیرالانام (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) اُن پر غلبہ کرتا، آکر بولنا علی اَکبر کا سنتے، لیکن جب وہ جوان میدان میں پہونچا، میدانِ کربلا اُوس (اُس) جمال کی شعاع سے روشن ہوا، لشکریانِ عمرِ سعدِ لعین وہ جمال دیکہہ (دیکھ) کر حیران ہوئے اور عمر سعد سے پوچہے (پوچھے): یہ کون ہے کہ توں (تُو) ہمیں اِس سے لڑنے کوں (کو) بھیجتا؟۔ ملعون کہا (ملعون نے کہا)، یہ حسین کا بڑا بیٹا ہے۔ لیکن علی اَکبر، نوجوان، بہشت کا سَروِرَواں، اور گُلِ اَرغواں۔''

(کربل کتھا، فضل علی خان فضلی، ص ۱۲۴، ۱۹۶۱ء)

﴿۲﴾ تذکرہ میں خاکہ نگاری

اُردو زبان کے تذکروں میں بھی اُردو شعرا کے حالات، اُن کی وضع قطع، ہیئت، مزاج، عادات واَطوار، کردار، لباس، عیب و ہنر اور اُن کے شعری محاسن ومعائب وغیرہ کے بارے میں بہت ساری باتیں دَرج ہیں جن کو خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ آیئے کچھ تذکروں کی روشنی میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کا جائزہ لیتے ہیں:

اَبوالحسن اَمیرالدین اَحمد اَمراللہ آبادی نے ۱۱۹۳ھ میں اُردو زبان کے شعرا کا فارسی زبان میں ایک تذکرہ لکھا تھا جسے ڈاکٹر مجیب احمد قریشی نے ۱۹۶۸ء میں ''تذکرہ مسرت اَفزا'' کے نام سے اُردو زبان میں منتقل کیا ہے۔ اَبوالحسن اَمیرالدین اَحمد اَمراللہ آبادی اُس تذکرے میں وؔلی دکنی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''محمد ولی، وؔلی تخلص۔ خفی وجلی کمالات کے مظہر، مجمعِ فضائل، عارف، اہلِ دل، دَکن میں پیدا ہوئے اور آغازِ شعور سے اُن ملکوں میں یکتائی کا نقارہ بجاتے رہے۔ کہتے ہیں کہ شاہ جہان آباد میں آئے تھے اور شاہ گلشن کی خدمت میں (جو کہ اَخلاق واَوصاف کے گلشن تھے) اِرادت پیدا کی۔ ایک دن اپنے کچھ شعر اُن بزرگوار کے سامنے پڑھے اور اُن کو محظوظ کیا۔ اُنہوں نے فرمایا کہ فارسی کے بہت سے مضامین بے کار پڑے ہوئے ہیں، تم زبانِ ریختہ میں اُن کو کام میں لاؤ، کون تم سے حساب لے گا؟ سچ جھوٹ راوی کی گردن پر، اَلغرض ریختہ کی اصل دَکن سے ہے اور وہاں اِس تازہ ایجاد کے موجد وؔلی ہیں۔ اُس کے بعد ہندوستان کے سخن وَروں نے اپنے کلام کو اِس رَوِش سے آراستہ کیا۔ اُن کا کلام آج تک زمانے کے ورق پر لکھا ہوا ہے اور

اُن کی استادی سخن وَروں کے دلوں پر نقش ہے۔ اُن کے اشعار اِس حد تک مشہور ہو چکے ہیں کہ کوئی کان اُن سے نا آشنا نہیں''۔

(تذکرہ مسرت اَفزا، اَبوالحسن اَمیر الدین اَحمد اَمر اللہ آبادی، ۱۱۹۳ھ، ص/۵۱-۲۵۰)

علی ابراہیم خاں خلیلؔ کا تذکرہ ''گلزارِ ابراہیم'' ۱۷۷۹ء، جسے مرزا علی لطفؔ نے کچھ اضافے کے ساتھ ۱۸۰۱ء میں ''تذکرہ گلشنِ ہند'' کے نام سے اُردو زبان میں منتقل کیا ہے۔ مرزا علی لطفؔ اُس تذکرے میں میر تقی میرؔ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میرؔ تخلص، نام نامی اُس نگینِ خاتمِ سخن آفرینی کا، میر محمد تقی ہے۔ متوطن اکبر آباد کے، سراج الدین علی خاں آرزوؔ تخلص، آپ کے کچھ رشتہ داروں میں دُور کے تھے۔ ابتدائے سِنِ شعور سے پرورش اُنہوں نے دارالخلافہ شاہ جہان آباد میں پائی ہے اور خانِ مذکور کے فیضِ صحبت سے نظمِ ریختہ کی کیفیت باریکیوں کے ساتھ اُٹھائی ہے۔ تازگی مضمون کی، اور عُلو معانی کا، بیان سے اُن کے ظاہر ہے۔ فی الحقیقت کہ شاعرِ مذکور لطافتوں سے ریختہ کی، بہ خوبی ماہر ہے۔ جو شخص کہ نظارہ گاہِ سخن میں چشمِ خوردہ بیں رکھتا ہے اور چاشنیِ خرد سے امتیازِ ذائقہِ تلخ وشیریں رکھتا ہے تو وہ اِس بات کو جانتا ہے اور اِس رمز کو پہچانتا ہے کہ میرِ شیریں مقال میں، اور ریختہ گویانِ سابق وحال میں، نسبتِ خورشید و ماہ ہے اور فرقِ سفید و سیاہ ہے، بلکہ حجاب اگر مانع نہ ہو بیان کا، تو تفاوت ہے زمین اور آسمان کا، غرض اِس تردُّد سے زبان قلم کی، اور اِس خراش سے عارض رقم کی مراد یہ ہے کہ ناقدر دانی سے اَغنیا کی، اور ناسمجھی سے اہلِ دنیا کی، اب بازارِ سخن سازی اِس درجہ کاسد ہے، اور ہوائے شہرستانِ معنی طرازی اِس مرتبہ فاسد کہ میرؔ سا شاعر جو کہ سحر کاریِ سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا، اور جادو طرازیِ بیان میں معانی پرداز ہے مقال کا، وہ نانِ شبینہ کا محتاج ہے، اور بات کوئی نہیں اُس کی پوچھتا آج ہے''۔

(تذکرہ گلشنِ ہند، مرزا علی لطفؔ، ص/۲۰۹-۲۰۸، ۱۸۰۱ء)

﴿۳﴾ خطوط میں خاکہ نگاری

خطوط میں بھی اُردو شعرا کے حالات، اُن کی وضع قطع، ہیئت، مزاج، عادات واَطوار، کردار، لباس، عیب وہنر اور اُن کے شعری محاسن ومعائب وغیرہ کے بارے میں بہت ساری باتیں درج ہیں جن کو خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ آیئے کچھ خطوط کی روشنی میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کا جائزہ لیتے ہیں:

مرزا غالبؔ نے اپنے خطوط کے دوسرے مجموعے ''اُردوئے معلّٰی'' میں مولوی منشی حبیب اللہ خان کے نام ایک خط میں اپنا تعارف پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوَراءالنہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان آیا۔ سلطنت ضعیف ہوگئی تھی۔ صرف ۵۰ر گھوڑے نقارہ نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اُس کے جو طوائف الملوک کا ہنگامہ گرم تھا وہ علاقہ نہیں رہا۔ باپ میرا

عبداللہ بیگ خان بہادر لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعدِ چند روز حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خان کا نوکر ہوا۔ ۳۰۰ر کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر اکوٗر کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔

(اُردوے معلّٰی، مرزا غالبؔ، ص ر ۲۷-۲۶، ۱۸۶۹ء)

اُسی خط میں کچھ آگے مرزا غالبؔ لکھتے ہیں:

''نصر اللہ بیگ خاں میرا چچا حقیقی، مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا۔ اُس نے مجھے پالا۔ ۱۸۰۶ء میں جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا۔ صوبہ داری، کمشنری ہوگئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ ۴۰۰ر سوار کا برگیڈیر ہوا۔ ۱۰۰۰ر روپیہ ذات کا اور لاکھ، ڈیڑھ لاک روپیہ سال کی جاگیر حینِ حیات علاوہ سال بھر مرزبانی کے تھی کہ بہ مَرگِ ناگاہ مَر گیا، رسالہ بَرطرف ہوگیا۔ مِلک کی عوض نقدی مقرر ہوگئی، وہ اب تک پاتا ہوں۔ ۵ر برس کا تھا جو باپ مَر گیا۔ ۸ر برس کا تھا جو چچا مَر گیا۔''

(اُردوے معلّٰی، مرزا غالبؔ، ص ر ۲۷-۲۶، ۱۸۶۹ء)

﴿۴﴾ سوانح میں خاکہ نگاری

سوانح میں بھی اُردو شعرا کے حالات، اُن کی وضع قطع، ہیئت، مزاج، عادات واَطوار، کردار، لباس، عیب و ہنر اور اُن کے شعری محاسن ومعائب وغیرہ کے بارے میں بہت ساری باتیں درج ہیں جن کو خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

آیئے کچھ سوانح کی روشنی میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کا جائزہ لیتے ہیں:

الطاف حسین حالیؔ نے ''یادگارِ غالبؔ'' میں مرزا غالبؔ کے اخلاق وعادات کے بارے میں لکھا ہے:

''مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے، جو اُن سے ملنے جاتا تھا، بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو شخص ایک دفعہ اُن سے مِل آتا تھا، اُس کو ہمیشہ اُن سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے اور اُن کی خوشی سے خوش اور اُن کے غم سے غم گین ہوتے تھے۔ اِس لئے اُن کے دوست ہر ملت اور ہر مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے۔ جو خطوط اُنہوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں، اُن کے ایک ایک حرف سے مہر ومحبت وغم خواری ویگانگت ٹپکی پڑتی ہے۔ ہر ایک خط کا جواب لکھنا وہ اپنے ذِمے فرضِ عین سمجھتے تھے۔ اُن کا بہت سا وقت دوستوں کے خطوں کے جواب لکھنے میں صَرف ہوتا تھا۔ بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی وہ خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے۔ وہ دوستوں کی فرمائشوں سے کبھی تنگ دل نہ ہوتے تھے۔ غزلوں کی اصلاح کے سِوا اَور طرح طرح کی فرمائشیں اُن کے بعض خالص ومخلص دوست کرتے تھے اور وہ اُن کی تعمیل کرتے تھے۔''

(یادگارِ غالبؔ، الطاف حسین حالیؔ، ص ر ۵۵، ۱۸۹۶ء)

الطاف حسین حالؔی ''حیاتِ جاوید'' میں سرسید احمد کے بچپن کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بچپن میں سرسید پر نہ تو ایسی قید تھی کہ کھیلنے، کُودنے کی بالکل بندی ہو اور نہ ایسی آزادی تھی کہ جہاں چاہیں اور جن کے ساتھ چاہیں، کھیلتے، کُودتے پھریں.....اُن کے بزرگوں نے یہ اجازت دے رکھی تھی کہ جس کھیل کو تمہارا جی چاہے، شوق سے کھیلو مگر کسی کھیل کو چھپا کر مت کھیلو۔ اِس لئے.....جو کھیل کھیلتے تھے، اپنے بڑوں کے سامنے کھیلتے تھے۔ اُن کے کھیلوں میں ایسی کوئی بات نہ ہوتی تھی جو اپنے بزرگوں کے سامنے نہ کرسکیں.....ابتدا میں وہ اکثر ''گیند بلاّ، کبڈّی، گیڑیاں، آنکھ مچول، چیل چلو'' وغیرہ کھیلتے تھے''۔

(حیاتِ جاوید، الطاف حسین حالؔی، ص/۳۰، ۱۹۰۱ء)

﴿۵﴾ خودنوشت سوانح میں خاکہ نگاری

خودنوشت سوانح میں بھی اُردو شعرا کے حالات، اُن کی وضع قطع، ہیئت، مزاج، عادات واَطوار، کردار، لباس، عیب و ہنر اور اُن کے شعری محاسن و معائب وغیرہ کے بارے میں بہت ساری باتیں درج ہیں جن کو خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ آیئے کچھ خودنوشت سوانح کی روشنی میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کا جائزہ لیتے ہیں:

جوشؔ ملیح آبادی نے اپنی خودنوشت ''یادوں کی برات'' میں وحیدالدین سلیمؔ کے بارے میں کچھ اِس طرح کے تعارفی کلمات لکھے ہیں:

''پانی پت کے باشندے، حالؔی کے ذی علم ہم وطن، حیدرآباد دکن کی عثمانیہ یونی وَرسٹی میں اُردو کے پروفیسر، سید احمد خاں کے سابق سکریٹری، اُردو زبان کے مزاج دان وقوّام، وضعِ اصطلاحات کے مصنف، غیر معمولی دَرّاک و ذہین، بے حد بذلہ سنج، نیچریوں کے استاد، مبلغِ اِلحاد، بڑے جان دار متشاعر، اور کنجوسی میں قارون کے قبلہ والدِ گرامی۔ لیکن جسم اِس قدر بھدا اَور صورت ایسی ناقابلِ برداشت کہ الامان والحفیظ۔ اُن کے چہرے کا رنگ اِس قدر کٹنا اور لبدھڑ تھا، گویا بہت پرانا، چکٹا ہوا تیل جما ہوا ہے اور اُن کے رخساروں پر ایسی بے آبرو کردینے والی داڑھی لٹکی ہوئی تھی کہ جب نگاہ اُس کی جانب اُٹھتی تھی تو ہزاروں گدھ دیکھنے والوں کے پیوٹوں پر آکر بیٹھ جاتے اور بیٹ کرنے لگتے تھے''۔

(یادوں کی برات، جوشؔ ملیح آبادی، ص/۵۶۷، ۱۹۷۰ء)

پروفیسر مسعود حسین خاں اپنی خودنوشت ''ورودِ مسعود'' میں اپنی نانی صاحبہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پتورہ کے ''بڑے گھر'' کی سب سے عظیم شخصیت نانی صاحبہ یا ''بی'' تھیں۔ میری ابتدائی زندگی پر اُن کا گہرا اثر رہا ہے۔ وہ ایک عجیب وغریب شخصیت کی مالک تھیں۔ ولایتی رنگ، گوری چٹّی، کرنجی آنکھیں اور گراں ڈیل، جس محفل میں بیٹھتیں، چھا جاتیں۔ حقہ اور پان کی شوقین، آخر عمر میں جب منہ پوپلا ہوگیا تھا تو

''پن کٹّی'' ساتھ چلتی۔ حقہ کا ہر وقت ساتھ رہنا ضروری تھا۔ وہ پڑھی لکھی تو معمولی تھیں لیکن علمِ مجلسی سے اچھی طرح واقف تھیں''۔

(ورودِ مسعود، پروفیسر مسعود حسین خاں، ص/۱۶، ۱۹۸۸ء)

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۷﴾ ''کربل کتھا'' کس کی کتاب ہے؟

﴿۸﴾ ''تذکرہ گلشنِ ہند'' کس کی کتاب ہے؟

﴿۹﴾ ''اردوے معلّٰی'' کس کے خطوط کا مجموعہ ہے؟

﴿۶﴾ سفرنامہ میں خاکہ نگاری

سفرناموں میں بھی اُردو شعرا کے حالات، اُن کی وضع قطع، ہیئت، مزاج، عادات واَطوار، کردار، لباس، عیب و ہنر اور اُن کے شعری محاسن و معائب وغیرہ کے بارے میں بہت ساری باتیں درج ہیں جن کو خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ آیئے کچھ سفرناموں کی روشنی میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کا جائزہ لیتے ہیں:

بی. بی. سی لندن کی اُردو سروس کے لئے رضا علی عابدی ''جرنیلی سڑک'' کے نام سے ایک سلسلہ وار پروگرام نشر کرتے تھے۔ اُس میں وہ ''ایک گاؤں، ایک شہر'' کے عنوان کے تحت مغل شہنشاہ ''اَورنگ زیب عالم گیر اور شہرِ لاہور'' کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اَورنگ زیب کی بات کیے بغیر لاہور کی بات پوری نہیں ہوتی۔ وہ اگرچہ جنوبی ہند کی سیاست میں اُلجھا رہا اور صرف دو تین مرتبہ لاہور آیا لیکن اِس شہر کو اُس نے بادشاہی مسجد جیسی عبادت گاہ عطا کی جو لاہور کی اَنگشتری میں نگینے کی طرح جڑی ہے اور اُس کے قریب اکبر اور شاہ جہاں کا قلعہ، رَنجیت سنگھ کی سَمادھی، اقبالؔ کی آخری آرام گاہ اور قراردادِ پاکستان کی یادگار، یہ سب تاریخ کی نشانیاں ہیں جو سمٹ کر ایک چھوٹے سے خطے میں سَما گئی ہیں کہ دنیا اُسے لاہور کے نام سے جانتی ہے۔''

(جرنیلی سڑک، رضا علی عابدی، ص/۱۲۹، ۲۰۰۲ء)

مجتبیٰ حسین اعلیٰ درجے کے سفرنامہ نگار ہیں۔ ''حسن چشتی'' نے اُن کے سفرناموں کو ترتیب دے کر ''مجتبیٰ حسین کے سفرنامے'' کے نام سے ۲۰۰۳ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ پاؤس، دہلی سے شائع کیا ہے۔ مجتبیٰ حسین اُس میں ''دنیا کے غفورو! ایک ہو جاؤ!'' کے عنوان کے تحت ''اشتیاق عابدی'' کا تذکرہ کرتے ہیں لکھتے ہیں:

> ''اِس بار اشتیاق عابدی کو اور ہمیں ایک بڑے ڈبل بیڈ والے کمرہ میں ٹھہرایا گیا۔ ہم تو حسبِ عادت گھوڑے بیچ کر سو گئے۔ صبح ۵/ بجے ہماری آنکھ کھُلی تو دیکھا کہ اشتیاق عابدی اپنے بستر میں پڑے ''ہند-رُوس دوستی'' کے موضوع پر بہ آوازِ بلند تقریر کر رہے ہیں۔ ہم بھی کچھ کم چالاک نہیں ہیں۔ بڑی آہستگی کے ساتھ میز پر سے قلم اور کاغذ اُٹھایا اور لگے اُن کی تقریر کے اہم نکات کو نوٹ کرنے۔ اشتیاق عابدی کہے چلے جا

رہے تھے ''ہند-رُوس دوستی'' کے بغیر عالمی اَمن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ رُوس کی دوستی وقت کی کسوٹی پر پَرکھی ہوئی دوستی ہے۔ سوویت یونین نے کب کب، کہاں کہاں اور کیسے کیسے کٹھن وقت میں ہماری مدد کی ہے۔ تقریر تو اُن کی بہت مدلل اور اَثر اَنگیز تھی مگر یہ درمیان میں ''میری اَمّاں، میری اَمّاں'' کی تکرار سے ہمیں تشویش ہوئی۔ دَبے پاؤں اُن کے قریب جا کر اُن کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو یوں لگا جیسے ہم نے جلتے ہوئے تَوے پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ہم نے اُنہیں جگانے کی کوشش کی تو ایک عجیب سی بحرانی کیفیت میں پوچھا: ''کون ہے؟'' ہم نے کہا: ''آپ کا دوست ہوں مجتبیٰ''۔ کروٹ بدلتے ہوئے بولے: ''کوئی مجتبیٰ میرا دوست نہیں ہے۔ سوویت یونین ہی میرا واحد دوست ہے۔ مجھے سوویت یونین کی دوستی پر فخر ہے۔ میری اَمّاں، میری اَمّاں۔''

(مجتبیٰ حسین کے سفرنامے، مرتب حسن چشتی، ص ۱۷-۲۱۶، ۲۰۰۳ء)

﴿۷﴾ رپورتاژ میں خاکہ نگاری

رپورتاژ میں بھی اُردو شعرا کے حالات، اُن کی وضع قطع، ہیئت، مزاج، عادات واَطوار، کردار، لباس، عیب و ہنر اور اُن کے شعری محاسن ومعائب وغیرہ کے بارے میں بہت ساری باتیں درج ہیں جن کو خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ آیئے کچھ رپورتاژ کی روشنی میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کا جائزہ لیتے ہیں:

فکر تونسوی ایک ممتاز رپورتاژ نگار ہیں۔ ''چھٹا دریا'' اُن کے رپورتاژ کا ایک اہم مجموعہ ہے۔ اُس مجموعے میں وہ مشہور شاعر قتیل شفائی کی شادی کا خاکہ اِس انداز میں کھینچتے ہیں:

''آج شام کو میں قتیل کے ہاں گیا تھا۔ اُس رومانوی شاعر کے ماتھے پر ایک شکن بھی تو نہیں آئی تھی۔ اُس کے گھنگھریالے بالوں میں ایک نیا نکھار اور چمکیلا پن پیدا ہو گیا تھا۔ چہرے پر ایک نئی تابندگی کی لہریں دَمک رہی تھیں۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُس نے اپنی ہندو ایکٹرس دوست کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ محلے کی مسجد کے مولوی نے پانچ روپیے لے کر نکاح پڑھ دیا ہے اور کہا ہے کہ اگر اب کلمہ شریف پڑھنے کے بعد بھی کوئی لچّا، لفنگا اُسے ہندو لڑکی سمجھ کر قتل کرنا چاہے تو مجھے اطلاع کر دینا، میں اُسے ٹھیک کر دوں گا۔ میں نے کہا: قتل؟ تم نے پانچ روپیے میں ایک انسان کی جان بچالی، میرے لئے یہی احساسِ مسرت کافی ہے''۔

(چھٹا دریا، فکر تونسوی، ص ۶۴-۶۳، ۱۹۴۸ء)

ممتاز مفتی ایک بلند پایہ رپورتاژ نگار ہیں۔ ''لبیک'' اُن کے رپورتاژ کا ایک اہم مجموعہ ہے۔ اُس مجموعے میں وہ ''بے نیاز فقیر'' کے عنوان کے تحت ایک فقیر کا خاکہ اِس انداز میں کھینچتے ہیں:

''حرم شریف کا وہ فقیر مجھے آج تک نہیں بھُولا، جو سارا دن اور ساری رات حرم کے عین درمیان میں ایک پاؤں پسار کر چادر میں لپٹا سویا رہتا تھا۔ نماز کا وقت ہوتا تو وہ آپ ہی آپ اُٹھ کر بیٹھ جاتا لیکن نماز اَدا

کرنے کے بعد وہ پھر سے چادر تان کر پڑ جاتا.....اُس کے پاس صرف ایک چادر تھی۔ وہ چادر اُس کا واحد ساز وسامان تھی.....نماز پڑھنے کے بعد وہ اتنی بے نیازی سے پاؤں پھیلا کر لیٹ جاتا کہ بسا اوقات اُس کے پاؤں خانۂ خدا کی طرف ہو جاتے، لوگ حیرت سے اُس کی طرف دیکھتے لیکن جلد ہی اُن کی توجہ دوسری باتوں کی طرف منعطف ہو جاتی اور اُنہیں وہ فقیر بھول جاتا۔ کچھ لوگ مارے تجسس کے اُس فقیر کے پاس بیٹھ جاتے کہ اُس پر نظر رکھیں لیکن کسی زائر میں اتنی جرأت نہ ہوتی تھی کہ اُسے جگاتا''۔

(لبیک، ممتاز مفتی، ص/۱۰۹، ۱۹۹۷ء)

﴿۸﴾ کالم میں خاکہ نگاری

کالم میں بھی اُردو شعرا کے حالات، اُن کی وضع قطع، ہیئت، مزاج، عادات واَطوار، کردار، لباس، عیب و ہنر اور اُن کے شعری محاسن و معائب وغیرہ کے بارے میں بہت ساری باتیں درج ہیں جن کو خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ آیئے کچھ کالموں کی روشنی میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کا جائزہ لیتے ہیں:

فکر تونسوی ایک بلند پایہ کالم نگار ہیں۔ انہوں نے روزنامہ ''ملاپ'' میں ''پیاز کے چھلکے'' کے عنوان سے کئی برسوں تک مستقل کالم لکھے ہیں۔ ایک جگہ ''رشتے ناطے کے اشتہار'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''ایک کنیا، عمر ۳۵/برس، وزن مَردانہ، ہنستی ہے تو گولر کے پھول بکھیرتی ہے، روتی تو بالکل نہیں، بلکہ رُلاتی ہے۔ دنیا بھر کا فلسفہ، منطق، سیاست کی کتابیں چاٹ چکی ہے۔ اُس کے لئے ایک ایسے دُولھا کی ضرورت ہے جو سَرد و گرم چشیدہ ہو یعنی کنیا کے مقابلے کی چوٹ ہو۔ عمر کی کوئی قید نہیں، نہ بیاہتا اور کنوارے کا ٹنٹا ہے۔ وہ شادی کے خلاف تھی لیکن ایک جیوتشی نے اُسے وہم میں ڈال دیا ہے کہ تم ایک بچے کی ماں ضرور بنو گی۔ لہٰذا بچے کی ماں بننے کے لئے اُسے ایک خاوند چاہیے۔ وہ خود وکالت کا پیشہ کرتی ہے۔ عام طور پر مَرد لگتی ہے لیکن جب ہنستی ہے تو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اُس کے اندر ابھی ایک نازک سی عورت زندہ ہے۔ اِس لئے اُمیدوار دُولھا کو گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر بچے کی ماں بن گئی تو پتی برتا اِستری بن جانے کا دعویٰ بھی کرتی ہے۔ اِنٹرویو کے لئے بہ راہِ راست ملیں۔ ڈِسٹرکٹ کورٹ میں اُس کا پتہ آسانی سے مل جائے گا کیوں کہ وہ ہزاروں وکیلوں میں ایک ہے''۔

(پیاز کے چھلکے، فکر تونسوی، ص/۲۴۵، ۱۹۱۷ء)

مجتبیٰ حسین اُردو زبان کے مشہور مزاح نگار ہیں۔ انہوں نے ''روزنامہ سیاست'' میں بے شمار کالم لکھے ہیں بلکہ اُن کی کالم نگاری کا آغاز ہی ''روزنامہ سیاست'' سے ہوا ہے۔ اُن کے کالموں میں خاکے جیسی کیفیت پائی جاتی ہے۔ حسن چشتی نے اُن کے کالموں کو ''مجتبیٰ حسین کے منتخب کالم'' کے نام سے ترتیب دے کر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے ۲۰۰۴ء میں شائع کیا ہے۔ اُس میں مجتبیٰ حسین کا ایک کالم ''باتیں کنول پرشاد کی'' کے نام سے شامل ہے جس میں مجتبیٰ حسین نے کنول پرشاد کے ایک شوق کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''کنول جی کو اپنے شعر سنانے کا بڑا شوق تھا (کس شاعر کو نہیں ہوتا)۔کوئی بھی ملنے والا اُن کے پاس آتا تو وہ فوراً اپنے خاص چپراسی اچیا کو طلب کرتے اور اپنے ہاتھ کی اُنگلیوں کے اشارے سے بتاتے جاتے کہ جاؤ، جا کر چائے لے آؤ۔اگر دو انگلیاں بتاتے تو اُس کا مطلب ہوتا دو گھنٹے بعد چائے لے آؤ۔ایک انگلی بتاتے تو اُس کا مطلب ہوتا ایک گھنٹہ بعد چائے لے آؤ۔وہ اپنی شاعری کی مقدار اور اپنی ذاتی مصروفیت کے حساب سے انگلی کا اشارہ طے کرتے تھے اور اچیا حسبِ حکم مقررہ وقت تک دفتر سے غائب ہو جاتا تھا۔اتنی دیر میں وہ اپنے ملاقاتی کو کلام سناتے رہتے تھے۔وہ اُٹھنے کی کوشش کرتا تو کہتے بھائی! چائے آ رہی ہے۔کیسے چلے جاؤ گے؟ چلو، اتنی دیر میں میری ایک تازہ نظم سنو!۔ایک بار کنول جی اپنے چپراسی سے کسی بات پر ناراض ہو گئے اور اُسے بری طرح سے ڈانٹ دیا۔چپراسی بھی آخر کو انسان ہوتا ہے۔اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے وہ میرے پاس آیا اور بتانے لگا کہ کس طرح وہ انگلیوں کے اشارے سے چائے لانے کے وقت کا تعین کر دیتے ہیں اور اُس عرصہ میں معصوم، مظلوم اور بے گناہ ملاقاتیوں کو اپنا کلام سناتے رہتے ہیں۔مجھ پر تو یہ راز فاش ہو ہی گیا تھا۔اتنے میں دیکھا کہ حمایت اللہ کسی کام سے کنول جی کے کمرے میں جا رہے ہیں۔دوستی کے ناتے میں نے اُنہیں یہ راز بتا دیا اور خبردار رہنے کی تلقین کی۔حمایت بھائی کے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی کنول جی خوش ہو گئے اور اپنے ہاتھ کی دو انگلیاں اُٹھا کر اچیا کو چائے لانے کا آرڈر دینے ہی والے تھے کہ حمایت اللہ نے فوراً اُن کا ہاتھ پکڑ لیا۔پھر اُن کے ہاتھ کی ایک انگلی اپنے ہاتھ سے نیچے گرائی اور دوسری انگلی کو آدھا موڑ کر بہ راہِ راست اچیا سے کہا: اچیا! میرے لئے آدھے گھنٹے میں چائے لے آؤ!''

مجتبیٰ حسین کے منتخب کالم، مرتب حسن چشتی، ص/۳۸-۱۳۷، ۲۰۰۴ء)

﴿۹﴾ اِنٹرویوز میں خاکہ نگاری

اِنٹرویوز میں بھی اُردو شعرا کے حالات، اُن کی وضع قطع، ہیئت، مزاج، عادات واَطوار، کردار، لباس، عیب و ہنر اور اُن کے شعری محاسن و معائب وغیرہ کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات درج ہیں جن کو خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔آیئے کچھ اِنٹرویوز کی روشنی میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کا جائزہ لیتے ہیں:

ڈاکٹر صابرہ سعید نے نریش کمار شاد کی کتاب ''جان پہچان'' (جس میں ۱۲ر مشہور افسانہ نگاروں کے اِنٹرویوز شامل ہیں) کے حوالے سے اپنی کتاب ''اُردو ادب میں خاکہ نگاری'' میں لکھا ہے:

کرشن چندر سے جو اِنٹرویو لیا گیا ہے۔ملاحظہ ہو:

''کرشن چندر نے پہلے حیرت زَدہ ہو کر میری طرف دیکھا، پھر پتلون کی جیب سے رومال نکال کر اپنی عینک کے شیشوں کو صاف کرنے کے بعد اپنے لبوں پر محجوب تبسم لاتے ہوئے بڑی بے چارگی سے کہنا شروع کیا: مَیں نومبر ۱۹۱۴ء میں لاہور میں پیدا ہوا، اور میری ادبی زندگی کا آغاز کشمیر میں ہوا، جہاں میں ایم.اے

پاس کرنے کے بعد اختلاجِ قلب کا مریض ہو کر ہسپتال میں پڑا تھا۔ میرے والد جو خود ڈاکٹر تھے، میرا علاج کر رہے تھے، اُس طویل بیماری کے دَوران میں، لیکن صحت یابی کی منزل کے قریب آتے ہوئے میں نے تین افسانے لکھے ''جہلم میں ناؤ پر، یرقان، اور مصور کی محبت'' یہ تینوں افسانے بالترتیب ادبی دنیا اور ہمایوں میں شائع ہوئے۔''

(جان پہچان، نریش کمار شادؔ، بہ حوالہ اُردو ادب میں خاکہ نگاری، ڈاکٹر صابرہ سعید، ص ۲۷/-۱۲۶، ۱۹۷۸ء)

رئیس رام پوری نے مولانا امتیاز علی خاں عرشیؔ کا ایک اِنٹرویو لیا تھا، جو ہفت روزہ ''چھان بین''، رام پور بابت ۳۱/دسمبر ۱۹۷۲ء، ۸/ جنوری ۱۹۷۳ء اور ۱۵/جنوری ۱۹۷۳ء تین شماروں میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ ایک انٹرویو ملاحظہ ہو:

''طوغانی! کچھ کھیلوں کے نام بتانے کی زَحمت فرمایئے گا؟ مولانا عرشی! ہنس کر فرمانے لگے۔ (اِس طرح کہ آنکھوں میں چمک اور چہرے پر سرخی دوڑ گئی، جیسے خود بچپن کے عالم میں پہنچ گئے ہوں) صاحب! تمام ہی کھیل کھیلے تھے جیسے پتنگ بازی، گیڑیاں، کُو دَم کُو دَوّا، لبا دَاس، پتا لانا وغیرہ۔ لیکن ایک بات بتا دوں، پڑھائی کا شوق پیدا ہونے کے بعد تمام کھیل تو چھُوٹ ہی گئے، محلے کے لڑکوں کے نام تک بھُول گیا۔''

(چھان بین، رئیس رام پوری، ص ۲/، ۳۱/دسمبر ۱۹۷۲ء)

03.07 خلاصہ

''خاکہ'' اُردو زبان کا لفظ ہے جس کا لغوی معنی ''تصویر کا ڈھانچا یا خدوخال وغیرہ کی نقل جو اصل کے مشابہ ہو'' ہے۔ اصطلاح میں خاکے سے مراد وہ تحریر ہے جس میں اجمالی طور پر کسی شخصیت کے ظاہری خدوخال، عادات واطوار اور کردار وغیرہ کو بغیر کسی مبالغے کے سیدھے سادے انداز میں اِس طرح پیش کیا جائے کہ اُس شخصیت کی چلتی پھرتی تصویر نگاہوں کے سامنے آ جائے۔ صرف چلتی پھرتی تصویر ہی نہیں بلکہ اُس شخصیت کے اَفکار وخیالات بھی اُبھر کر سامنے آ جائیں۔ چند الفاظ میں خاکے کی تعریف اِس طرح بھی کی جا سکتی ہے کہ ''صفحۂ قرطاس پر الفاظ کے ذریعے بنائی گئی متحرک اور جان دار تصویر کو خاکہ کہتے ہیں۔ خاکے کی ہیئت انشائیہ کے مشابہ ہوتی ہے اور اُس کے ذریعے کسی حقیقی یا خیالی شخص کی شخصیت، سیرت وصورت اور اُس کے دل چسپ کارناموں کی جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں۔

خاکہ نگاری کے اجزائے ترکیبی میں ''اختصار، کردار نگاری، واقعہ نگاری، منظر نگاری اور وحدتِ تاثر'' وغیرہ اہم ہیں۔ خاکہ نگاری کی اقسام میں ''تعارفی خاکہ، سرسری خاکہ، تاثراتی خاکہ، مدحیہ خاکہ، بیانیہ خاکہ، کرداری خاکہ، سوانحی خاکہ، معلوماتی خاکہ، اجتماعی خاکہ، مزاحیہ خاکہ، طنزیہ خاکہ، ذاتی خاکہ، اور اِنٹرویو خاکہ'' وغیرہ اہم ہیں۔ خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش ''داستان، تذکرہ، خطوط، سوانح، خودنوشت سوانح، سفرنامہ، رپورتاژ، کالم اور اِنٹرویو'' وَغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۰﴾ ''یادگارِ غالبؔ'' کس کی کتاب ہے؟

﴿۱۱﴾ ''ورودِ مسعود'' کس کی کتاب ہے؟

﴿۱۲﴾ ''پیاز کے چھلکے'' کس کی کتاب ہے؟

03.08 فرہنگ

اختلاجِ قلب	:	وہ مرض جس میں دل زور سے دھڑکتا ہے	گلِ اَرغواں	:	سرخ پھول
اِستری	:	عورت	گہما گہمی	:	چہل پہل
بیٹ	:	جانوروں کا پاخانہ	مُتَشاعر	:	جو شاعر نہ ہو مگر خود کو شاعر ظاہر کرے
تجسس	:	تلاش	محجوب	:	جو پردے میں ہو
تفاوت	:	فرق	مزاج دان	:	طبیعت کو جاننے والا
خدوخال	:	حلیہ، شکل وصورت	مشکِ ناب	:	خالص مُشک
دَرَّاک	:	تیز فہم	منعطف	:	مبذول
دُھندلی	:	مدھم، ماند	نام ونگ	:	عزت، آبرو
سَمادِھی	:	قبر	نشیب وفراز	:	بلندی وپستی
قرارداد	:	معاہدہ	نکات	:	نکتہ کی جمع، باریکیاں
کاسد	:	اَرزاں، سستا	نیچری	:	سرسید احمد کے عقائد کا پیروکار
کرنجی	:	نیلی	یرقان	:	وہ بیماری جس میں بدن پیلا پڑ جاتا ہے

03.09 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : خاکہ نگاری کی تعریف کیجیے؟

سوال نمبر۲ : منظر نگاری کی وضاحت کیجیے؟

سوال نمبر۳ : خاکہ نگاری کی اقسام بیان کیجیے؟

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : خاکہ نگاری کی کم سے کم پانچ اقسام بیان کیجیے؟

سوال نمبر۲ : خاکہ نگاری کے اجزاے ترکیبی کی وضاحت کیجیے؟

سوال نمبر۳ : خطوط کی روشنی میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کا جائزہ لیجیے؟

03.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اُردو ادب میں خاکہ نگاری	از	ڈاکٹر صابرہ سعید
۲۔ تذکرہ گلشنِ ہند	از	مرزا علی لطفؔ
۳۔ چھٹا دریا	از	فکرؔ تونسوی
۴۔ دید و دریافت	از	نثار احمد فاروقی
۵۔ ورودِ مسعود	از	پروفیسر مسعود حسین خاں
۶۔ یادگارِ غالبؔ	از	الطاف حسین حالیؔ
۷۔ یادوں کی برات	از	جوشؔ ملیح آبادی

03.11 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ خاکہ کا لغوی معنی ''تصویر کا ڈھانچا یا خدوخال وغیرہ کی نقل جو اصل کے مشابہ ہو'' ہے۔

﴿۲﴾ اختصار سے الفاظ کا ایسا اختصار مُراد ہے جس میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کیفیت ہو۔

﴿۳﴾ کسی واقعے کی جزئیات کی عکاسی کو ''منظر نگاری'' کہتے ہیں۔

﴿۴﴾ جس خاکے میں کسی شخصیت کا تعارف پیش کیا جاتا ہے، اُسے تعارفی خاکہ کہتے ہیں۔

﴿۵﴾ جس خاکے میں کسی شخصیت کی زندگی کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے، اُسے سوانحی خاکہ کہتے ہیں۔

﴿۶﴾ جس خاکے میں کسی فرد، ماحول، معاشرے یا نظام وغیرہ کو طنز کا نشانہ بنایا جاتا ہے، اُسے طنزیہ خاکہ کہتے ہیں۔

﴿۷﴾ ''کربل کتھا''، فضل علی خان فضلیؔ کی کتاب ہے۔

﴿۸﴾ ''تذکرہ گلشنِ ہند'' مرزا علی لطفؔ کی کتاب ہے۔

﴿۹﴾ ''اُردوے معلیٰ'' مرزا غالبؔ کے خطوط کا مجموعہ ہے۔

﴿۱۰﴾ ''یادگارِ غالبؔ'' الطاف حسین حالیؔ کی کتاب ہے۔

﴿۱۱﴾ ''ورودِ مسعود'' پروفیسر مسعود حسین خاں کی کتاب ہے۔

﴿۱۲﴾ ''پیاز کے چھلکے'' فکرؔ تونسوی کی کتاب ہے۔

اکائی 04 : عبدالحق : ''حالؔی''

ساخت

04.01 : اغراض ومقاصد

04.02 : تمہید

04.03 : خاکہ نگاری کا فن

04.04 : خاکہ نگاری کے اجزاے ترکیبی

04.05 : اردو میں خاکہ نگاری کی روایت

04.06 : مولوی عبدالحق کی ادبی خدمات اور ان کی خاکہ نگاری

04.07 : مولوی عبدالحق کا خاکے ''حالؔی'' کا متن (اقتباس)

04.08 : مولوی عبدالحق کا خاکے ''حالؔی'' کے اقتباس کا خلاصہ

04.09 : خلاصہ

04.10 : فرہنگ

04.11 : نمونہ امتحانی سوالات

04.12 : حوالہ جاتی کتب

04.13 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

04.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری کی اہم خصوصیات سے روشناس ہوں گے۔ چوں کہ خاکہ نگاری اردو کی ایک باضابطہ صنف ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ پہلے خاکہ نگاری کے فن اور اس کی روایات کے بارے میں بھی جان لیں۔ لہذا اس اکائی میں خاکہ نگاری کے فن کے ساتھ ساتھ اس کی روایات سے متعلق مختصراً معلومات فراہم کی گئی ہے۔ اس کے بعد مولانا حالؔی پر مولوی عبد الحق نے جو خاکہ تحریر کیا ہے اس سے متعلق خاص خاص باتیں کیا ہیں اور اسے کس درجہ مؤثر انداز میں مولوی صاحب نے قلم بند کیا ہے، کا علم بھی آپ اس اکائی میں حاصل کریں گے۔ آپ کے مطالعے کے لئے 'حالی' پر مولوی عبدالحق کے خاکہ کے اصل متن کا اقتباس بھی اس اکائی میں شامل کیا گیا ہے۔

04.02 تمہید

اردو کی نثری اصناف میں خاکہ نگاری بھی ایک اہم صنف ہے۔اردو میں اس صنف کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟ اس کے بارے میں کوئی حتمی (آخری) رائے قائم نہیں کی جاسکی ہے۔ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کے ابتدا سرسید اور ان کے رفقاء نے کی۔بعد میں یہ صنف اردو میں پروان چڑھی اور آج اس کی ایک اچھی خاصی روایات موجود ہے اور یہ صنف روز افزوں ترقی پر ہے۔

04.03 خاکہ نگاری کا فن

اردو لفظ ''خاکہ'' انگریزی لفظ **Sketch** کا مترادف ومتبادل ہے۔جس کا انگریزی مفہوم یہ ہے:

"A Rough Drawing and Painting"

اردو میں اس کا لغوی مفہوم ''ڈھانچہ یا تصویر کا مسودہ'' ہے۔اصطلاحی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ادب کی ایک صنف ہے جس میں کسی شَے یا شخص کی زندگی کے نشیب وفراز کو مؤثّر انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔وہ بھی ایسے شخص یا شخصیت کی زندگی کے سفید وسیاہ کو نمایاں کیا جاتا ہے جس سے خاکہ نگار کے گہرے مراسم رہے ہو یا شب وروز کا ساتھ رہا ہو۔

لفظ خاکہ کی جگہ اردو میں کچھ اور الفاظ بھی استعمال میں رہے ہیں۔جیسے (۱) مرقع (۲) قلمی تصویر (۳) شخصی مرقع یا شخصی تصویر وغیرہ، ان سب کا مفہوم عام طور سے ایک ہی ہے جیسا کہ لفظ سے ظاہر ہے کہ اس میں کسی شخص کی مکمل تصویر یا اس کی زندگی کا مکمل عکس پیش نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی شخصیت کے نمایاں اوصاف (محاسن ومعائب، خوبیاں خرابیاں) کو جس سے اس کی شخصیت اُبھرتی اور نمایاں ہوتی ہے، پیش کیا جاتا ہے۔یعنی خاکہ کسی کی شخصیت کا مکمل آئینہ نہیں ہوتا لہٰذا اس میں تفصیل کی بجائے اختصار سے کام لیا جاتا ہے بلکہ یہاں خاکہ نگار ان کوائف وحالات کو ہی نمایاں کرتا ہے جس سے شخصیت کی ایک چلتی پھرتی اور زندہ تصویر ہمارے سامنے آجائے۔

04.04 خاکہ نگاری کے اجزاے ترکیبی

کسی خاکے کے حسب ذیل اجزا ہوتے ہیں:

﴿۱﴾ اختصار ﴿۲﴾ وحدتِ تاثر ﴿۳﴾ کردار ﴿۴﴾ اُسلوب یا طرزِ نگارش

﴿۱﴾ اختصار

کسی بھی خاکہ کے لئے اختصار کا ہونا لازمی ہے۔اختصار سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کے بیان میں لفّاظی اور طول بیانی سے کام نہ لیا جائے بلکہ کسی شخص کے اوصاف محاسن ومعائب (خوبی وخامی) کو اس طرح بیان کیا جائے کہ اس میں اختصار بھی ہو، جامعیت بھی اور اثر بھی۔ یہ اختصار اس لئے بھی لازمی ہے کہ قاری کسی خاکہ کو ایک ہی نشست میں پڑھ سکے۔

﴿۲﴾ وحدتِ تاثر

خاکہ میں وحدتِ تاثر کا ہونا افسانہ کی طرح ہی انتہائی ضروری ہے اور یہ وصف اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب خاکے میں اختصار سے کام لیا جائے۔خاکہ نگار 'تاثر' پیدا کرنے کے لئے انتہائی مہارت سے خاکے کی ابتدا کرتا ہے اور واقعات کے سہارے وہ اسے وسط تک لے

جاتا ہے اور پھر اس کا خاتمہ مؤثّر انداز میں کرتا ہے۔ابتدا، وسط اور خاتمہ کو واقعات و تجربات و مشاہدات کی مدد سے مربوط انداز میں پیش کرتا ہے جس سے وحدت تاثر کا پیدا ہونا لازمی ہے۔

﴿۳﴾ کردار

کردار کسی بھی خاکہ کے لئے ایک بنیادی عنصر ہے جس کے گرد خاکے کی عمارت بڑے تزک و احتشام کے ساتھ تعمیر کی جاتی ہے۔اس کے بغیر خاکہ کا تصوّر محال ہے۔افسانوی ادب میں جس طرح کرداروں کی اہمیت ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح خاکے میں بھی ہوتی ہے۔ناول، افسانہ اور ڈرامے میں جس طرح مرکزی کردار ہوتے ہیں اسی طرح اس میں بھی ایک مرکزی کردار لازمی طور پر ہوتا ہے۔دیگر اصناف میں چند ضمنی کردار بھی شامل ہوتے ہیں لیکن یہاں ضمنی کرداروں کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی۔ایک آدھ کردار کی شمولیت محض اپنی بات کو پرزور بنانے کے لئے ہوتی ہے۔اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خاکے میں اکثر ایک کردار ہوتے ہیں اور اگر کوئی دوسرا اہم کردار ہوتا بھی ہے تو وہ راوی خود ہوتا ہے۔دوسری اصناف میں کرداروں کی جو اہمیت بتائی گئی ہے وہ اس میں بھی بڑی حد تک لازمی ہے۔یوں تو خاکہ میں کسی شخصیت کا محض سرسری اخلاق واطوار بیان کر دینا بھی کافی ہوتا ہے لیکن ایک اچھے خاکہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسے انسانی فطرت، انسانی نفسیات، جذبات واحساسات، عقائد ونظریات، پسند و ناپسندگی، عصبیت و کجروی غرض یہ کہ خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں، کوتاہیوں کے حوالے سے بھی دیکھا اور دکھایا جائے۔تب ہی کسی کردار یا شخصیت کا مطالعہ مکمل اور موثر سمجھا جائے گا۔یہاں خاکہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ بڑی حد تک معروضیت سے کام لے، کذب وافترا اور بہتان طرازی سے بچے اور حقیقی تجربات ومشاہدات اور واقعات کی روشنی ہی میں کردار کو نمایاں کرے کیوں کہ ایسا کرنے سے ہی کردار جان دار ہو کر اُبھرے گا۔

﴿۴﴾ اُسلوب یا طرزِ نگارش

کسی خاکہ نگار کا اُسلوب بھی کردار یا شخصیت کو سمجھنے اور اس کے نقش کو اُبھارنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔خاکہ نگار کا اسی لئے زبان وادب پر قدرت کا ہونا لازمی ہے۔اس کے علاوہ خاکہ نگار کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ روزمرہ ومحاورے کے تخلیقی استعمال سے بخوبی واقف ہو، موثر زبان اور لطیف جملے اور فقرے گڑھنے اور تراشنے میں اسے مہارت حاصل ہو۔شخصیت کی زندگی کے ''نشیب وفراز'' اور ''سفید و سیاہ'' کو نمایاں کرنے میں وہ ناصح اور پارٹی کا کردار ادا نہ کرے اور نہ ہی منفی تنقیدی رویّے سے کام لے بلکہ وہ یہاں ناصح اور ناقد کے بجائے مزاح نگار (پھکڑ پن نہیں) کا رول ادا کرے اور اپنی بذلہ سنجی کو کام میں لائے۔طنز کو تعریض نہ بننے دے اور نہ ہی طنز پھبتی بن کر اُبھرے بلکہ طنز بھی اس قدر شگفتہ اور شائستہ ہو کہ بے اختیار تبسم ہونٹوں پر کھل جائے۔خرابی بھی خوبی معلوم ہو۔خاکہ نگار کا بیان کسی واقعہ اور تجربہ کے حوالے سے ہم دَردانہ ہونا چاہیے جارحانہ تو بالکل نہیں۔کسی شخصیت کا خاکہ کھینچتے وقت اسے تضحیک اور تمسخر سے بھی بچانا چاہیے۔خاکہ نگار کا طرزِ تخاطب اور اندازِ بیاں اگر شگفتہ اور ہم دَردانہ ہوگا تو لازمی طور پر اس شخص کا نقش گہرا ہو کر اُبھرے گا اور اگر اس کے برعکس ہوگا تو نقش نہ تو نمایاں ہوگا اور نہ ہی اس میں جاذبیت ہوگی۔کسی بھی خاکے کی کامیابی وناکامی کا انحصار خاکہ نگار کے اُسلوب اور طرزِ نگارش پر ہی ہے۔اس لئے یہ کسی خاکہ کا سب سے اہم عنصر ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ 'خاکہ، انگریزی کے کس لفظ کا متبادل ہے؟

﴿۲﴾ اردو میں خاکہ کے لئے کون سے الفاظ استعمال ہوتے ہیں؟

﴿۳﴾ خاکہ کے اہم اجزا کیا ہیں؟

04.05 اردو میں خاکہ نگاری کی روایت

اردو میں خاکہ نگاری کی شروعات کب اور کیسے ہوئی اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا فی الحال ممکن نہیں۔ یوں تو خاکہ نثری صنف ہے۔اس لئے اس کے ابتدائی نقوش نثری اصناف میں تلاش کرنا سودمند ہے۔لیکن نثر سے قبل ہمارے یہاں شاعری کا چلن عام ہوا، جن میں قصیدہ، مرثیہ، مثنوی تین بڑی اہم اصناف ہیں اور تینوں اصناف میں شخصی خاکہ ملتے ہیں خصوصاً قصیدہ اور مرثیہ اس سلسلے کی اہم اصناف ہیں۔ نثر میں ان کے نقوش تذکروں میں موجود ہیں خواہ وہ ''نکات الشعرا'' (میر تقی میرؔ) ہو ''گلشن بے خار'' (نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ) ہو، طبقات شعرا ہند'' (مولوی کریم الدین) ہو یا ''آبِ حیات'' (محمد حسین آزادؔ) ہو لیکن ان تذکروں میں ''آبِ حیات'' کو چھوڑ کر بیش تر شخصی خاکے نامکمل اور غیر مؤثر ہیں۔ کیوں کہ ان کے پیشِ نظر نہ تو خاکوں کی روایت تھی اور نہ ہی ارادتاً وہ خاکے لکھے جا رہے تھے۔ بعد میں سرسید اور ان کے رفقا نے جو سوانح عمریاں لکھیں ان میں خاکے کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے چوں کہ یہ سوانح عمریاں کسی بھی شخصیت کا مکمل احاطہ کرتی ہیں۔لہٰذا ان میں اختصار کے مقابلے میں طوالت سے کام لیا گیا ہے۔اس کے علاوہ ہر ضروری اور غیر ضروری نقش یا بات کو نمایاں کیا گیا ہے جو خاکہ کے لئے ضروری نہیں ہے۔

جیسا کہ آپ کو بتایا کہ مذکورہ بالا اصحاب میں محمد حسین آزادؔ نے ''آبِ حیات'' میں جن شعرا کی یعنی انشاؔ، مصحفیؔ اور ذوقؔ و غالبؔ کی قلمی تصاویر پیش کی ہے وہ بہر حال اہم اور دل چسپ ہیں۔ان کے بعد خواجہ حسن نظامی نے اس میدان میں باضابطہ قدم آگے بڑھایا اور دلّی کی مشہور و معروف ہستیوں کی منھ بولتی اور چلتی پھرتی تصویریں ''قلمی چہرے'' کے عنوان سے پیش کیں۔خواجہ صاحب کے بعد مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکوں میں ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' اور ''دلّی کا یادگار مشاعرہ'' کے نام آتے ہیں۔اس میدان میں مولوی عبد الحق کا نام بھی انتہائی قابل ذکر ہے۔ان کے خاکوں کا مجموعہ ''چند ہم عصر'' کے نام سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا تھا۔اس ضمن میں رشید احمد صدیقی کے خاکوں کے مجموعے ''گنج ہائے گراں مایہ'' (۱۹۳۷ء) ''ہم نفسانِ رفتہ'' (۱۹۴۴ء) میں بھی بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ان کے علاوہ ذاکر صاحب پر الگ سے انہوں نے ایک پر اثر خاکہ ۱۹۶۲ء قلم بند کیا تھا۔''آشفتہ بیانی میری'' ''مضامین رشید'' اور ''خنداں'' میں بھی چند دل چسپ خاکے ملتے ہیں۔

ان مذکورہ ادیبوں کے علاوہ جن دوسرے ادیبوں نے خاکہ کی مدد سے اردو ادب کو متمول بنانے کی کوشش کی ان میں سید عابد حسین (کیا خوب آدمی تھا)، مولوی عبد الرزاق کان پوری (یادِ ایام)، فکر تونسوی (خدوخال) عصمت چغتائی (دوزخی)، سعادت حسن منٹو (گنجے فرشتے، شخصیتیں)، اشرف صبوحی (دلی کی چند عجیب ہستیاں) شوکت تھانوی (شیش محل، قاعدے بے قاعدے)، ڈاکٹر اعجاز حسین (ملک ادب کے شہزادے)، شاہد احمد دہلوی (گنجینۂ گوہر)، محمد طفیل مدیر نقوش (صاحب جناب، محترم، مکرم آپ)، رئیس احمد جعفری (مردم دیدہ)،

مجتبیٰ حسین (آدمی نامہ، سو ہے وہ بھی آدمی، چہرہ در چہرہ)، مظہر امام (اکثر یاد آتے ہیں)، انور ظہیر خاں (مت سہل ہمیں جانو)، کشمیری لال ذاکر (آشنا چہرے)، امداد اللہ ندوی (انجمن کے چند روشن چراغ)، ندا فاضلی (چہرے)، خالد محمود (شگفتگی دل کی) وغیرہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اردو میں خاکہ نگاری کی روایت کو مذکورہ بالا ادیبوں نے استحکام بخشا ہے اور اسے خاصے کی چیز اور قابل مطالعہ بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۴﴾ اردو کے چند اہم خاکہ نگار اور ان کے نمائندہ خاکوں کی نشان دہی کیجیے۔

﴿۵﴾ ''چند ہم عصر'' کس کے خاکوں کا مجموعہ ہے اور یہ کب شائع ہوا؟

﴿۶﴾ رشید احمد صدیقی کی چار کتابوں کے نام بتائیے۔

04.06 مولوی عبدالحق کی ادبی خدمات اور ان کی خاکہ نگاری

مولوی عبدالحق کا نام اردو زبان وادب کی تاریخ واشاعت میں نہایت نمایاں ہے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی اردو زبان وادب کو متمول بنانے، اسے ترقی دینے اور اسے تحفظ فراہم کرنے اور کرانے کے لئے وقف کر دی تھی۔ وہ جب تک زندہ رہے ان ہی خطوط پر کام کرتے رہے۔

مولوی صاحب کا سب سے نمایاں کام تاریخ ادب کے قدیم اثاثے کو محفوظ کرنے اور اسے مستند انداز اور جدید املاء کے مطابق پیش کرنا ہے۔ انہیں کوششوں سے ہمارا قدیم کلاسیکی ادب بڑی حد تک محفوظ ہو سکا یا اسے محفوظ کرنے کا رجحان بڑھا۔ اگر انہوں نے تحقیق وتدوین کے فرائض انجام نہ دیے ہوتے اور انہیں اشاعت کے مرحلے سے نہ گزارا ہوتا تو شاید ہمارا قدیم اثاثہ اس طرح زمانہ کی گردش سے محفوظ نہ رہ پاتا۔ ''سب رَس''، ''قطب مشتری'' اور ''رانی کیتکی کی کہانی'' وغیرہ کی تلاش وتحقیق انہیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ان کے علاوہ اُنہوں نے قدیم شعرا کی دواوین بھی شائع کیے۔ چند اہم شعرا کے کلام کا انتخاب شائع کر کے انہیں عام ہاتھوں تک پہنچایا اور قواعد اردو انگریزی لغت کی تیاری کی طرف بھی مولوی صاحب نے دھیان دیا اور کتابیں شائع کی۔ ان تمام تصنیفی وتالیفی کاموں کے علاوہ مولوی صاحب نے ادارہ سازی کا کام بھی کیا۔ انجمن ترقی اردو ہند و پاک انہیں کی ششوں کا نتیجہ ہے۔ مولوی صاحب نے صحافت کی دنیا میں بھی قدم رکھا اور نمایاں خدمات انجام دیں۔ تنقید کے میدان میں بھی آپ ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ آپ کے تنقیدی مضامین، تبصرے اور مقدمے اس کی بہترین مثال ہیں۔

مولوی عبدالحق نے جملہ ادبی وتحقیقی اور تنقیدی خدمات کے علاوہ خاکہ نگاری کے میدان میں بھی اپنا نقشِ دوام قائم کیا اور آج آپ ایک کامیاب خاکہ نگاری کے حیثیت سے بھی اردو ادب میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ نے ایک ایسے وقت میں جب کہ اردو میں خاکہ نگاری کا فن نہ تو ترقی یافتہ تھا اور نہ ہی اس کی رفتار تسلّی بخش تھی، اس صنف پر توجہ فرمائی اور اسے اپنی نگارش سے مقبول بنانے میں اہم رول ادا کیا

آپ کے خاکوں کا مشہور مجموعہ ''چند ہم عصر'' کے نام سے ۱۹۳۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس مجموعے میں ۲۴ شخصیات پر لکھے خاکے موجود ہیں۔ آپ نے یہ خاکے عام طور سے بڑی شخصیات کے انتقال فرمانے کے بعد لکھے۔

مولوی صاحب نے جن بڑی شخصیتوں کا خاکہ کھینچا ہے وہ عموماً اپنے میدان میں بڑی اہمیت کے حامل رہے ہیں اور مولوی صاحب کے مراسم ان میں سے اکثر سے عقیدت مندانہ اور گہرے رہے ہیں۔انہوں نے نہ تو ان خاکوں میں ممدوح کی بے جا تعریف وتوصیف بیان کی ہے اور نہ ہی لعن وطعن سے کام لیا ہے بلکہ بڑی حقیقت پسندانہ انداز میں شخصیت کے مرقع پیش کیے ہیں۔وہ کسی شخصیت کی خوبیاں یا خامیاں بیان کرتے وقت اعتدال سے کام لیتے ہیں، نہ تو وہ خوبیاں بیان کرتے وقت زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں اور نہ ہی برائیوں کا ذکر کرتے وقت بے جا طنز وتعریض کا انداز اختیار کرتے ہیں۔نہ ہی زبان چٹخارے دار بناتے ہیں اور نہ ہی دوستی اور مراسم کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور نہ ہی وہ کسی شخصیت کے مقام ومرتبہ سے مرعوب نظر آتے ہیں۔ان کے پیشِ نظر ہمیشہ شخصیت کی سچی اور مکمل انسانی تصویر ہوتی ہے اور جسے وہ انتہائی سادہ زبان اور غیر مقفٰی عبارت میں رقم کرتے ہیں۔ان کی نثر میں اس خوبی کی وجہ سے سلاست اور روانی پیدا ہوتی ہے۔ان کا بے ساختہ پن ان کی نثر کو مؤثر بناتا ہے۔ان کے خاکے اَدھورے اور نامکمل نہیں ہوتے، نہ ہی وہ کسی شخصیت کی آدھی تصویر اُبھارتے ہیں بلکہ ان کے قلم سے بنائی گئی لفظی اور قلمی تصویریں مکمل اور جاذب ہوتی ہے۔ان کے خاکوں کا اصلی وصف جامعیت ہی ہے۔

ان کے خاکوں کا مجموعہ ۱۹۳۷ء میں منظرِ عام پر آیا تھا یعنی یہ خاکے ۱۹۳۷ء کے آس پاس یا قبل تحریر کیے گئے تھے لیکن باوجود اس کے ان کی زبان شبلی کی طرح رنگین اور مولانا ابوالکلام کی طرح معرب اور مفرس نہیں بلکہ سادہ سلیس اور عام فہم ہے۔مولوی صاحب اپنے خاکوں میں اپنی علمیت کا مظاہرہ نہیں کرتے اور نہ ہی زبان دانی کا مظاہرہ ان کا مقصد رہا ہے۔بلکہ وہ تو شخصیتوں کی تصویر کو زندہ اور متحرک بنانے کے لئے حسبِ حال سادہ الفاظ وتراکیب کا استعمال کرتے ہیں اور دل چسپ اور مؤثر مرقع تراشتے ہیں۔روزمرّہ اور محاورے سے ٹھیک اسی طرح کام لیتے ہیں جس طرح میر امّن نے لیا تھا۔محاوروں کے استعمال میں نذیر احمد کے بجائے میر امّن کے مقلّد نظر آتے ہیں۔نامانوس اور مشکل الفاظ سے وہ پرہیز کرتے ہیں۔انہوں نے اپنے خاکوں میں شعری زبان اور شعری لوازمات (تشبیہ، استعارے) وغیرہ کا استعمال کم سے کم کیا ہے اور اگر کہیں کیا ہے تو اس سے ان کی نثر میں ایک طرح کی جاذبیت اور شگفتگی پیدا ہوگئی ہے۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولوی عبدالحق کے خاکے کامیاب، مؤثر اور بڑے دل چسپ ہیں۔ان کے تحریر کردہ خاکوں سے شخصیت کے پوشیدہ گوشے نہ صرف روشن ہوئے ہیں بلکہ انہیں سمجھنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ان کے خاکوں کی مدد سے شخصیتوں کے اخلاق و آداب، اطوار وکردار، نفسیات ورجحانات، عقائد ونظریات کو سمجھنے اور جاننے میں آسانی ہوتی ہے۔ان خاکوں کی مدد سے شخصیات کی داخلی و خارجی گرہیں کھلتی نظر آتی ہیں اور کوئی بھی شخصیت تمام وکمال انداز میں ہمارے سامنے ہوتی ہے۔یہی وہ خوبیاں ہیں جو مولوی عبدالحق کے خاکوں میں، بالخصوص ''حالی'' میں پائی جاتی ہے اور اس طرح یہ ان کا کامیاب خاکہ بن جاتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۷﴾ مولوی عبدالحق کی نثر کی خوبی کیا ہے؟

﴿۸﴾ کیا مولوی صاحب اپنے خاکوں میں مقفٰی، معرب یا مفرس زبان استعمال کرتے ہیں؟

﴿۹﴾ مولوی صاحب کے تحریر کردہ خاکوں کی خصوصیت کیا ہے؟

04.07 مولوی عبدالحق کا خاکے ''حالی'' کا متن (اقتباس)

غالباً ۱۸۹۲ء یا ۱۸۹۳ء کا ذکر ہے جب میں مدرسۃ العلوم مسلمانانِ علی گڑھ میں طالب علم تھا۔ مولانا حالی اس زمانہ میں یونین کے پاس کی بنگلیا میں مقیم تھے۔ میں اس سال تعطیلوں کے زمانہ میں وطن نہیں گیا اور بورڈنگ ہاؤس ہی میں رہا۔ اکثر مغرب کے بعد کچھ دیر کے لئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ مولوی صاحب اس زمانے میں ''حیاتِ جاوید'' کی تالیف میں مصروف تھے۔ ان ہی دنوں میں میرے ایک عزیز میرے یہاں مہمان تھے۔ میں جو ایک دن مولانا کے ہاں جانے لگا، تو وہ بھی میرے ساتھ ہو لیے۔ کچھ دیر مولانا سے بات چیت ہوتی رہی۔ لوٹتے وقت رستے میں مہمان عزیز فرمانے لگے'' ملنے سے، اور باتوں سے، تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ وہی مولوی حالی ہیں جنہوں نے ''مسدّس'' لکھا ہے''۔ یہ مولانا کی فطری سادگی تھی جو اس خیال کا باعث ہوئی۔

ایک دوسرا واقعہ جو میری آنکھوں کے سامنے پیش آیا اور جس کا ذکر میں نے کسی دوسرے موقعہ پر کیا ہے۔

.....ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب جو علی گڑھ کالج کے گریجویٹ اور حیدرآباد میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے، مولانا سے ملنے آئے۔ ٹم ٹم پر سوار تھے۔ زینے کے قریب اُترنا چاہتے تھے۔ سائیس کی جو شامت آئی تو اس نے گاڑی دو قدم آگے جا کر کھڑی کی۔ یہ حضرت اس ذرا سی چوک پر آپے سے باہر ہو گئے اور ساڑ ساڑ کئی ہنٹر غریب کے رسید کر دیے۔ مولانا یہ نظارہ اوپر برآمدے میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد وہ کھٹ کھٹ سیڑھیوں پر سے چڑھ کر اوپر آئے۔ مولانا سے ملے۔ مزاج پرسی کی اور کچھ دیر باتیں کر کے رخصت ہو گئے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مولانا کا چہرہ بالکل متغیر تھا۔ وہ برآمدے میں ٹہلتے جاتے تھے اور کہتے تھے۔ ''ہائے ظالم نے کیا کیا۔'' اس روز کھانا بھی اچھی طرح نہ کھا سکے۔ کھانے کے بعد قیلولہ کی عادت تھی، وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ فرماتے تھے'' یہ معلوم ہوتا ہے گویا وہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہیں۔'' اس کیفیت سے جو کرب اور درد مولانا کو تھا، وہ شاید اس بدنصیب سائیس کو نہ ہوا ہوگا۔

مولانا کی سیرت میں یہ دو ممتاز خصوصیتیں تھیں، ایک سادگی اور دوسری دردِ دل، اور یہی شان ان کے کلام میں ہے۔ ان کی سیرت اور ان کا کلام ایک ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ ایک دوسرے کا عکس ہیں۔

مجھے اپنے زمانے کے نام وَر اصحاب اور اپنی قوم کے بڑے شخصوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ لیکن مولانا حالی جیسے پاک سیرت اور خصائل کا بزرگ مجھے ابھی تک کوئی نہیں ملا۔ نواب عماد الملک فرمایا کرتے تھے کہ سرسید کی جماعت میں بحیثیت انسان کے مولانا حالی کا پایہ بہت بلند تھا۔ اس بات میں سرسید بھی انہیں نہیں پہنچتے تھے۔.....خاکساری اور فروتنی خلقی تھی.....ان کا رتبہ بڑا تھا۔ مگر انہوں نے کبھی اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھا۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت تو وہ کرتے ہی تھے۔ لیکن بعض اوقات وہ اپنے چھوٹوں کا بھی ادب کرتے تھے۔

اس سے بڑھ کر خاکساری کا کیا ثبوت ہوگا کہ انہوں نے اپنی کتابوں پر جو اصلی معنوں میں تصنیف ہوتی تھی۔ ہمیشہ ''مرتبہ'' لکھا۔ کبھی ''مؤلفہ'' یا ''مصنفہ'' کا لفظ نہ لکھا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مشہور سفیر مولوی انور احمد مرحوم کہتے تھے کہ ایک بار وہ پانی پت گئے۔ جاڑوں کا زمانہ تھا۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ اسٹیشن سے سیدھے مولانا کے مکان پر پہنچے۔ دالان کے پردے پڑے ہوئے تھے انہوں نے پردہ اُٹھایا اور جھانک کر دیکھا۔ مولوی صاحب فرش پر بیٹھے تھے اور سامنے آگ کی انگیٹھی رکھی تھی انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اُٹھ کر ملے اور اپنے پاس بیٹھا لیا۔

مزاج پرسی کے بعد کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔اس کے بعد کھانا منگوایا۔..... پانی پت کی ملائی بہت مشہور ہے ان کے لئے ملائی منگوائی۔ کھانا کھانے کے بعد کچھ وقت بات چیت میں گزرا پھر ان کے لئے پلنگ بچھوا کر بستر کرا دیا اور خود آرام کرنے کے لئے اندر چلے گئے۔.....مہمان کے آنے سے (اور اکثر ایسا ہوتا تھا) وہ بہت خوش ہوتے تھے اور سچے دل سے خاطر تواضع کرتے تھے اور اس کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

مولانا بہت ہی رقیق القلب تھے دوسرے کی تکلیف کو دیکھ کر بے چین ہو جاتے تھے اور جہاں تک اختیار میں ہوتا، اس کے رفع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔.....اس میں بڑے چھوٹے کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ بامروّت ایسے تھے کہ انکار نہیں کر سکتے تھے۔اس قلیل آمدنی پر بھی حاجت مندان کے یہاں سے محروم نہیں جاتے تھے۔

تعصب ان میں نام کو نہ تھا۔ ہر قوم وملت کے آدمی سے یکساں خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ جب کبھی ہندو مسلم نزاع کا کوئی واقعہ سنتے تھے تو انہیں رنج وافسوس ہوتا تھا۔تحریر وتقریر میں کیا رنج کی اور بے تکلفی کی گفتگو میں بھی ان کے زبان سے کوئی کلمہ ایسا سننے میں نہیں آیا، جو کسی فرقے کی دل آزاری کا باعث ہو۔

نام ونمود چھو کر نہیں گیا تھا ورنہ شہرت وہ بد بلا ہے کہ جہاں یہ آتی ہے کچھ نہ کچھ شیخی آ ہی جاتی ہے۔.....دوسروں کی تحقیر اور در پردہ اپنی بڑائی دکھانا ان میں بالکل نہ تھا۔ ہاں، شعر میں البتہ کہیں کہیں تعلّی آ گئی ہے مگر وہ بھی ایسے لطیف پیرائے میں کہ خاکساری کا پہلو وہاں بھی ہاتھ سے جانے نہیں پایا۔مثلاً

گرچہ حالی اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

ان کا ذوقِ شعری اعلیٰ درجے کا تھا۔جیسا کہ ''آبِ حیات''، ''یادگار غالب'' اور ''مقدمۂ شعر وشاعری'' سے ظاہر ہوتا ہے لیکن وہ خواہ مخواہ اس کی نمائش نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہاں، جب کوئی پوچھتا یا اتفاق سے بات آ پڑتی، تو وہ کھل کر اس کے نکات بیان کرتے تھے۔

ہمارے ہاں یہ دستور سا ہو گیا ہے کہ جب کبھی کوئی کسی شاعر سے ملتا ہے تو اس سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کرتا ہے.....اور بعض اوقات تو اس کی بھی ضرورت نہیں پڑتی بغیر فرمائش ہی اپنے کلام سے محظوظ فرمانے لگتے ہیں۔.....لوگ مولانا حالی سے بھی فرمائش کرتے تھے وہ کسی نہ کسی طرح ٹال جاتے تھے اور اکثر یہ عذر کر دیتے تھے کہ ''میرا حافظہ بہت کمزور ہے اپنا لکھا یاد نہیں رہتا۔'' یہ محض عذر لنگ ہی نہ تھا، اس میں کچھ حقیقت بھی تھی، لیکن اصل بات یہ تھی کہ یہ خود نمائی سے بہت بچتے تھے۔

آج کل تو ہمارے اکثر شاعر لے سے یا خاص طور پر گا کر پڑھتے ہیں، ان کا ذکر نہیں، لیکن جو تحت اللفظ پڑھتے ہیں، ان میں بعض طرح طرح سے چشم وابرو، ہاتھ، گردن اور جسم سے کام لیتے اور بعض اوقات ایسی صورتیں بناتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔ مولانا سیدھے سادے طور سے پڑھتے تھے۔ایک بار علی گڑھ میں محمڈن ایجوکیشن کانفرنس کا سالانہ جلسہ تھا۔مولانا کا مزاج کچھ علیل تھا۔انہوں نے اپنی نظم پڑھنے کے لئے مولوی وحید الدین سلیم صاحب کو دی جو بہت بلند آواز مقرر اور پڑھنے میں کمال رکھتے تھے۔سلیم صاحب ایک ہی بند پڑھنے پائے تھا کہ مولانا سے نہ رہا گیا۔نظم ان کے ہاتھ سے لے لی اور خود پڑھنی شروع کی۔ ذرا سی دیر میں ساری مجلس میں کہرام مچ گیا۔

سرسید تو خیر اس زمانہ میں موردِ لعن وطعن تھے ہی اور ہر کس وناکس کو ان پر منہ آتا تھا لیکن اس کے بعد جس پر سب سے زیادہ اعتراضات کی بوچھار پڑی وہ حالؔی تھے۔ ہر وہ شخص جس کا تعلق سید احمد خاں سے تھا، یوں ہی مردود سمجھا جاتا تھا، اس پر ان کی شاعری جو عام رنگ سے جدا تھی اور نشانۂ ملامت بن گئی تھی اور ''مقدمہ شعر وشاعری'' نے خاصی آگ لگادی۔ اہل لکھنؤ اس معاملے میں چھوئی موئی سے کم نہیں۔ وہ معمولی سی تنقید کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ انہیں یہ وہم ہوگیا تھا کہ یہ ساری کاروائی ان ہی کی مخالفت میں کی گئی ہے، پھر کیا تھا ہر طرف نکتہ چینی اور طعن وتعریض کی صدا آنے لگی۔ ''اودھ پنچ'' میں ایک طویل سلسلے مضامین ''مقدمہ'' کے خلاف مدت تک نکلتا رہا جو ادبی تنقید کا عجیب وغریب نمونہ تھا۔ وہ صرف بے تکی اور مہمل اعتراضات ہی کا مجموعہ نہ تھا بلکہ پھکڑ اور پھبتیوں تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ جن مضامین کے عنوان ؎

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

مولانا سب کچھ سہتے رہے، لیکن کبھی ایک لفظ زبان سے نہ نکالا ؎

کیا پوچھتے ہو؟ کیوں کر؟ سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انہوں نے، پر ہم نے دَم نہ مارا

لیکن آخر ایک وقت آیا کہ نکتہ چینوں کی زبانیں بند ہوگئیں اور وہ لوگ جو انہیں شاعر تک نہیں سمجھتے تھے، ان کی تقلید کرنے لگے ؎

غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

مولانا نے دنیوی جان ومال کی کبھی ہوس نہیں کی۔ جس حالت میں تھے۔ اس پر قانع تھے اور خوشی خوشی زندگی بسر کرتے اور اس میں اَوروں کی بھی مدد کرتے رہتے تھے۔ ان کی قناعت کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ انہیں عربی اسکول میں ساٹھ روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ جب حیدرآباد میں ان کے وظیفے کی کاروائی ہوئی تو انہوں نے ساٹھ سے زیادہ طلب نہ کیے۔

غالباً سوائے ایک آدھ کے انہوں نے کبھی اپنی کسی کتاب کی رجسٹری نہ کرائی جس نے چاہا، چھاپ لی۔ ان کی تصنیفات مالِ نعیمہ تھیں۔ مسدّس تو اتنا چھپا کہ شاید ہی کوئی کتاب چھپی ہو۔

مروت کے پتلے تھے.....اسی طرح طبیعت میں حیا بھی تھی۔

جب کسی ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان کو دیکھتے تو بہت خوش ہوتے تھے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ قدردانی کا یہ حال تھا کہ جہاں کوئی اچھی تحریر نظر سے گزرتی تو اس کو فوراً داد دیتے اور خط لکھ کر لکھنے والے کی ہمت بڑھاتے تھے۔.....اور جب کبھی کوئی ایسی بات دیکھتے جو قابل اعتراض ہوتی تو بڑی ہم دَردی اور شفقت سے سمجھاتے۔

بات میں بات نکل آتی ہے۔ جب ''حیات جاوید'' شائع ہوئی تو مولانا نے تین نسخے مجھے بھیجے۔ ایک میرے لئے ایک مولوی عزیز مرزا کے لئے اور تیسرا ایک محترم بزرگ اور ادیب کے لئے جو اس وقت اتفاق سے حیدرآباد میں وارد تھے۔ میں نے لے جا کر یہ کتاب ان کی خدمت میں پیش کی۔ شکریہ تو رہا ایک طرف، دیکھتے ہی فرمایا کہ ''یہ کذب وافترا کا آئینہ ہے۔''

اب اس کے مقابلے میں ایک واقعہ سنیے۔ قیام حیدرآباد میں ایک روز مولوی ظفر علی خاں، مولانا سے ملنے آئے۔ اس زمانے میں وہ ''دکن ریویو'' نکالتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے اس رسالے میں ایک دو مضمون، مولانا شبلی کی کسی کتاب یا رسالے پر شائع ہوئے تھے۔ ان میں کسی قدر بے جا شوخی سے کام لیا گیا تھا۔ مولانا اس کے متعلق ظفر علی خاں سے ایسے شفقت آمیز پیرائے میں نصیحت کرنی شروع کی کہ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور سر جھکائے، آنکھیں نیچی کیے چپ چاپ سنا کیے۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ ''میں تنقید سے منع نہیں کرتا، تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیوں کر ہوگی؟ لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اُڑانا، منصبِ تنقید کے خلاف ہے۔

مولانا حالی انگریزی مطلق نہیں جانتے تھے۔ ایک آدھ بار سیکھنے کا ارادہ کیا، نہ ہوسکا۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ مغربی تعلیم وتہذیب کے منشا کو جیسا وہ سمجھتے تھے، اس وقت بہت سے انگریزی تعلیم یافتہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا کلام اور ان کی تصانیف اس کی شاہد ہیں اور یہ سمجھتے تھے، وہ کر کے دکھایا۔ آج سیکڑوں تعلیم یافتہ موجود ہیں لیکن ان میں سے کتنے ہیں، جنہوں نے اس کا عشرِ عشیر بھی کیا ہو۔.....تاہم مولانا نے اپنی بساط کے موافق عملی میدان میں بھی اپنی دو یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ایک تو انہوں نے اپنے وطن پانی پت میں مدرسہ قائم کیا، جواب حالی مسلم ہائی اسکول کے نام سے موسوم ہے اور ایک پبلک اورینٹل لائبریری قائم کی، جو پانی پت سے سب سے بلند اور پرفضا مقام پر واقع ہے۔ اس میں کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے۔ جس سے پانی پت والے مستفید ہوتے ہیں۔

مولانا کمزوروں اور بے کسوں کے بڑے حامی تھے۔ خاص کر عورتوں کی جو ہمارے یہاں سب سے بے کس فرقہ ہے انہوں نے ہمیشہ حمایت کی ''مناجات بیوہ'' اور ''چپ کی داد'' یہ دو ایسی نظمیں ہیں جن کی نظیر ہماری زبان میں کیا، ہندوستان کے کسی زبان میں نہیں۔

جن لوگوں نے صرف ان کا کلام پڑھا ہے، شاید وہ سمجھتے ہوں گے کہ مولانا ہر وقت روتے اور بسورتے رہتے ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا دل درد سے لبریز تھا اور ذرا سی ٹھیس سے چھلک اُٹھتا تھا مگر وہ بڑے شگفتہ مزاج اور خوش طبع تھے، خصوصاً اپنے ہم صحبت یاروں میں بڑی ظرافت اور شوخی سے باتیں کرتے تھے۔ ان کے کلام میں بھی کہیں کہیں ظرافت اور زیادہ تر طنز کی جھلک نظر آتی ہے۔

جدید تعلیم کے بڑی حامی تھے اور اس کی اشاعت اور تلقین میں مقدور بھر کوشش کرتے رہے۔.....ان کی بڑی خواہش تھی کہ اردو زبان میں اعلیٰ درجہ کے ناول خصوصاً ڈرامے لکھے جائیں اور اس بات پر افسوس کرتے تھے کہ یورپین زبانوں سے بہترین ناولوں اور ڈراموں کا اردو میں ترجمہ نہیں کیا گیا کہ وہ نمونے کا کام دیں۔

آخر میں ان کی دو بڑی تمنائیں تھیں: ایک تو اردو زبان میں تذکیر وتانیث کے اصول منضبط کرنا اور ایک کوئی اور بات تھی، جو اس وقت میرے ذہن سے بالکل نکل گئی ہے۔

04.08 مولوی عبدالحق کا خاکے ''حالی'' کے اقتباس کا خلاصہ

مولوی عبدالحق نے حالی کا خاکہ پیش کرتے ہوئے ان کی زندگی کے چند اہم نمایاں ترین واقعات کا انتخاب اس طرح کیا ہے کہ حالی کی شخصیت اُبھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ان کے مزاج وطبیعت کی سادگی ان کی وسیع القلبی ووسیع النظری، انسان دوستی وانسانیت نوازی، تجر علمی اور ناقدانہ بصیرت کا نہ صرف پتہ چلتا ہے بلکہ اس کا صحیح اندازہ بھی ہوتا ہے۔

مولوی عبدالحق نے حالی سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے اس کی شروعات ۱۸۹۲ء یا ۱۸۹۳ء سے بتائی ہے جب وہ علی گڑھ میں مقیم تھے اور یہ سلسلہ ان کی موت تک قائم رہا۔

مولوی صاحب مولانا حالیؔ کی طبیعت کی سادگی کے قائل تھے باوجود اس کے کہ وہ ایک بڑے ادیب، شاعر اور نقّاد تھے لیکن ان کے اندر کسی طرح کی رعونت اور فخر کا شائبہ موجود نہیں تھا۔ وہ دوسروں کو دکھ درد میں مبتلا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس سلسلے میں مولوی صاحب نے ۱۹۰۵ء کا علی گڑھ کا ایک واقعہ قلم بند کیا ہے جس میں ایک رئیس نے تانگے والے پر بے جا ظلم رَوا رکھا۔ مولانا کا مزاج اس منظر کو دیکھ کر مکدر (میلا) ہو گیا اور وہ سارا دن اظہارِ افسوس کرتے رہے۔

مولوی عبدالحق نے اسی لئے مولانا کے شخصیت کے دو اہم عناصر یعنی دردمندی اور سادگی کی بڑی تعریف کی ہے۔ مولوی صاحب نے بحیثیت انسان انہیں اپنے رفقا اور مربیوں بالخصوص سرسید سے بہتر انسان قرار دیا ہے۔ ان کی فطرت میں خاکساری اور خوش خلقی کوٹ کوٹ کر بھری تھی، وہ اپنی بڑائی کا رعب نہیں ڈالتے تھے اور نہ ہی چھوٹوں کو حقیر جانتے تھے۔ بلکہ چھوٹوں پر وہ بے نیاز شفقت کرتے اور ان کی ہمت افزائی میں کوئی کسر نہ چھوڑتے تھے۔ اس سلسلے میں مولوی صاحب نے مولوی حمیدالدین سے ملاقات کا ایک اہم واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ اس خاکساری کی عمدہ مثال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی بیش تر تصنیفات کو تالیفات لکھا ہے۔

مولانا کی ایک اہم خوبی ان کی مہمان نوازی بھی تھی۔ وہ خاطر تواضع میں یقین رکھتے تھے اور مہمان کی آمد پر رنجیدہ نہیں ہوتے تھے۔

مولانا کی آمدنی اگر چہ قلیل تھی لیکن دوسروں کو وہ کبھی بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے حاجت مندوں کی حاجت روائی سے وہ خوش ہوتے تھے ان کے لئے سفارش کرتے۔ مولانا بے تعصب آدمی تھے۔ چھوٹے بڑے اور ہندو مسلم میں وہ فرق نہیں کرتے تھے بلکہ سب سے یکساں محبت سے پیش آتے تھے۔ ہندو مسلم نزاع کو انہوں نے کبھی بھی پسند نہیں کیا۔

مولانا خودستائی اور خودآرائی میں یقین نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کے انکسار کا عالم یہ تھا کہ وہ خود کو ہمیشہ چھپاتے تھے۔ بے تکلف دوستوں کی محفلوں میں حافظہ کی کمزوری کا بہانہ کرکے اپنے اشعار سنانے سے معذرت کر لیتے تھے۔ مولوی صاحب نے اس سلسلے میں دو واقعات موثر انداز میں بیان کیے ہیں۔

مولانا حالی کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اعتراضات پر چاہے وہ بے جا ہی کیوں نہ ہو، کبھی ناراض نہیں ہوتے تھے اور اکثر اسے ٹال جاتے تھے۔ ''مقدمہ شعروشاعری'' کی اشاعت کے بعد اہل لکھنؤ نے سخت اعتراضات کیے اور لعنت ملامت سے کام لیا اور یہاں تک لکھا کہ:

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

مولانا اس طرح کی واہیات وخرافات سے رنجیدہ تو ضرور ہوتے تھے لیکن خاموش رہتے اور تہذیب کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے بلکہ مولانا اس میں یقین رکھتے تھے کہ زمانہ ان کا ایک دن اعتراف ضرور کرے گا اور بقول حالی یہی ہوا بھی

ع غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

مولانا کے کردار کی ایک اہم صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ مولانا جاہ ومنصب کے بھوکے نہیں تھے اور نہ ہی دولت ان کی کمزوری تھی بلکہ صبر وشکر اور قناعت کے وہ قائل تھے اور کم پر بسر کرنے کا سلیقہ انہوں نے سیکھ لیا تھا۔ کتابوں کی رائلٹی جو اُن کا حق تھا لیکن اس کے بھی وہ کبھی خواہاں نہیں رہے۔ ان کی کتابوں کو چھاپ کر لوگوں نے لاکھوں کمایا لیکن انہوں نے اس کی کبھی شکایت نہیں کی بلکہ مولانا اس پر دھیان بھی نہیں دیتے تھے۔ ان کا مقصد زبان وادب کی خدمت اور اس کی ترویج واشاعت تھا اور تاحیات انہوں نے یہی کیا۔ مولانا حیا ومروّت کے پتلے تھے دل جوئی ان کا وطیرہ تھا، کسی کی دل آزاری کی تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ طلبا کی ہمت افزائی میں مولانا کوئی کسر نہ چھوڑتے تھے۔ کسی ہونہار نوجوان کو دیکھتے تو خوش ہوتے اور اس کی تحریر کی داد دیتے اور اگر کوئی قابلِ اصلاح بات ہوتی تو بڑی نرمی اور شفقت سے اسے سمجھاتے۔ ''حیاتِ جاوید'' کی اشاعت پر اسے کذب وافترا کا آئینہ کہا گیا لیکن مولانا کبیدہ خاطر نہیں ہوئے۔

مولانا انگریزی سے واقف نہ تھے باوجود اس کے عصری ضرورتوں اور تقاضوں کو سمجھتے تھے۔ قوم وملت کی ترقی میں یقین رکھتے تھے۔ اپنی کوششوں سے انہوں نے ایک اسکول اور ایک لائبریری قائم کی تھی۔

مولانا مزدوروں، بے کسوں اور عورتوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ مولانا کی سادگی کو لوگوں نے روکھے پن سے تعبیر کیا جب کہ مولانا بذلہ سنج بھی تھے اور شگفتہ مزاج بھی، بے تکلف دوستوں میں ان کی یہ خوبی ظاہر ہوتی تھی۔ وہ صرف روتے بسورتے نہیں تھے بلکہ وہ دردمند دل کے مالک تھے اور ان کی شاعری میں طنز وظرافت کے عناصر بہت موجود ہیں۔

مولانا جدید ذہن کے مالک ہی نہیں تھے بلکہ عوام الناس میں جدید تعلیم کو عام کرنا بھی چاہتے تھے۔ اردو ادب کے دامن میں جدید مغربی اصناف کی مدد سے وسعت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ خصوصاً وہ ناول اور ڈرامے کو اردو میں خاطر خواہ جگہ دینے کے قائل تھے تاکہ اردو کا دامن وسیع ہو۔ مولانا اردو میں تذکیر وتانیث کے بے اعتدالیوں اور جھگڑوں سے بھی پریشان رہتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ اس سلسلے سے اُصول وقواعد مرتب ہو جائیں تاکہ بے راہ رَوی دور ہو۔

اس طرح مولوی عبدالحق نے مولانا حالؔی کی زندگی، ان کے مزاج واطوار نظریات وخیالات، عقائد واخلاق، مروّت ودردمندی کو بہت مؤثر اور مدلل انداز میں اس خاکہ میں پیش کیا ہے۔ مولوی صاحب کا حالی پر یہ خاکہ مکمل بھی ہے اور موثر ودل چسپ بھی۔

﴿۔حالؔی پر مولوی عبدالحق کے خاکے کے اہم نکات۔﴾

﴿۱﴾ مولانا حالؔی سادگی پسند واقع ہوئے تھے۔

﴿۲﴾ انسان دوستی اور انسانیت نوازی ان کا شیوہ تھا۔

﴿۳﴾ مہمانوں کی خاطر داری سے آپ خوش ہوتے تھے۔

﴿۴﴾ بڑے شاعر، ادیب اور نقاد ہونے کے باوجود آپ کے اندر فخر کا شائبہ نہ تھا۔

﴿۵﴾ آپ کا مطالعہ انتہائی وسیع تھا۔

﴿۶﴾ ناقدانہ بصیرت میں آپ اپنے ہم عصروں سے برتر تھے۔

﴿۷﴾ ہم دَردی اور دل جوئی کا جذبہ آپ میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔

﴿۸﴾ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر آپ تڑپ اُٹھتے تھے۔

﴿۹﴾ چھوٹے بڑے اور ہندو مسلم میں آپ فرق نہیں کرتے تھے۔

﴿۱۰﴾ ہندو مسلم جھگڑے کو آپ نے کبھی پسند نہیں کیا۔

﴿۱۱﴾ چھوٹوں سے بے پناہ ہم دَردی اور شفقت سے پیش آتے تھے۔

﴿۱۲﴾ انہوں نے اپنے معترضین کا جواب کبھی نہیں دیا بلکہ اسے ٹال جاتے تھے۔

﴿۱۳﴾ مولانا جاہ و منصب کے بھوکے نہیں تھے۔

﴿۱۴﴾ کم آمدنی کے باوجود آپ دوسروں کی مدد کرتے تھے۔

﴿۱۵﴾ اردو زبان و ادب کو کبھی کمائی کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اس کی ترویج و اشاعت کے لئے خود کو وقف کر دیا تھا۔

﴿۱۶﴾ اردو زبان و ادب کو آپ مغربی زبان و ادب کے معیار کے مطابق لانا چاہتے تھے۔

﴿۱۷﴾ مزدوروں، کسانوں اور عورتوں سے ہمیشہ ہم دَردی سے پیش آتے تھے۔

﴿۱۸﴾ مولانا روکھے پھیکے نہیں تھے بلکہ بے تکلف دوستوں میں ان کی بذلہ سنجی دیکھنے کی چیز ہوتی تھی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۰﴾ مولوی عبدالحق کے مطابق حالؔی کی شخصیت کے دو اہم عناصر کیا تھے؟

﴿۱۱﴾ حالؔی کی تصنیف ''حیاتِ جاوید'' کو ان کے ایک مخالف نے کیا نام دیا تھا؟

﴿۱۲﴾ مولانا حالؔی کی انگریزی میں کیا لیاقت تھی؟

04.09 خلاصہ

اردو کی نثری اصناف میں خاکہ نگاری بھی ایک اہم صنف ہے۔ اردو لفظ ''خاکہ'' انگریزی لفظ **Sketch** کا مترادف و متبادل ہے۔ اس میں کسی شئے یا شخص کی زندگی کے نشیب و فراز کو موثر انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ لفظ خاکے کی جگہ اردو میں کچھ اور الفاظ بھی استعمال میں رہے ہیں جیسے (۱) مرقع (۲) قلمی تصویر (۳) شخصی مرقع یا شخصی تصویر وغیرہ۔ کسی خاکے کے اَجزائے ترکیبی (۱) اختصار (۲) وحدت تاثر (۳) کردار اور (۴) اُسلوب یا طرزِ نگارش ہوتے ہیں۔ اردو میں خاکہ نگاری کی شروعات کب اور کیسے ہوئی اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا فی الحال ممکن نہیں۔ نثری صنف ہونے کی وجہ سے اس کے ابتدائی نقوش نثری اصناف میں ہی تلاش کرنا سودمند ہے۔ محمد حسین آزادؔ نے ''آبِ حیات'' میں اِنشاؔ، مصحفیؔ اور ذوقؔ و غالبؔ کی جو قلمی تصاویر پیش کی ہیں وہ بہر حال اہم اور دل چسپ ہے۔ ان کے بعد خواجہ حسن نظامی نے اس میدان میں باضابطہ قدم آگے بڑھایا اور دلی کی مشہور و معروف ہستیوں کی منھ بولتی اور چلتی پھرتی تصویریں ''قلمی چہرے'' کے عنوان سے پیش کیں۔ ان کے بعد مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکوں ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' اور ''دلی کا یادگار مشاعرہ'' کے نام آتے ہیں۔ اس میدان میں مولوی عبدالحق کا نام بھی قابلِ ذکر ہے ان کے خاکوں کا مجموعہ ''چند ہم عصر'' کے نام سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا تھا۔ مولوی عبدالحق نے حالؔی کا خاکہ پیش کرتے ہوئے ان کی شخصی خوبیوں کو مختلف واقعات کے حوالے سے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

حالؔی کی شخصیت کے مثبت پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ مولانا سادگی پسند واقع ہوئے تھے۔خودستائی اور خود آرائی ان کا شیوہ نہیں تھا،نمود ونمائش کے وہ کبھی قائل نہیں رہے۔ہم دَردی کا جذبہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔لوگوں کی دل جوئی میں وہ یقین رکھتے تھے۔انہوں نے خود کو اردو زبان وادب کی ترقی ترویج واشاعت کے لئے وقف کر دیا تھا۔وہ ہر اعتبار سے اردو ادب کو ترقی یافتہ شکل میں دیکھنا چاہتے تھے۔اردو کو مغربی بالخصوص انگریزی زبان وادب کے برابر کرنا ان کا خواب تھا۔جدید سے جدید تر موضوعات اور اصناف سے اردو کے دامن کو وسیع کرنا چاہتے تھے۔اس طرح حالؔی پر مولوی صاحب کا مذکورہ خاکہ انتہائی جامع اور مؤثر ہے۔

04.10 فرہنگ

بلدہ	: شہر،نگر،بستی،قصبہ	فائز	: فتح پانے والا،مقام پانے والا
بورڈنگ ہاؤس	: اسکولوں اور کالجوں کے لڑکوں کے رہنے کا مکان	کذب وافترا	: جھوٹ وبہتان،جھوٹا الزام
		متغیر	: بدلا ہوا
تالیف	: دو چیزوں کو باہم ملانا یا جمع کرنا	مسدس	: چھ ضلعوں کی شکل،نظم جس کے ہر بند میں چھ مصرعے ہوں۔یہاں مولانا کی طویل نظم مدوجزر اسلام کی طرف اشارہ ہے
ترتیب	: سلسلہ بندی،درجہ بدرجہ،یک جا کرنا		
سائس	: گھوڑے کی دیکھ بھال کرنے والا،کوچوان		
غفران مآب	: بخشش والا (ایک خطاب)	مغرب	: پچھّم

04.11 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبرا : خاکہ کے اَجزاے ترکیبی پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۲ : مولوی عبدالحق کی زبان کی خوبیاں بیان کیجیے۔

سوال نمبر۳ : حالؔی کی شخصیت کے نمایاں اوصاف پر روشنی ڈالیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبرا : اردو میں خاکہ نگاری کی روایت پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔

سوال نمبر۲ : عبدالحق کا تعارف کراتے ہوئے ’حالؔی‘ کا خلاصہ اپنی زبان میں لکھیے۔

سوال نمبر۳ : حالؔی کے حوالے سے مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔

04.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ نگاری از شمیم حنفی

۲۔ اردو ادب کی مختصر تاریخ از انور سدید

۳۔ دیدہ ودریافت از نثار احمد فاروقی (مضمون’خاکہ نگاری‘)

04.13 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ Sketch

﴿۲﴾ مرقع، قلمی تصویر، شخصی مرقع وغیرہ

﴿۳﴾ اختصار، وحدت تاثر، کردار اور اسلوب یا طرز نگاری

﴿۴﴾ مولوی عبدالحق کا خاکہ ''حالی''، مرزا فرحت اللہ بیگ کا خاکہ ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی''، منٹو کا خاکہ ''گنجے فرشتے''، عصمت چغتائی کا خاکہ ''دوزخی''

﴿۵﴾ ''چند ہم عصر'' مولوی عبدالحق کے خاکوں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔

﴿۶﴾ گنج ہائے گرانمایہ، ہم نفسیات رفتہ، آشفتہ بیانی میری اور خنداں۔

﴿۷﴾ سلامت وروانی

﴿۸﴾ نہیں

﴿۹﴾ ان میں بے جا تعریف، لعن طعن یا مبالغہ نہیں ہوتا ہے بلکہ اعتدال سے کام لیا جاتا ہے۔

﴿۱۰﴾ دردمندی اور سادگی

﴿۱۱﴾ کذب وافترا کا آئینہ

﴿۱۲﴾ مولانا حالی انگریزی نہیں جانتے تھے۔

اکائی 05 : فرحت اللہ بیگ : نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی

ساخت

05.01 : اغراض ومقاصد

05.02 : تمہید

05.03 : فرحت اللہ بیگ کے حالاتِ زندگی

05.04 : فرحت اللہ بیگ کی خاکہ نگاری

05.05 : انتخاب نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی (اقتباس)

05.06 : انتخاب نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی (اقتباس) کا تجزیہ

05.07 : خلاصہ

05.08 : فرہنگ

05.09 : نمونہ امتحانی سوالات

05.10 : حوالہ جاتی کتب

05.01 اغراض ومقاصد

اُردو زبان وادب کی دنیا میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا شمار اہم قلم کاروں میں کیا جاتا ہے۔ اگر اُن کی تمام تحریروں کو یکجا کر لیا جائے تو اُن کے ادبی قد کا اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ اُن کی سب سے گراں مایہ تصنیف ''نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی'' ہے جس سے اُنہوں نے خاکہ نگاری کا آغاز کیا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے اس خاکہ کو نہ صرف اُردو ادب کا بہترین خاکہ تسلیم کیا جاتا ہے بلکہ خاکہ نگاری کی روایت میں اسے سنگِ میل کی بھی حیثیت حاصل ہے۔

اس اکائی کے اہم اغراض ومقاصد مرزا فرحت اللہ بیگ کی شہرہ آفاق تصنیف ''نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی'' کے خصوصی مطالعہ کے ذریعہ اُن کے اُسلوب، اُن کی شخصیت اور اُن کے ادبی اور علمی کارناموں سے آپ کی واقفیت میں اضافہ کرانا ہے۔ زیرِ نظر اکائی میں ''نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی'' سے ایک اقتباس بھی نقل کیا گیا ہے جو اُن کے حلیہ اور عادات واطوار سے متعلّق ہے۔ اقتباس کے مطالعہ اور تجزیہ کے ذریعہ نہ صرف مولوی نذیر احمد کی شخصیت وسیرت نمایاں ہوگی بلکہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے اُسلوبِ خاص کے ساتھ متذکرہ خاکہ کی ادبی وفنّی خوبیوں پر بھی روشنی پڑے گی۔

05.02 تمہید

آپ اور ہم اگر کسی شخص کی شخصیت اور اُس کے کارناموں سے متاثر ہوتے ہیں یا اُس کی شخصیت کے کسی دل چسپ پہلو کی طرف متو جہ ہوتے ہیں تو اُس کی ذاتی زندگی اور اُس کی حیات کے مختلف گوشوں کی تفصیلات بھی جاننا چاہتے ہیں۔ اسی خواہش اور تجسّس کے سبب خاکہ کا وجود ہوا۔ کسی شخص کا خاکہ تحریر کرنے کا مقصد اُس کی زندگی کی خاص اداؤں یا پہلوؤں کی تصویر کشی ہے۔ خاکہ کو اشاروں کا فن بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ کسی شخص کے مزاج، عادات واطوار، معاملات وکردار غرض زندگی کے ہر پہلو کی من وعن عکّاسی کی جاسکتی ہے۔

خاکہ اور کسی خاکہ نگار کی خاکہ نگاری کی خصوصیات کا مطالعہ کرنے سے پہلے آپ کو یہ بھی پتہ ہونا چاہیے کہ خاکہ نگار اُسی شخص کا خاکہ قلم بند کرتا ہے جس کے وہ بہت قریب رہتا ہے، اُس کی ایک ایک بات اور حرکت وعمل پر گہری نظر رکھتا ہے۔ وہ الفاظ وزبان کے ذریعہ اُس کے اصلی رنگ روپ اور اُسی کے ماحول میں پیش کر دیتا ہے۔ خاکہ نگار غیر جانب دار ہوتا ہے۔ وہ اپنی تحریر کے ذریعہ صرف حقیقت کی عکّاسی کرتا ہے یعنی خاکہ نگار کا اصل کام اپنے کردار کی خوبیوں اور خامیوں کو جیوں کا تیوں پیش کرنا ہے۔

جب ہم یا آپ مندرجہ بالا اُصول کی روشنی میں مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اُنہوں نے اپنے جذبات اور جوش کو قابو میں رکھ کر غیر جانب داری کے ساتھ اپنے تمام خاکے سپردِ قلم کیے ہیں۔ اُنہوں نے شخصیت سے متعلّق مواد کو بڑی فن کارانہ مہارت سے ترتیب دے کر اُس کے منفرد، خاص اور دل چسپ پہلوؤں کو اس طرح نمایاں کیا ہے کہ متعلّقہ شخص کی جیتی جاگتی تصویر نظر آنے لگتی ہے اور قاری خود کو اُسی ماحول ومناظر کا ایک حصّہ سمجھنے لگتا ہے۔

ہم اس اکائی کے ذریعہ آپ کو مرزا فرحت اللہ بیگ کے شہرہ آفاق خاکہ ''نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی'' کی خصوصیات سے واقف کرائیں گے لیکن پہلے مرزا فرحت اللہ بیگ کے حالاتِ زندگی، اُن کی تصانیف، اُن کے مضامین اور اُن کے ادبی مقام و مرتبہ کے بارے میں بات کریں گے تاکہ آپ مرزا فرحت اللہ بیگ کی شخصیت اور اُن کی خاکہ نگاری کی فنّی خوبیوں کے علاوہ اُن کے دیگر ادبی کارناموں سے بھی واقف ہوسکیں۔

05.03 فرحت اللہ بیگ کے حالاتِ زندگی

مرزا فرحت اللہ بیگ کی پیدائش دہلی کے محلّہ چوڑی والان میں واقع دل کشا منزل میں ہوئی تھی۔ بعض محقّقین کے مطابق وہ راجا سیتل داس کی حویلی میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کی پیدائش کے بارے میں تذکرہ نویس اور محقّقین متفق الرّائے نہیں ہیں۔ اُن کے عزیز واقارب کے مطابق اُن کی ولادت ۱۸۸۳ء میں ہوئی تھی۔ ملازمت کے ریکارڈ میں اُن کی تاریخ پیدائش ۱۹ر نومبر ۱۸۸۵ء درج ہے۔ سیّد وزارت حُسین نے اپنی کتاب ''مصنّفینِ اُردو'' میں اُن کی ولادت کا سال ۱۸۸۶ء تحریر کیا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی ایک نظم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے مورثِ اعلیٰ کا اصل وطن ختن اور آبائی پیشہ سپہ گری تھا۔ اُنہوں نے ایک عرصہ تک بدخشاں میں حکومت بھی کی تھی۔ جب حالات بدلے تو اُنہوں نے ہندوستان کا رُخ کیا اور بھرت پور آگئے۔ وہ بھرت پور میں ایک فریق کی طرف سے جنگ میں بھی شامل ہوئے تھے اور مہم سر کرنے میں اُس کا ساتھ دیا تھا۔ فتح حاصل کرنے کے کچھ دنوں کے بعد وہ عازم سفر ہوئے اور دہلی پہنچے۔ اُنہوں نے ہمیشہ کے لئے دہلی کو اپنا مستقر بنالیا۔ اس نظم کے مصرع ''جہاں رہ پڑے ہوگیا وہ وطن'' کی روشنی میں اُن کا وطن دہلی تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ پیش ہیں اس نظم کے دو بند۔

ختن سے چلے مثلِ ریگِ رواں لیے ہاتھ میں تیغ وتیر و کماں
جمائے بدخشاں پہ اپنے نشاں حکومت کی لی ہاتھ میں پھر کماں
جہاں رہ پڑے ہو گیا وہ وطن
لڑائی بھرت پور کی جب چھڑی مدد ایک کی جا کے ہم نے ہی کی
ہمیں سے یہ آخر مہم سر ہوئی وہاں سے نکل راہ دہلی کی لی
جہاں رہ پڑے ہو گیا وہ وطن

مرزا کے مورثِ اعلیٰ ترک نسل سے تھے۔اُن کے جداعلیٰ شاہ عالم ثانی (۱۷۰۶ء تا ۱۷۷۱ء) کے عہدِ حکومت میں بدخشاں سے بھرت پور ہوتے ہوئے دہلی آئے اور یہیں کے ہو رہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے والد کا نام مرزا حشمت اللہ بیگ اور والدہ کا نام مشرف جہاں بیگم ہے۔مرزا ابھی دس دن ہی کے تھے کہ اُن کی والدہ کی وفات ہوگئی تھی۔ والدہ کے انتقال کے بعد اُن کی پھوپھی حسن جہاں بیگم نے اُن کی پرورش کی جو انتہائی ضعیف تھیں۔اُن کی بزرگی اور عمر کا اندازہ اس طرح بھی کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے بھائی مرزا حشمت اللہ بیگ یعنی مرزا فرحت اللہ بیگ کے والد کی بھی پرورش کی تھی۔ پھوپھی نے مرزا کی پرورش کے ساتھ اُن کی تعلیم وتربیت کا بھی خاص خیال رکھا۔اُنہوں نے اپنی پھوپھی کی پرورش و پرداخت اور محبت وشفقت کا اعتراف مضامینِ فرحت حصّہ دوم میں اس طرح کیا ہے :

''بے چاری پھوپھی نے پالنے میں ماں سے زیادہ محبت دکھائی۔ یہاں تک کہ مجھے بارہ پندرہ برس کی عمر تک یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ یہ میری ماں نہیں پھوپھی ہیں۔''

جب مرزا چار سال کے ہو گئے تب اُن کی پھوپھی اُنہیں حصولِ تعلیم کی غرض سے بغدادی صاحب کے پاس لے گئیں جو اُس وقت حضرتِ نظام الدّین اولیا کی درگاہ میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔تھوڑی دیر میں بغدادی صاحب کو معلوم ہوا کہ ابھی تک مرزا کی بسم اللہ بھی نہیں ہوئی ہے تو اُنہوں نے اپنی جیبِ خاص سے گیارہ آنے کی شیرینی منگوائی، فاتحہ پڑھی اور مرزا کو بسم اللہ پڑھائی۔اس کے بعد مدرسہ کے بچّوں میں مٹھائی تقسیم کرادی۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کی ابتدائی تعلیم روایتی طریقہ پر ہوئی۔ وہ فوقانیہ جماعتوں میں ہمیشہ اوّل یا دوم مقام حاصل کرتے تھے۔ جب اُن کی عمر نو سال کی ہوئی تو اُن کا داخلہ درجہ سوئم میں دہلی کے ایک پرائمری اسکول میں کرادیا گیا جو محلّہ شاہ جی کے چھتہ میں واقع تھا۔اس کے بعد اُنہوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔اُنہوں نے ۱۹۰۱ء میں انٹرمیڈیٹ کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہندو کالج دہلی میں داخلہ لیا جو کناری بازار میں نیا نیا قائم ہوا تھا۔انٹرنس کے امتحان میں امتیازی نمبر حاصل کرنے پر اُنہیں نقرئی تمغہ اور سندِ توصیف سے نوازا گیا۔اس کے بعد اُنہوں نے سینٹ اسٹیفن کالج میں داخل لیا اور ۱۹۰۵ء میں بی.اے. کی سند حاصل کی۔ پھر اُنہوں نے ایم.اے. کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے اسی کالج میں داخل لیا مگر بعض وجوہات اور بالخصوص معاشی حالت اچھّی نہ ہونے کے سبب انہوں نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے سلسلہ کو منقطع کر دیا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ اوّل عمری ہی سے شوخ اور ظریف تھے۔ ظرافت اُن کی طبیعت میں رچی بسی ہوئی تھی۔ عمر کے بڑھنے کے ساتھ اُن کا ظریفانہ مزاج بھی بتدریج نکھرنے لگا۔ وہ دَورانِ تعلیم اپنے ہم جماعت اور کالج کے دیگر طلبا پر پھبتیاں کسنے لگے۔ وہ اپنی شوخی، شرارت اور چلبلے پن کے لئے نہ صرف کالج میں مشہور ہوگئے بلکہ ہر دل عزیز بھی ہوگئے۔ فرحت کی ظریفانہ باتیں مغموم اور نجور افراد کو اس قدر فرحت بخشتی تھیں کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنے غم کو بھلا کر نہ صرف فرحت وانبساط محسوس کرتے تھے بلکہ اُن کے گرویدہ بھی ہوجاتے تھے۔ اُنہیں نہ صرف ظریفانہ گفتگو میں مہارت حاصل تھی بلکہ تحریری مقابلوں میں بھی اُن کا اندازِ بیان ظریفانہ ہوتا تھا۔ وہ کالج میں تحریری وتقریری مقابلوں میں بھی حصّہ لیتے تھے۔ وہ کالج کے باہر بھی کھیل کے میدان میں سرگرمِ عمل رہتے تھے۔ اُن کی مقبولیت کا جو عالَم کالج کے اندر تھا وہی کالج کے باہر بھی تھا۔ وہ اپنے کالج کی ٹیم کے کپتان بھی تھے۔ اُن کے پسندیدہ مشغلے تیراکی، ڈرامہ نگاری، مضمون نویسی، مصوری اور شعر وشاعری تھے مگر عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد اُنہوں نے ان میں سے اپنے کئی مشغلوں کو ترک کر دیا البتّہ مضمون نویسی اور شعر وشاعری کا شوق آخری دم تک برقرار رہا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ۲۷/اپریل ۱۹۴۷ء حیدرآباد میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے اور ان کی تدفین قبرستان تھگی جیل مسجد حیدرآباد میں کی گئی۔

05.04 فرحت اللہ بیگ کی خاکہ نگاری

مرزا فرحت اللہ بیگ اُردو کے پہلے خاکہ نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اُن کے پہلے خاکہ کا نام ''نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی'' ہے۔ یہ خاکہ پہلی بار اُردو زبان کے مشہور رسالہ سہ ماہی اُردو، اورنگ آباد میں جولائی ۱۹۲۷ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اگرچہ اس خاکہ میں کچھ خامیاں بھی ہیں لیکن اُنہیں اس لئے نظر انداز کیا جاسکتا ہے کہ اس سے پہلے اُردو میں خاکہ نگاری کا کوئی مکمّل نمونہ موجود نہ تھا۔ پھر بھی اس میں تقریباً وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ایک عمدہ خاکہ میں ہونا چاہیے۔ اگرچہ یہ خاکہ بہ اعتبارِ ہیئت سوانحی مضمون یا مختصر سوانح عمری جیسا معلوم ہوتا ہے مگر اس میں نہ تو سوانح عمری جیسی طوالت ہے اور نہ واقعات وجزئیات جیسی ترتیب وتفصیل ہے بلکہ زندگی کی متحرّک تصویریں ضرور نظر آتی ہیں جس کے سبب اسے خاکہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ یہ خاکہ مولوی نذیر احمد کی زندگی اور شخصیت کا بہترین مرقع ہے۔

خاکہ نگاری کی پہلی شرط غیر جانب داری ہے۔ اس لئے مرزا فرحت اللہ بیگ کے لئے مولوی نذیر احمد کا خاکہ لکھنا آسان نہ تھا کیوں کہ مولوی نذیر احمد اُن کے اُستاد تھے۔ عقیدت واحترام کے جذبات کے باوجود اُنہوں نے غیر جانب دار ہوکر ایسا خاکہ قلم بند کیا جو اپنی نظیر آپ ہے۔ اُنہوں نے اپنے مخصوص لب ولہجے میں مولوی نذیر احمد کے حالاتِ زندگی، اخلاق وعادات، اندازِ گفتگو، وضع وقطع، حلیہ، لباس، پڑھنے پڑھانے کے انداز اور شب وروز کی مصروفیت ہی کی نہ صرف عکّاسی کی ہے بلکہ خلوص وہم دَردی کے ساتھ اُن کی خوبیوں اور خامیوں کو بھی آشکار کیا ہے مگر اپنے مزاحیہ اندازِ نگارش کے سبب خوبیوں کے بجائے خامیوں کو کچھ زیادہ ہی اُجاگر کیا ہے۔ اُن کے اندازِ نگارش نے مولوی نذیر احمد کی زندگی کے دھندلے نقوش کو اس طرح مجسّم کر دیا ہے کہ صورت وسیرت کے ساتھ اُن کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے نظروں کے سامنے متحرک ہوجاتی ہے۔

''ایک وصیت کی تعمیل''، مولوی وحیدالدّین سلیم کا خاکہ ہے جس کا شمار بھی اُردو کے بہترین خاکوں میں کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس خاکہ میں بھی وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہے جو ایک عمدہ خاکہ میں ہونی چاہیے مگر مرزا فرحت اللہ بیگ نے اُس انہماک سے اس خاکہ کو قلم بند نہیں

کیا ہے جس انہماک سے مولوی نذیر احمد کا خاکہ تخلیق کیا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ خاکہ اُنہوں نے خود مولوی وحیدالدّین سلیم کی فرمائش کی تعمیل میں لکھا تھا۔ لہٰذا اس میں اُس فطری ذوق وشوق کا فقدان ہے جو مولوی نذیر احمد کے خاکہ میں نظر آتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اُنہیں مولوی وحیدالدّین سلیم سے اتنی قربت حاصل نہ ہوسکی جتنی مولوی نذیر احمد سے رہی تھی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی ملاقات مولوی وحیدالدّین سلیم سے اُس وقت ہوئی تھی جب مولوی وحیدالدّین سلیم ضعیف ہو گئے تھے لہٰذا اُنہیں وہ مواقع میسّر نہیں ہو سکے جن کی مدد سے وہ اس خاکہ میں دل کش رنگ بھر سکتے۔ یہ خاکہ مولوی نذیر احمد کے خاکہ سے مختصر اور کم درجہ کا ضرور ہے تاہم خاکہ نگاری کے جملہ اوصاف سے بھرپور ہے۔ اُنہوں نے اپنے پہلے خاکے کے ذریعے جس طرح مولوی نذیر احمد کو اصلی خدوخال میں پیش کیا ہے اُسی طرح ''ایک وصیت کی تعمیل'' میں مولوی وحیدالدّین سلیم کو بھی اُن کے اصلی خدوخال میں نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

مرزا کا ایک اہم تخلیقی شاہ کار ''دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ'' ہے جسے ''لال قلعے کا آخری مشاعرہ'' بھی کہا جاتا تھا ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے اسے ''دہلی کی آخری شمع'' کے عنوان سے شائع کرایا تھا۔ اس خیالی مشاعرے میں عہدِ بہادر شاہ ظفر کی علمی، ادبی اور ثقافتی زندگی کی نہایت جان دار اور دل کش تصاویر نظر آتی ہیں۔ مومن خاں مومنؔ کی تصویر دیکھ کر مرزا فرحت اللہ بیگ کے دل میں خیال آیا کہ اُن کے عہد کے شاعروں کے خاکے قلم بند کیے جاسکتے ہیں۔ اس لئے اُنہوں نے مولانا محمّد حُسین آزاد کی کتاب ''نیرنگِ خیال'' اور مولوی کریم الدّین کے تذکرہ ''طبقات الشعرائے ہند'' کی مدد سے ایک طویل مضمون ''دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ'' قلم بند کیا۔ اس مضمون میں مولانا محمّد حُسین آزاد کی تصنیف ''آبِ حیات'' کا ہلکا سا پرتو نظر آتا ہے۔ اُنہوں نے اس خیالی مشاعرے کے ذریعہ مرزا غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، آشفتہؔ، آرزوؔ، صہبائیؔ، داغؔ اور دیگر شعرا کے بہترین مرقعے پیش کیے ہیں۔ مذکورہ کتاب کو پڑھتے وقت شاعروں کی جسمانی ہیئت، حلیے، وضع قطع، لباس، پھبتیاں، چھینٹا کشی، نوک جھونک، ہنسی مذاق اور شعر پیش کرنے کے انداز کی ہو بہو تصاویر نگاہوں میں پھرنے لگتی ہیں۔ اس کتاب میں شخصیت نگاری، سیرت نگاری اور خاکہ نگاری کا بہترین امتزاج ہے۔ اگرچہ اس کتاب میں تمام شاعروں کی صورت وسیرت کے بہترین مرقعے ہیں مگر جذباتی لگاؤ کے سبب مومن خاں مومنؔ کی شخصیت کو دوسرے شعرا کی بہ نسبت زیادہ بڑھا چڑھا کر اور دل کش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

مذکورہ خاکوں کے علاوہ لالا سری رام، خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امان مرحوم، حکیم آغا خاں عیش، نوّاب عبدالرحمٰن خاں احسانؔ، یادِ ایّام، عشرتِ فانی وغیرہ کا شمار اُن کے بہترین خاکوں میں کیا جاتا ہے۔ اُن کے خاکوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ علم قیافہ سے بھی واقف ہیں اور انسانی نفسیات کی تہ در تہ کی عکّاسی بڑی مہارت سے کرتے ہیں۔ دراصل اُن کے مزاح وظرافت کی بنیاد افراد، کردار، واقعات اور اُسلوبِ خاص پر مبنی ہے۔ وہ اپنے مشاہدہ کی مدد سے افراد یا اشخاص کو ڈرامائی انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔

05.05 انتخاب نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی (اقتباس)

رنگ سانولا مگر روکھا، قد خاصا اونچا تھا مگر چوڑان نے لمبان کو دَبا دیا تھا، دُہرا بدن گدرایا ہی نہیں بلکہ موٹاپے کی طرف کسی قدر مائل۔ فرماتے تھے کہ بچپن میں ورزش کا شوق تھا۔ ورزش چھوڑ دینے سے بدن جس طرح مرمروں کا تھیلا ہو جاتا ہے، بس یہی کیفیت تھی، بھاری بدن کی وجہ سے چوں کہ قد ٹھگنا معلوم ہونے لگا تھا اس لئے اس کا تکملہ اونچی تُرکی ٹوپی سے کر دیا جاتا تھا مگر کمر کا پھیر ضرورت سے زیادہ تھا۔ توند اس قدر بڑھ گئی تھی کہ گھر میں ازار بند باندھنا بے ضرورت ہی نہیں تکلیف دہ سمجھا جاتا تھا اور محض ایک گرہ کو کافی خیال کیا گیا تھا۔ گرمیوں میں

تہمد (تہ بند) باندھتے تھے، اس کے پلّو اُڑسنے کی بجائے اِدھر اُدھر ڈال لیتے تھے مگر اُٹھتے وقت بہت احتیاط کرتے تھے۔ اوّل تو قطب سے بیٹھے رہتے تھے اگر اُٹھنا ہوا تو پہلے اندازہ کرتے تھے کہ فی الحال اُٹھنے کو ملتوی کیا جاسکتا ہے یا نہیں، ضرورت نے بہت ہی مجبور کیا تو ازار بند کی گرہ یا تہمد کے کونوں کو اُڑسنے کا دباؤ توند پر ڈالتے تھے۔ سر بہت بڑا تھا مگر بڑی حد تک اس کی صفائی کا انتظام قدرت نے اپنے اختیار میں رکھا تھا جو تھوڑے رہے سہے بال تھے وہ اکثر نہایت احتیاط سے صاف کرا دیے جاتے تھے، ورنہ بالوں کی یہ کگر سفید مقیّش کی صورت میں ٹوپی کے کناروں پر جھالر کا نمونہ ہو جاتی تھی۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی ذرا اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ بھویں گھنی اور آنکھوں کے اوپر سایہ افگن تھیں۔ آنکھوں میں غضب کی چمک تھی، وہ چمک نہیں جو غُصّہ کے وقت نمودار ہوتی ہے، بلکہ وہ چمک تھی جس میں شوخی اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اگر مَیں ان کو ''مُسکراتی ہوئی آنکھیں'' کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ کلّہ، جبڑا، بڑا زبردست پایا تھا۔ چوں کہ دہانہ بھی بڑا تھا اور پیٹ کے محیط نے سانس کے لئے گنجائش بڑھا دی تھی، اس لئے نہایت اونچی آواز میں بغیر سانس کھینچے بہت کچھ کہہ جاتے تھے۔ آواز میں گرج تھی، مگر لوچ کے ساتھ، کوئی دُور سے سُنے تو یہ سمجھے کہ مولوی صاحب کسی کو ڈانٹ رہے ہیں لیکن پاس بیٹھنے والا ہنسی کے مارے لوٹ رہا ہو۔ جوش میں آکر جب آواز بلند کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ تُرم بج رہا ہے۔ اسی لئے بڑے بڑے جلسوں پر چھا جاتے تھے اور پاس اور دور بیٹھنے والے دونوں کو ایک ایک حرف صاف سُنائی دیتا تھا۔ ناک کسی قدر چھوٹی تھی اور نتھنے بھاری، ایسی ناک کو گنواروں کی اصطلاح میں ''گاجر'' اور دلّی والوں کی بول چال میں ''پھلکی'' کہا جاتا ہے۔ گو متانت چھو کر نہیں گئی تھی لیکن جسم کے بوجھ نے رفتار میں خود بخود متانت پیدا کر دی تھی۔ داڑھی بہت چھدری تھی، ایک ایک بال بآسانی گنا جاسکتا تھا، کلّے تو کبھی قینچی کے منّت کش نہ ہوئے البتہ ٹھوڑی پر کا حصّہ کبھی کبھی کر لیا جاتا تھا۔ داڑی کی وضع قدرت نے خود فرنچ فیشن بنا دی تھی۔ بالوں میں سے ٹھوڑی اس طرح دکھائی دیتی تھی جیسے ایکسریز (XRAYS) ڈالنے سے کسی بکس کے اندر کی چیز، ٹھوڑی چوڑی اور ان کے ارادے کے پکّے ہونے کا اظہار کرتی تھی۔ گردن چھوٹی مگر موٹی تھی، لیجیے یہ ہیں مولوی نذیر احمد خاں صاحب۔

اب رہی لباس کی بحث تو اُس کا بھی حال سُن لیجیے۔ جنھوں نے اسٹیج پر ان کو شالی رومال باندھے کشمیری جُبّہ یا ایل.ایل.ڈی کا گون پہنے دیکھا ہے انہوں نے عالی جناب شمس العلما مولوی حافظ ڈاکٹر نذیر احمد خاں صاحب ایل.ایل.ڈی مدظلہٗ العالی کو دیکھا ہے، مولوی نذیر احمد صاحب کو نہیں دیکھا۔ ان کے گھر اور باہر کے لباس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اگر ان کو روزانہ باہر نکلنے کا شوق نہ ہوتا تو لباس کی مد ہی ان کے اخراجات کی فہرست سے نکل جاتی۔ جب شام کو گھر سے نکلتے تو عموماً تُرکی یا چھوٹا سفید صافہ باندھ کر نکلتے تھے۔ گرمیوں میں نہایت صاف شفّاف سفید اچکن اور سفید کرتہ پاجامہ ہوتا اور جاڑوں میں کشمیرے کی اچکن یا کشمیری کام کا جُبّہ۔ چوں کہ سراج الدین صاحب سے لین دین تھا اس لئے لال نری کا سلیم شاہی جوتہ زیادہ استعمال کرتے تھے۔ پھر بھی وقت بے وقت کے لئے دو انگریزی جوڑے لگا رکھے تھے۔ جن پر میری یاد میں پالش ہونے کی کبھی نوبت نہ آئی، یہاں تک کہ دونوں سوکھ کر کھڑنگ ہو گئے تھے، انہی کا پاؤں تھا کہ ان چینیوں کے سے جوتوں کی برداشت کرتا تھا جرّابوں سے انہیں ہمیشہ نفرت تھی۔ گو دربار میں جانے کے لئے دو ایک جوڑیاں پاس رہتی تھیں۔ یہ تو پبلک کے مولوی صاحب ہوئے۔ اب ہمارے مولوی صاحب کو دیکھئے: آیئے میرے ساتھ چوڑی والوں سے چلیے، چوڑی والوں سے نکل کر چاوڑی میں آیئے، اُلٹے ہاتھ کو قاضی کے حوض پر سے ہوتے ہوئے سر کی والوں پر سے گزر کر لال کنوئیں پہنچے، آگے بڑھے تو بڑیوں کا کٹرہ ہے۔ وہاں سے آگے چل کر

نئے بانس میں آیئے، یہ سیدھا راستہ کھاری باؤلی کو نکل گیا ہے۔ نکّڑ سے ذرا ادھر ہی دائیں ہاتھ کو ایک گلی مڑی ہے، یہ بتاشے والوں کی گلی ہے۔ بتاشے بنتے ہوئے ہم نے سب سے پہلے یہیں دیکھے۔ یہاں آچار چٹنیوں والوں کی بیسیوں دوکانیں ہیں۔ انہیں دوکانوں کے بیچ میں سے ایک گلی سیدھے ہاتھ کو مُڑی ہے۔ تھوڑی ہی دوٗر جا کر بائیں طرف ایک پتلی گلی اس میں سے کٹ گئی ہے۔ اس گلی میں پہلا ہی مکان مولوی صاحب کا ہے۔ مکان دومنزلہ نیا بنا ہوا ہے۔ صفائی کی یہ حالت ہے کہ تنکہ پڑا ہوا نظر نہیں آتا۔ دروازے کے باہر دونوں پہلوؤں میں دو سنگین چوکیاں ہیں۔ دروازے کو عبور کرنے کے بعد صحن میں آتے ہیں، صحن کسی قدر چھوٹا ہے۔ سیدھی طرف دفتر ہے جہاں اکثر دو تین آدمی بیٹھے ہوئے کلام مجید پر جِتا کیا کرتے ہیں، اس کے مقابل بائیں طرف باورچی خانہ ہے، چولھے بنے ہوئے ہیں، آگ جل رہی ہے، مگر برتن اور ہنڈیاں وغیرہ جو باورچی خانہ کا جزو لاینفک ہیں۔ سِرے سے ندارد ہیں۔ آگ صرف حقّہ کے لئے سُلگائی جاتی ہے۔ کھانا دوسرے گھر سے پک کر آتا ہے۔ دروازہ کے بالکل سامنے اکہرا دالان ہے اور اندر ایک لمبا کمرہ، گرمی کا موسم ہے اور مولوی صاحب ایک چھوٹی سی میز کے سامنے بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں۔ کمرے کے دروازے بند ہیں ایک کھلا ہے، باہر ایک بُڑھیا پھونس چماری بیٹھی پنکھے کی رسّی کھینچ رہی ہے۔ ہاں تو مَیں کیا تصویر دکھانا چاہتا تھا؟ مولوی صاحب کا لباس: مگر خدا کے فضل سے ان کے جسم پر کوئی لباس ہی نہیں ہے، جس کا تذکرہ کیا جائے۔ نہ کُرتہ ہے، نہ ٹوپی، نہ پاجامہ، ایک چھوٹی سی تہمد برائے نام کمر سے بندھی ہوئی ہے، بندھی ہوئی نہیں ہے محض لپٹی ہوئی ہے لیکن گرہ کے جنجال سے بے نیاز ہے۔ کمرے میں نہایت اُجلی چاندنی کا فرش ہے۔ ایک طرف پلنگ بچھا ہوا ہے، کبھی اس پر چادر ہے کبھی نہیں ہے۔ سرہانے تکیہ رکھا ہے، مگر اس کی رنگت کا بیان احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ البتہ جس گاؤ تکیہ سے مولوی صاحب لگے بیٹھے ہیں وہ بہت صاف ہے۔ قالین بھی عمدہ اور قیمتی ہے، اگر مولوی صاحب کی حالت دیکھ کر آپ سوال کر بیٹھیں کہ ''مولانا ایں چہ کار است کہ کردہ۔'' تو اِنشاءاللہ یہی جواب ملے گا کہ ''محتسب را درون خانہ چہ کار'' جاڑوں میں مکان کے اوپر کے حصّے میں رہتے تھے۔ چلیے وہاں کا بھی رنگ دکھادوں: صدر دروازے سے ملا ہوا زینہ ہے اور سیڑھیوں کے ختم ہونے پر غسل خانہ اور بیت الخلاء ہے۔ اس کے بعد ایک دروازہ آتا ہے، دروازے سے گزر کر چھت پر آتے ہیں۔ سامنے ہی ایک کمرہ ہے اور اس کے دونوں جانب کوٹھریاں، غسل خانے کے بالکل مقابل دوسری طرف ایک چھوٹا سا کمرہ ہے، آخر میں مولوی صاحب یہیں رہا کرتے تھے۔ جس زمانے میں ہم پڑھتے تھے تو ان کی نشست سامنے والے بڑے کمرہ میں تھی، یہاں بھی چاندنی کا فرش ہے، اس پر قالین، پیچھے گاؤ تکیہ، سامنے ایک چھوٹی نیچی میز، پہلو میں حُقّہ، اس کی حقیقت کما حقہ بیان کرنا مشکل ہے۔ مولوی صاحب کو حُقّہ کا بہت شوق تھا، مگر تمبا کو ایسا کڑوا پیتے تھے کہ اس کے دُھوئیں کی کڑواہٹ بیٹھنے والوں کے حلق میں پھندا ڈال دیتی تھی۔ فرشی قیمتی تھی مگر چلم پیسے کی دووالی اور نیچہ تو خدا کی پناہ اس کے تیّار ہونے کی تاریخ لوگوں کے دلوں سے مدّت سے محو چکی تھی۔ ایک آدھ دفعہ ایک صاحب نے نیچہ بدلنے کا ارادہ بھی کیا مگر مولوی صاحب نے نیچہ کو جورو کا مترادف قرار دے کر ایسا سخت فقرہ کسا کہ بے چارے ٹھنڈے ہو کر رہ گئے۔ خیر جاڑے کا موسم ہے، مولوی صاحب بیٹھے حُقّہ پی رہے ہیں اور پڑھا رہے ہیں۔ سر پر کنٹوپ ہے مگر بڑا دقیانوسی، کبھی کانوں کو ڈھکے ہوئے اور ڈوریاں نیچے لٹکتی ہوئیں، کبھی اس کے دونوں پاکھے اوپر کی طرف سیدھے کھڑے ہو کر لاٹ پادری کی ٹوپی کا نمونہ بن جاتے اور ڈوریاں طُرّے کا کام دیتیں، کبھی پاکھوں کو سر پر اوپر تلے ڈوریوں سے کس دیا جاتا اور اس طرح کنٹوپ فلٹ کیپ کی شکل اختیار کر لیتا۔ جسم پر روئی کی مرزائی، مگر ایسی پُرانی کہ اس کی روئی کی گرمی مدت سے مائل بہ سردی ہو چکی ہے۔ اوپر صندلی رنگ کا دھسّہ پڑا ہوا۔ لیجیے دیکھا آپ نے

ہمارے مولوی صاحب کو۔ چار بجے اور مولوی صاحب نے آواز دی ''پانی تیار ہے۔'' جواب ملا ''جی ہاں'' مولوی صاحب غُسل خانے میں گئے، کپڑے بدل (یا یوں کہو کہ جون بدل) باہر نکل آئے اور چلے ٹاؤن ہال کو۔ اب یہ ہمارے مولوی صاحب نہیں رہے۔ آپ کے مولوی صاحب ہو گئے۔

گھر میں اس لباس سے استغناء کے کئی باعث تھے۔ اوّل تو یہ بات تھی کہ ان کو اپنے کاموں ہی سے فرصت نہیں تھی۔ پڑھنے پڑھانے اور لکھنے لکھانے میں ان کا دن گزر جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ بہت کم لوگوں سے مکان پر ملتے تھے۔ جن کو ملنا ہوتا تھا شام کو ٹاؤن ہال کی لائبریری میں ان سے جا کر مل آتا تھا۔ جو لوگ مکان پر آتے تھے وہ یا تو ان کے شاگرد ہوتے تھے یا خود صاحبِ کمال اور ظاہر ہے کہ ایسے صاحبِ کمال لوگ ظاہری حالت کو نہیں دیکھتے، یہ دیکھتے ہیں کہ مولوی صاحب ہیں کتنے پانی میں۔ لباس سے اس بے اعتنائی کی تیسری وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے گھر کو اپنا گھر سمجھتے تھے، کسی دوسرے کا دولت خانہ نہیں جانتے تھے۔ ان کو جس طرح آرام آتا اس طرح رہتے۔ جی چاہتا پہنتے نہ جی چاہتا نہ پہنتے۔ البتہ جب باہر جاتے ''تو کھائے من بھاتا پہنے جگ بھاتا'' پر عمل کرتے۔ اصل عالم تو گھر پر تھے باہر نکل کر ظاہری عالم بھی بن جاتے۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ گھر میں کوئی عورت نہ تھی جو ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتی یا کم سے کم ان کا کنٹوپ، مرزئی یا سرہانے کے تکیہ کا غلاف تو بدل دیا کرتی۔ گھر میں تھا کون، ایک مولوی صاحب اور دوسرا ایک کا نڑا ٹٹّو بدھو نفر۔ ان کا نوکر خدا بخش، وہ بھی ایسا بے پرواہ کہ خدا کی پناہ۔ ظالم نے بہرا بن کر کام سے اپنا پیچھا چھڑا لیا تھا۔ مولوی صاحب کی آواز جس سے مُردے قبر میں چونک پڑتے اس کو کبھی نہ سُنائی دی اور جب تک کسی نے جا کر اس کا شانہ نہ ہلایا، اس نے ہمیشہ سنی کو اَن سنی کر دیا۔ البتہ حُقّہ کے معاملہ میں بڑا تیز تھا یا تو اس کو یہ خیال تھا کہ حُقّہ بغیر مولوی صاحب کے ہاں گزارہ ہونا دُشوار ہے یا یہ وجہ تھی کہ تمبا کو زیادہ صرف کرنے سے اس کو دو ایک پیسے روز مل جاتے تھے۔ غرض کہ یہ حال تھا کہ حُقّہ پورا سُلگا بھی نہیں ہے اور وہ چلم اُٹھا کر لے چلا۔ مولوی صاحب ہاں ہاں کرتے ہی رہے اُس نے جا چلم اُلٹ دی۔ دوسرا سلفہ رکھا آگ بھر، چلم حُقّہ پر لا کر رکھ دی، تو اگر م حُقّہ بھڑک گیا، میاں نوکر کو پھر بُلا کر تو اٹھنڈا کرنے اور چلم بھروانے کی ضرورت پیش آئی۔ غرض سارے دن اُن کا یہی کام تھا اور وہ اس میں خوش اور بہت مگن تھے۔

جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ وقت کا اس قدر پابند تھا کہ لوگ اس کو دیکھ کر اپنی گھڑیاں ٹھیک کر لیتے تھے۔ بعض یورپ پرست اس کی پابندیِ اوقات کو یورپ والوں کا حصہ خیال کریں تو خیال کریں مَیں تو یہ کہتا ہوں کہ صرف دہلی میں مَیں نے تین ایسے شخص دیکھے جو آندھی آئے، مینہ آئے روزانہ چھ بجے ٹاؤن ہال کی لائبریری میں آتے تھے۔ اُدھر انہوں نے لائبریری کے دروازے میں قدم رکھا اور اِدھر گھنٹہ گھر نے چھ بجائے۔ لطف یہ ہے کہ ان میں سے ایک مشرق میں رہتا تھا تو دوسرا مغرب میں۔ یہ تین شخص کون تھے ایک منشی ذکاء اللہ صاحب، دوسرے رائے بہادر پیارے لال صاحب اور تیسرے مولوی صاحب۔ ایک چیلوں کے کوچہ سے آتا تھا، دوسرا دریبہ سے اور تیسرا کھاری باؤلی سے۔ ایسا کبھی نہیں ہُوا کہ ایک نے آکر دوسرے کا انتظار کیا ہو۔ اگر ان میں سے کوئی ایک نہ آتا تھا تو ایک ہی نتیجہ نکل سکتا تھا کہ آنے والا ایسا بیمار ہے کہ چلنا دُشوار ہے اور یہ نتیجہ کبھی غلط ثابت نہیں ہُوا۔ مَیں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سُنا ہے کہ اگر کسی شخص کو ان تینوں میں سے کسی سے مِلنا ہوتا اور چھ بجے سے ذرا پہلے لائبریری کے مُلازم سے جا کر دریافت کرتا تو یہی جواب مِلتا کہ ''اب آتے ہی ہوں گے چھ میں دو ہی منٹ تو رہ گئے ہیں۔'' دوسرے دو صاحبوں کا ٹائم ٹیبل تو مجھے معلوم نہیں، البتہ مولوی صاحب کی مصروفیتوں کا

حال لکھتا ہوں۔ان کے اس نظامِ اوقات میں گرمی اور جاڑے کے لحاظ سے کچھ کچھ تغیر ہو جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ بہت سویرے اُٹھنے کے عادی تھے۔ گرمیوں میں اُٹھتے ہی نہاتے تھے اور ضروریات سے فارغ ہو کر نماز پڑھتے۔ان کی صبح کی اور عصر کی نماز کبھی ناغہ نہ ہوتی تھی۔ باقی کا حال اللہ کو معلوم ہے، نہ مَیں نے دریافت کیا اور نہ مجھ سے کسی نے کہا۔صبح کی نماز پڑھ کر کچھ تلاوت کرتے۔ ادھر ذرا دن چڑھا، ادھر مولویوں کی جماعت اور خود مولوی صاحب کا ناشتہ داخل ہُوا۔اس جماعت میں بخارا، کابُل، سرحد وغیرہ کے لوگ تھے۔ان کی تعداد ۱۵/۱۶ تھی۔محنت ایسی کرتے تھے کہ دوسرا کرے تو مر جائے لیکن ٹھوٹھ ایسے تھے کہ مولوی صاحب بھی زچ ہو جاتے تھے۔خوش مذاقی تو انہیں چھو کر نہیں نکلی تھی۔خود مذاق کرنا تو کجا دوسرے کا مذاق بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔متانت اور ادب کا یہ حال تھا کہ آنکھ اُٹھا کر مولوی صاحب کو دیکھنا سوءِ ادبی سمجھتے تھے۔ اب ان کے ''وہ عمامے اونچے اونچے، یہ یہ لمبی لمبی ڈاڑھیاں'' دیکھو اور مولوی صاحب کی حالت کا اندازہ کرو، بچارے ناشتہ کرتے جاتے اور اپنا فرض اُتارتے جاتے۔عالم تھے دوسروں کو عالم بناتے تھے، لیکن کہا کرتے تھے کہ ''ان فتح پوری کے مُلّانوں کو پڑھا کر میرا دل بیٹھ جاتا ہے کیا کہوں مَیں ہوں ہنسوڑ اور تو ہے مقطّع ، میرا تیرا میل نہیں، کا نقشہ ہے۔'' یہ جماعت اُٹھی اور مولوی رحیم بخش صاحب آنازل ہوئے۔ کاغذوں کا مٹھّا بغل میں، ہاتھ میں پنسل، کان میں قلم، ادھر فتح پوری کی جماعت نے کمرہ سے قدم نکالا، ادھر انہوں نے کمرہ میں قدم رکھا۔ اب سلسلۂ تصنیف و تالیف شروع ہُوا۔ چوں کہ آخر میں مولوی صاحب کے ہاتھ میں رعشہ آ گیا تھا، اس لئے لکھوانے کا کام اکثر انہیں سے لیا جاتا تھا۔سب سے پہلے کلام مجید اور حمائل شریف کی کاپیوں کی صحت کی جاتی۔اس کے بعد مطبع کا حساب دیکھا جاتا اور پھر جدید تصنیفات کا سلسلہ شروع ہوتا۔ یہ کام سمٹتے سمٹتے ساڑھے گیارہ پونے بارہ بج جاتے۔رحیم بخش صاحب کے اُٹھتے ہی کھانا آتا، کھانا کھایا اور پلنگ پر لیٹ گئے۔ادھر ڈیڑھ بجا اور ادھر ہم دونوں داخل ہوئے، ہمارا قدم رکھنا تھا کہ مولوی صاحب اُٹھ بیٹھے۔ساڑھے تین بجے تک ہم سے سر مغزنی کرتے رہے اور کوئی دل چسپ بحث یا قصّہ چھڑ گیا تو چار بج گئے۔چار بجے اور مولوی صاحب غسل خانہ میں گئے، نہائے دُھوئے کپڑے پہن کر نکل کھڑے ہوئے۔شمس العارفین کی دوکان پر ٹھیرے۔ یہاں بھی ان کا حساب کتاب تھا وہاں کا کھاتہ دیکھا جو کچھ لینا دینا تھا لیا دیا اور سیدھے ٹاؤن ہال کی لائبریری میں پہنچ گئے۔سات بجے تک وہاں ٹھیرے، جس کو ملنا ہوا وہ وہاں مِل لیا۔سات بجے تک وہاں سے اُٹھ کر سراج الدین صاحب کی دوکان پر آئے یہاں بھی حساب کتاب کیا۔عبدالرحمٰن کو پڑھایا گھنٹہ بھر یہاں ٹھہر کر مکان پہنچ گئے۔کھانا کھایا کچھ لکھا پڑھا اور دس بجے سو رہے۔ جاڑے میں پروگرام میں یہ تبدیلی ہو جاتی تھی کہ پہلے صبح ہی صبح ہم پہنچتے تھے، اس کے بعد مولویوں کی جماعت آتی تھی، رحیم بخش صاحب کا نمبر سہ پہر میں آتا تھا۔

خوش خوراک تھے اور مزہ لے لے کر کھاتے تھے، ناشتے میں دو نیم برشت انڈے ضرور ہوتے تھے۔ میوہ کا بڑا شوق تھا۔ ناشتہ اور کھانے کے ساتھ میوہ کا ہونا لازم تھا۔ پڑھاتے جاتے اور کھاتے جاتے تھے مگر مجھ کو ایک حسرت رہ گئی کہ کبھی شریکِ طعام نہ ہو سکا۔ خیر ان پٹھانوں کی جماعت کی تو کیا صلا کرتے ان کے لئے تو مولوی صاحب کا ناشتہ اونٹ کے مُنہ میں زیرہ ہو جاتا۔ البتہ ہم دونوں کی صلا نہ کرنا غضب تھا۔ کہتے بھی جاتے تھے ''بھئی کیا مزے کا خربوزہ ہے۔'' ''میاں کیا مزہ کا آم ہے۔'' مگر بندۂ خدا نے کبھی یہ نہ کہا کہ بیٹا ذرا چکھ کر تو دیکھو کیسا ہے۔مَیں نے تہیّہ کر لیا تھا (میاں دانی اب انکار کریں تو کریں، لیکن ان کا بھی یہی ارادہ تھا) مولوی صاحب اگر جھوٹے مُنہ بھی شریک ہونے کو کہیں تو ہم سچ مچ شریک ہو جائیں۔

05.06 انتخاب نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی (اقتباس) کا تجزیہ

مرزا فرحت اللہ بیگ اپنے اُستاد مولوی نذیر احمد کی شخصیت کو مرقع کی شکل میں پیش کرنا چاہتے تھے مگر غیر جانب دار ہو کر اُستاد کی خوبیوں اور خامیوں کو قلم بند کرنا کسی شاگرد کے لئے جتنا آسان نظر آتا ہے اُتنا ہی مشکل ہے۔ ایک شاگرد کے لئے اپنے اُستاد کی خوبیوں کو اُجاگر کرنا نہ صرف سعادت مندی ہے بلکہ فخر کی بات بھی ہے مگر خامیوں کی نشان دہی کرنا کسی بھی طرح مناسب نہیں۔ اسی پس وپیش اور مولوی مرحوم کے احباب واقارب کی طرف سے کیے جانے والے اعتراضات کے سبب وہ چاہتے ہوئے بھی ایک مدّت تک خاکہ قلم بند نہیں کر سکے۔ ایک بار تو انہوں نے بہت کچھ لکھ بھی لیا تھا مگر پھر کچھ سوچ کر اُسے پھاڑ ڈالا۔ ایک عرصہ کے بعد مولوی عبدالحق کی ہمّت افزائی پر مولوی نذیر احمد کا خاکہ قلم بند کرنے کے لئے آمادہ ہوئے اور پھر انہوں نے ''نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی'' کا نام دے کر اُسے نہایت انہماک سے مکمّل کیا۔ اس خاکہ کو اُردو ادب کا پہلا خاکہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے اس خاکہ کے ذریعے اپنے اُستاد مولوی نذیر احمد کو ایک انسان کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اسے پڑھ کر مولوی نذیر احمد کی شخصیت وعظمت بھی جلوہ گر ہوتی ہے اور اُن کی خوبیوں اور خامیوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مرزا کے مزاحیہ اُسلوب اور منفرد اندازِ بیان کے سبب مولوی نذیر احمد کی خوبیاں کسی حد تک کم اور خامیاں کچھ زیادہ ہی نمایاں ہوئی ہیں جس کا اعتراف اُنہوں نے اسی خاکہ کے آغاز سے پہلے اس طرح کیا ہے :

> ''مَیں اپنے طرزِ بیان کے متعلّق معافی مانگ لیتا ہوں۔ میری شوخی بعض جگہ حد تجاوز سے بڑھ گئی ہے لیکن اپنے قارئین کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر مولوی صاحب خود اپنی سوانح عمری لکھتے تو اسی رنگ میں لکھتے۔''

مرزا کی اس تحریر کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ مولوی صاحب سے نہ اُن کی زندگی میں مرعوب تھے اور نہ اُن کے انتقال کے بعد عقیدت واحترام کے سبب جذباتی ہوئے۔ اس خاکے میں مولوی نذیر احمد کی زندگی کے حالات نہایت ایجاز واختصار کے ساتھ منتشر اور بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مرزا نے واقعات وحالات کی مدد سے بے تکلفی اور شوخی کے ساتھ مولوی صاحب کی زندگی کی روداد، حلیہ، اخلاق وعادات، اندازِ گفتگو، وضع داری، پڑھنے پڑھانے کے انداز وغیرہ کی دل چسپ عکّاسی کی ہے۔ وہ مولوی صاحب کے مکان کے نقشہ اور موجود اشیاء کے ساتھ روزِ اوّل کی ملاقات کے ذکر سے آئندہ دنوں کے واقعات کی داستان سناتے چلے جاتے ہیں مگر واقعات کی زمانی ترتیب کو وہ برقرار نہیں رکھ سکے۔ اُنہیں جس وقت جو بات یاد آجاتی ہے اُسے وہیں تحریر کر دیتے ہیں۔

مرزا نے اس مضمون میں جزئیات کی طرف خاصی توجّہ دی ہے۔ اُنہوں نے مولوی نذیر احمد کی شکل وشباہت، گھر کے اندر اور گھر کے باہر اُن کی ہیئت کذائی، صبح سے شام تک کی تمام مصروفیات کے بیان کے ساتھ مولوی صاحب کے مزاج واطوار کی بھی نقاب کُشائی کی ہے۔ اُنہوں نے اُن کے کھانا کھانے کے طریقہ، کھانے کے لئے کسی کو جھوٹوں نہ پوچھنے کی عادت، سود یا نفع کے عوض قرض دینے، اپنے شاگردوں سے بھی سود لینے، ٹکے ٹکے کا حساب کرنے، بخیل ہونے، کند ذہن مُلّاؤں کو پڑھانے مغز ماری کرنے، تصنیفی سرگرمیوں وغیرہ کے تذکرے نہایت دل چسپ اور مزاحیہ اُسلوب میں پیش کیے ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے مزاح اور نکتہ آفرینی نے اس خاکہ میں سدا بہار تازگی بھر دی ہے۔ یہ مرقع جس منفرد اُسلوب اور دل کش طریقہ سے پیش کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اُردو ادب کا بہترین اور کامیاب مرقع یا خاکہ قرار دیا جاتا ہے۔

05.07 خلاصہ

مرزا فرحت اللہ بیگ کی پیدائش دہلی کے محلّہ چوڑی والان میں ہوئی تھی۔ اُن کے والد کا نام مرزا حشمت اللہ بیگ اور والدہ کا نام مشرف جہاں بیگم ہے۔ مرزا کی والدہ کی وفات کے بعد اُن کی پھوپھی حسن جہاں بیگم نے اُن کی پرورش کی تھی۔ اُن کی ابتدائی تعلیم روایتی طریقے سے ہوئی۔ اس کے بعد اُنہوں نے دہلی کے مختلف اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کی۔ وہ بچپن ہی سے ظریف طبع تھے۔ خوش مذاقی اور چست پھبتیوں کے سبب وہ کالج میں ہر دل عزیز ہو گئے تھے۔ وہ زود نویس بھی تھے۔ اگر چہ اُنہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز مزاحیہ مضامین سے کیا تھا مگر رفتہ رفتہ اُن کے لکھنے کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ اُنہوں نے خاکے، افسانے، ڈرامے اور مضامین بھی لکھے ہیں اور شعر و شاعری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اُن کے مضامین کے سات مجموعے ''مضامینِ فرحت'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کے پہلے خاکہ کا نام ''نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی'' ہے۔ اس خاکہ میں جزئیات نگاری کی طرف خاص توجّہ دی گئی ہے۔ مولوی نذیر احمد کی شکل وشباہت، اُن کے گھر کا نقشہ، صبح سے شام تک کی مصروفیات، گھر کے اندر اور گھر کے باہر کی ہیئت، پڑھنے پڑھانے کے انداز اور عادات و اطوار کی جیتی جاگتی تصویریں قاری کی نظروں کے سامنے پھرنے لگتی ہیں۔

ایک وصیت کی تعمیل، دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ، خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امان مرحوم، حکیم آغا جان عیشؔ، لالہ سری رام اور نوّاب عبدالرحمٰن خاں احسانؔ کا شمار اُردو کے بہترین خاکوں میں کیا جاتا ہے۔ اُن کے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کی ایک لمبی فہرست ہے جن میں سے پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکّر، یار باش، صاحب بہادر، غلام، مُردہ بدست زندہ، اونہہ، کل کا گھوڑا، میری بیوی، کمسنی کی شادی، فرماں بردار بیٹا وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ اُنہوں نے کُلّیاتِ نظیرؔ اکبر آبادی، اِنشاؔ، دیوانِ یقین، دیوان تاباں وغیرہ کے مقدمے لکھ کر تنقید و تحقیق میں بھی قابلِ قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے بیشتر مضامین مقصدیت، افادیت اور شگفتہ مذاق کے حامل ہیں۔ اُن کے لب و لہجے میں کہیں بناوٹ، تیزی، تلخی اور طرّاری نظر نہیں آتی بلکہ لطیف اور شیریں اندازِ بیان کے سبب ناصحانہ تلخی بھی نگوارِ خاطر نہیں ہوتی۔

05.08 فرہنگ

اُجلی : سفید، صاف، شفّاف

اچکن : ایک قسم کی قبا جس میں گریبان نہیں ہوتا ہے اور آستینیں آگے سے لٹکتی رہتی ہیں

اُڑسنا : کھونسنا، اٹکانا۔ کسی چیز کو کسی چیز میں اُڑس دینا

اصطلاح : مُرادی معنی، کسی لفظ کا عام یا لغوی معنی کے علاوہ کوئی خاص مفہوم مقرّر کر لینا

اؤنٹ کے مُنھ میں زیرہ : کسی چیز کا ضرورت سے بہت کم ہونا، زیادہ کھانے والے کو تھوڑی سی چیز کھانے کے لئے دینا

سانولا : سانولے رنگ کا، سیاہی مائل، ملیح، سبزہ رنگ آدمی

سایہ افگن : سایہ کرنے والا، سایہ ڈالنے والا، حفاظت یا مدد کرنے والا

سرمغزی کرنا : مغز زنی کرنا، مغز ماری کرنا، سمجھا سمجھا کر : پڑھانا یا بتانا

سُلفہ : تمباکو کی وہ مقدار جو ایک بار چلم میں بھرنے کے لیے کافی ہو

سلیم شاہی جوتہ : ایک قسم کا عمدہ اور نازک جوتا

اونچی آواز : بلند آواز۔ تیز آواز

ایل.ایل.ڈی : (LLD) ڈاکٹر آف لا (Doctor of law) کا مخفّف، قانون کی سب سے اعلیٰ ڈگری

باورچی خانہ : رسوئی، رسوئی گھر، کھانا پکانے کی جگہ

بیت الخلا : پاخانہ، بول و براز یعنی پیشاب و پاخانہ سے فراغت پانے کی جگہ

بے نیاز : بے غرض، لاتعلّق، بے واسطہ، واسطہ نہ ہونا

پادری : عیسائی مذہب کا عالم یا پیشوا

پاکھے : (پاکھا کی جمع) پلّے، پہلو

پیچھا چھُڑانا : چھُٹکارا پانا، نجات حاصل کرنا، مخلصی پانا، جان بچانا

پھندا ڈال دینا : کھانسی میں مبتلا کر دینا، پھانس پیدا کر دینا

پھونس : نہایت ضعیف، بہت بوڑھی

تُرکی ٹوپی : ایک قِسم کی ٹوپی جو گول اور کچھ لمبی ہوتی ہے جس کی اوپری سطح کے بیچ میں پھُندنا لگا ہوتا ہے

تُرم : ایک قِسم کا باجا، بگُل، مُنہ سے بجانے کا ایک آلہ

ٹاؤن ہال : (Town Hall) شہر کی وہ عمارت جس میں میونسپل کمیٹی کا دفتر ہو

ٹھنڈا ہو کر رہ جانا : خاموش ہو جانا، دم نہ مارنا، خاموشی اختیار کرنا

جبڑا : دہن کی ہڈّی کا وہ حصّہ جس میں دانت جڑے ہوتے ہیں، کلّہ

جزو لاینفک : وہ حصّہ جو علٰحدہ نہ ہو سکے، کسی چیز کا ضروری حصّہ

جوڑے : جوڑا، ایک ہی طرح کی دو چیزیں، جُفت

سنگین چوکی : پتّھروں سے بنا ہُوا چھوٹا تخت، پتّھر کی چوکی

سُنی کو ان سُنی کر دینا : بات سُن کر بے توجّہی برتنا، توجّہ نہ کرنا، بات سُن کر ایسا ظاہر کرنا کہ جیسے بات سُنی ہی نہیں

سوءادبی : خلافِ ادب

صحت کی جانا : دُرست کیا جانا، اغلاط دوٗر کرنا، تصحیح کرنا

صَرف کرنا : خرچ کرنا، استعمال کرنا، خرچ میں لانا

صَلا کرنا : دعوت دینا، کھانے کے لیے کہنا

صندلی : صندل کے رنگ سے مشابہ، صندل جیسا

فرشی : چوڑے پیندے کا حُقّہ

فرنچ فیشن : فرانسیسی، فرانسیسیوں کی طرح

فقرہ کسنا : فقرہ بازی کرنا، جملہ چُست کرنا، مذاق اُڑانا

فلٹ کیپ : سیدھی ٹوپی، ہموار ٹوپی

قالین : غالیچہ، فرشِ پشمین، ایک قِسم کا بچھونا

قدم رکھنا : داخل ہونا، اندر قدم رکھنا

کانا گدھا احمق آدمی، ناقص سواری بے وقوف سوار : کانا گدھا احمق آدمی، ناقص سواری بے وقوف سوار

کشمیری جُبّہ : کشمیر کا بنا ہُوا ایک قِسم کا ڈھیلا کوٹ جس کی آستینیں کلائی سے اوپر ہوتی ہیں

کگر : کگار، کنارہ، حاشیہ

کلام مجید : کلامِ اللہ، کلامِ الٰہی، قرآن مجید

کلّہ : سر، کھوپڑی، کلاّ

کنٹوپ : ایک قِسم کی ٹوپی جس کو سر پر لگانے سے کان بھی ڈھک جاتے ہیں

کوٹ کوٹ کر بھری ہونا : حد درجہ ہونا، بہت زیادہ ہونا، کثرت سے ہونا

کھاتہ : کھاتا، حساب کی کتاب، لیکھا بہی

بَون بلنا : وضع تبدیل کرنا، حلیہ بدلنا

جھوٹے مُنھ کہنا : جھوٹے مُنہ پوچھنا، ظاہرداری سے کہنا، یوں ہی پوچھ لینا

چاندنی : سفید فرش، سفید چادر جو دری وغیرہ پر بچھائی جاتی ہے

چوڑان : چوڑائی، وسعت، کشادگی

چھاجانا : غالب ہوجانا، رنگ جمانا، مقبول ہوجانا

چھِدری : چھِدرا کی تانیث، فرق فرق سے، دوٗر دوٗر، متفرّق

چھوکر نہ جانا : بالکل نہ ہونا، بالکل بے نیاز ہونا

حساب کتاب کرنا : لین دین کا شمار کرنا، آمد وخرچ کا حساب کرنا

حمائل شریف : چھوٹی تقطیع کا قرآن شریف جسے گردن میں لٹکایا جاتا ہے

حِنا کرنا : مہندی کے رنگ سے رنگنا

خوش خوراک : زیادہ کھانے والا، اچھّا کھانے والا

دالان : بڑا اور لمبا کمرہ جس میں اکثر محراب اور در ہوتے ہیں

دقیانوسی : پُرانا، قدیم، فرسودہ

دل بیٹھ جانا : دل کو سخت رنج ہونا، صدمہ ہونا، تنگ آجانا، پریشان ہوجانا

دن چڑھنا : صبح کا وقت گزر جانا، صبح کے وقت آفتاب کا قدرے بلندی پر آنا

دہانہ : مُنہ، دہن

دُہرا بدن : بھرا ہُوا جسم، موٹا بدن

کھائے من بھاتا : کھانا اپنی پسند کا کھانا چاہیئے، لباس ایسا پہننا چاہیئے جو رواج کے مطابق ہو

کھڑنک : نہایت سوکھا، پاپڑ کی طرح پتلا

گاؤ تکیہ : گول تکیہ جس کی لمبائی عام تکیوں سے زیادہ ہوتی ہے

گدرانا : نیم پختہ ہونا، جوانی کا آغاز ہونا

گزارہ ہونا : بسر اوقات ہونا، کام چلنا

گون : گاؤن (Gown)، مغربی وضع کا لمبا چغہ جسے جلسۂ تقسیم اسناد میں سند یافتہ کو پہنایا جاتا ہے، اسے پادری بھی پہنتے ہیں

گھنٹہ : وہ اونچا مینار جس پر بڑی گھڑی لگی ہوتی ہے

لاٹ : اونچا ستون یا مینار

لمبان : لمبائی، طول

لینا دینا : لین دین، داد وستد، حساب کتاب

لین دین : حساب کتاب، داد وستد

مُٹھّا : بنڈل، گڈّا، کاغذوں کا پشتارہ

محتسب رادرونِ خانہ چہ کار : محتسب کو گھر کے اندر کیا کام یعنی کسی کے اندرونی حالات یا راز دریافت کرنے سے کیا مطلب

مرزئی : مِرزائی، پوری یا آدھی آستین کی کمری، ایک طرح کی صدری یا واسکٹ

مُرمُروں کا تھیلا : موٹا یا فربہ آدمی، ایسا شخص جس کے جسم کی ہیئت مُرمُروں کے تھیلے جیسی ہو

مُقطّع : سنجیدہ، مہذّب، شائستہ

دَھسّہ : سنجاف، کنارہ، پٹّی، کناری یا گوٹ جو زینت اور مضبوطی کے لیے لباس میں لگائی جاتی ہے

رنگ دکھانا : نظارہ کرانا، حال سے آگاہ کرنا۔ لطف اندوز کرنا

زبردست : قوی، طاقتور، مضبوط

زچ ہوجانا : عاجز ہوجانا، پریشان ہوجانا

زمین آسمان کا فرق ہونا : بہت زیادہ فرق ہونا، کوئی مماثلت یا مشابہت نہ ہونا

سانس کھینچنا : گہری سانس لینا، لمبی سانس لینا

مُقیّش : سونے چاندی کے تار

ملتوی کرنا : التوا میں ڈالنا، کچھ عرصہ کے لیے ٹال دینا۔ روک دینا

منّت کش ہونا : احسان مند ہونا، احسان اُٹھانا، ممنون ہونا

مینہ آنا : بارش آنا، پانی برسنا

نَری : بکری یا بھیڑ کا رنگا ہُوا چمڑا

نیچہ : حُقّہ کی نَے، حُقّہ کی نلی

نیم برشت : ادھ پکا، ادھ کچرا، ادھ کچّہ، نیم پُختہ

ہنسوڑ : زیادہ ہنسنے والا، خوش مذاق، خوش طبع، خوش مزاج

05.09 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : مرزا فرحت اللہ بیگ کے پانچ خاکوں کے نام لکھیے۔

سوال نمبر۲ : مرزا فرحت اللہ بیگ کے حالات زندگی پر مختصر نوٹ لکھیے۔

سوال نمبر۳ : مرزا فرحت اللہ بیگ کے اسلوب کی کسی اہم خصوصت کی نشان دہی کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : مرزا فرحت اللہ بیگ کی خاکہ نگاری کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۲ : ''نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی'' کی فنّی خوبیاں بتائیے۔

سوال نمبر۳ : ''مرزا فرحت اللہ بیگ کی ادبی خدمات'' کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیجیے۔

05.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اُردو ادب میں خاکہ نگاری از ڈاکٹر صابرہ سعید

۲۔ اُردو نثر کا فنّی اِرتقا از ڈاکٹر فرمان فتح پوری

۳۔ مرزا فرحت اللہ بیگ بحیثیت انشائیہ نگار اور خاکہ نگار از ڈاکٹر خالد حُسین خاں

۴۔ مضامینِ فرحت از مرزا فرحت اللہ بیگ

اکائی 06 : مجتبیٰ حُسین : آدمی نامہ

ساخت

06.01 : اغراض ومقاصد
06.02 : تمہید
06.03 : مجتبیٰ حسین کے حالاتِ زندگی
06.04 : مجتبیٰ حسین کی ادبی خدمات
06.05 : مجتبیٰ حسین کے انعامات واعزازات
06.06 : مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری
06.07 : مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری کا جائزہ ''آدمی نامہ'' کے حوالے سے
06.08 : خلاصہ
06.09 : فرہنگ
06.10 : نمونہ امتحانی سوالات
06.11 : حوالہ جاتی کتب
06.12 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

06.01 اغراض ومقاصد

خاکہ نگاری ایک مشکل صنف ہے۔ خاکہ نگاری کے ذریعے کسی شخصیت کی دُھندلی تصویر کو چمکایا جاسکتا ہے اور چمکتی ہوئی تصویر کو مدھم کیا جاسکتا ہے۔ اِسی مقصد کے پیشِ نظر اِس اکائی میں مجتبیٰ حسین کی زندگی اور اُن کی ادبی خدمات بالخصوص اُن کی خاکہ نگاری اور اُن کے اُسلوب کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے تاکہ آپ اُن سے بہ خوبی واقف ہوسکیں۔ اکائی کے آخر میں مشکل الفاظ کے معانی، نمونہ امتحانی سوالات بھی دیے گئے ہیں تاکہ آپ امتحان کی مشق بھی کرتے رہیں۔

06.02 تمہید

مجتبیٰ حسین اُردو زبان کے ایک ممتاز اور بلند پایہ خاکہ نگار ہیں۔ اُنہوں نے مختلف اصناف میں اپنی مہارت وقابلیت کے جوہر دِکھائے ہیں۔ پہلے وہ صرف طنزیہ ومزاحیہ مضامین ہی لکھتے تھے لیکن جب وہ خاکہ نگاری کی طرف مائل ہوئے تو اِس صنف میں اُنہوں نے اپنے فن کے ایسے جلوے بکھیرے کہ زبان وادب کے ماہرین اَنگشت بہ دَنداں رہ گئے۔ اِس اکائی میں آپ مجتبیٰ حسین کے حالاتِ زندگی، تعلیم وتربیت، فن، اُسلوب، ادبی خدمات، اعزازات وانعامات اور اُن کے خاکوں کے مجموعے ''آدمی نامہ'' میں شامل ۱۵/خاکوں کی روشنی میں اُن کی خاکہ نگاری کا مطالعہ کریں گے۔

06.03 مجتبیٰ حسین کے حالاتِ زندگی

ریاستِ حیدرآباد میں ''گلبرگہ'' نام کا ایک ضلع تھا جو ۱۹۵۶ء میں ریاستوں کی لسانی تقسیم کے بعد ''ریاستِ کرناٹک'' کا ایک ضلع قرار پایا۔ ضلع ''گلبرگہ'' میں ''چنچولی'' نام کی ایک تحصیل ہے۔ مجتبیٰ حسین اُسی چنچولی تحصیل کے تحصیل دار مولوی احمد حسین کے یہاں ۱۵/جولائی ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ مولوی احمد حسین ضلع ''عثمان آباد'' کے باشندے تھے لیکن چوں کہ وہ چنچولی میں تحصیل دار تھے، اِس لئے اُن کی زندگی کا بیش تر وقت وہیں گزرا۔ مجتبیٰ حسین کی والدہ کا نام ''اَمیر النسا بیگم'' تھا۔ اُن کے بھائیوں میں محبوب حسین جگر، عابد حسین، ابراہیم جلیسؔ، یوسف حسین اور سرتاج حسین وغیرہ تھے۔ مجتبیٰ حسین اپنے بڑے بھائی محبوب حسین جگر سے ۱۷/سال جب کہ ابراہیم جلیسؔ سے ۱۲/سال چھوٹے تھے۔ محبوب حسین جگر نے ۱۹۴۹ء میں عابد علی خان کے ساتھ مل کر "روزنامہ سیاست'' کی داغ بیل ڈالی، جس میں محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر تھے۔ ابراہیم جلیسؔ نہایت کم عمری میں صرف ۲۴/سال کی عمر میں تقسیمِ ملک کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے۔ اُن کو برِصغیر ہندو پاک میں صفِ اول کے افسانہ نگار اور طنز نگار کی حیثیت سے کافی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ اُن کی لکھی ہوئی کتابیں ''چالیس کروڑ بھکاری'' اور ''دو ملک، ایک کہانی'' اردو ادب میں کافی اہمیت کی حامل ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی شادی ۱۲/نومبر ۱۹۵۶ء میں اُن کی چچازاد بہن ''ناصرہ رئیس بیگم'' سے ہوئی۔

مجتبیٰ حسین نے ابتدائی تعلیم اپنے والد مولوی احمد حسین کی نگرانی میں گھر ہی پر حاصل کی۔ اُس کے بعد پہلی، دوسری اور تیسری جماعت کے بجائے سیدھا چوتھی جماعت میں گلبرگہ کے ''مدرسہ تحتانیہ، آصف گنج'' میں داخلہ لیا۔ اُس کے علاوہ ضلع عثمان آباد میں بھی کچھ عرصہ زیرِ تعلیم رہے۔ ہندو پاک کی تقسیم کے وقت مجتبیٰ حسین آٹھویں جماعت میں پڑھ رہے تھے۔ اُس کے بعد ۱۹۵۱ء میں ''گورنمنٹ ہائی اسکول، تانڈور'' سے ''میٹرک'' کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۵۳ء میں ''انٹرمیڈیٹ کالج، گلبرگہ'' سے ''انٹرمیڈیٹ آرٹس'' کا امتحان پاس کیا۔ پھر عثمانیہ یونی وَرسٹی، حیدرآباد میں ''گریجویشن'' میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۵ء میں گریجویشن مکمل کیا۔ اُس کے بعد ۱۹۵۸ء میں عثمانیہ یونی وَرسٹی، حیدرآباد ہی سے ''ڈپلومہ اِن پبلک ایڈمنسٹریشن'' میں امتیازی نمبرات کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔

مجتبیٰ حسین ابتدا ہی سے طنز و مزاح سے خاص دل چسپی رکھتے تھے۔ چوں کہ اُن کے والد مولوی احمد حسین علم و ادب کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے، اِس لئے مجتبیٰ حسین کو یہ ادبی ذوق وراثت میں ملا۔ اُنہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا اور صحافت کے میدان میں اُن کی تربیت اُن کے بڑے بھائی محبوب حسین جگر نے کی۔ مجتبیٰ حسین ایک صحافی کی حیثیت سے ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۲ء تک تقریباً سات سال ''روزنامہ سیاست'' سے منسلک رہے اور اپنے کام کو بہ خوبی انجام دیتے رہے۔ اُن کی مزاح نگاری کے آغاز کی بنیاد ایک المیہ ہے۔ مجتبیٰ حسین ''قصہ مختصر'' میں ''مَیں اور مزاح'' کے عنوان سے اپنی مزاح نگاری کے آغاز کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''میری مزاح نگاری کی بنیاد ایک المیہ پر رکھی ہوئی ہے۔ وہ المیہ یہ ہے کہ مشہور کالم نگار شاہد صدیقی کے انتقال کے بعد میرے بڑے بھائی جناب محبوب حسین جگر اور ''روزنامہ سیاست'' کے ایڈیٹر جناب میر عابد علی خاں نے ایک دن مجھے بلا کر خوب ڈرایا، دھمکایا اور مجھے یہ حکم دیا کہ میں اچانک مزاح نگار بن جاؤں۔ چنانچہ اُس حکم کی تعمیل میں ۱۲/اگست ۱۹۶۲ء کو دن کے ٹھیک ساڑھے دس بجے مَیں نے پہلی مزاحیہ تحریر لکھی اور

اب تک خوف کے مارے لکھتا چلا جا رہا ہوں، اب لوگ کہتے ہیں کہ میں پیدائشی مزاح نگار ہوں لیکن میں جانتا ہوں کہ میں صرف پیدائشی ڈرپوک آدمی ہوں، جبھی تو اُس حکم سے ڈر کر اب تک مزاح لکھتا آ رہا ہوں''۔

(قصہ مختصر، مجتبیٰ حسین، ص ۱۶/ ۱۷-۱۵، ۱۹۷۲ء)

مجتبیٰ حسین ''روزنامہ سیاست'' کے کالم ''شیشہ و تیشہ'' میں ''کوہ پیما'' کے فرضی نام سے لکھتے تھے۔ وہ کسی کے مقلد نہیں تھے۔ اُنہوں نے شروع میں نطشے کا فلسفہ پڑھا، اُس کے بعد مارک توئین، ڈبلیو. جی وُڈ ہاؤس، پطرس، اِسٹیفن، لی کاک، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، شفیق الرحمٰن، رشید احمد صدیقی، کنہیالال کپور، احمد ندیم قاسمی، ابنِ اِنشا، فکر تونسوی اور ابراہیم جلیس وغیرہ کو پڑھا۔ نطشے کا فلسفہ، غالبؔ کا دیوان اور پطرس کے مضامین اُنہیں زبانی یاد تھے۔ ۱۹۶۴ء میں اُنہوں نے اپنے اصلی نام سے اپنا پہلا مزاحیہ مضمون ''ہم طرف دار ہیں غالبؔ کے سخن فہم نہیں'' کے نام سے لکھا۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۲ء تک محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ حکومتِ آندھرا پردیش سے وابستہ رہے۔ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۴ء تک حکومتِ ہند کی طرف سے گجرال کمیٹی کے شعبۂ ریسرچ، گجرال کمیٹی، دہلی میں خدمات انجام دیں۔ مختلف عہدوں پر فائز ہوئے اور ۱۹۹۲ء میں ریٹائر ہوگئے۔ مجتبیٰ حسین نے مختلف ممالک جیسے جاپان، امریکہ، برطانیہ، فرانس، کنیڈا، روس اور پاکستان وغیرہ کے سفر کیے۔ مجتبیٰ حسین کا انتقال ۲۷ رمئی ۲۰۲۰ء میں حیدرآباد میں ہوا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ مجتبیٰ حسین کی پیدائش کب ہوئی؟

﴿۲﴾ مجتبیٰ حسین کے والد کا نام کیا تھا؟

﴿۳﴾ مجتبیٰ حسین کی والدہ کا نام کیا تھا؟

06.04 مجتبیٰ حسین کی ادبی خدمات

مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور تحریروں میں کافی ہم آہنگی ہے۔ اُن کے مضامین، خاکے، سفر نامے اور مزاح نگاری کا بنیادی وصف اُن کا اندازِ بیان ہے۔ وہ اپنی تخلیقات میں ایسی بے تکلف زبان استعمال کرتے تھے کہ قارئین مضمون ختم ہونے کے بعد ہی اُن کی تخلیقی فضا کی گرفت سے آزادی حاصل کر پاتے تھے۔ اُن کے مزاح میں وہ لطف اندوزی ہے کہ خود بہ خود لبوں پر تبسم بکھر جاتا ہے۔ عجز و انکسار، انسان دوستی، خلوص و محبت، احترام، نہ کوئی تکلف اور نہ ہی کوئی تصنع اور دوستوں پر اعتماد اُن کی شخصیت کے نمایاں اوصاف تھے۔ اپنی دوستی کے متعلق مجتبیٰ حسین ''قصہ مختصر'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میں دوستوں کا رسیا اور متوالا ہوں۔ اپنے وقت کا بڑا حصہ دوستوں میں گنواتا ہوں۔ کیوں کہ ایسا کرنے سے دوستوں کو میرے خلاف غیبت کرنے اور مجھے اُن کے خلاف غیبت کرنے کا موقع ہاتھ آتا ہے اور یہ کوئی معمولی سہولت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی محفل سے اُٹھ کر مَیں بہ ظاہر تو چلا جاتا ہوں لیکن اصل میں مَیں وہیں کہیں چھپ کر کھڑا ہو جاتا ہوں اور بڑی دیر تک اپنے کانوں سے اپنے خلاف ہونے والی غیبت کو سنتا رہتا ہوں۔ اگر کسی دن دوست میری غیبت نہیں کرتے تو میں اپنی پناہ گاہ سے باہر نکل آتا ہوں اور اُن سے

لڑنے لگتا ہوں کہ آج تم نے میری غیبت کیوں نہیں کی؟ آج کا سارا دن تو بس یوں ہی ضائع ہوگیا۔''

(قصہ مختصر،مجتبیٰ حسین،ص۱۴-۱۳،۱۹۷۲ء)

مجتبیٰ حسین ایک بسیار نویس ادیب تھے۔ وہ بہ یک وقت خاکہ نگار، انشائیہ نگار، مضمون نگار، طنز ومزاح نگار، سفرنامہ نگار، کہانی کار اور کالم نگار سب کچھ تھے۔ اُن کا مشاہدہ وسیع اور گہرا تھا۔ اُن کا اُسلوبِ خاص فطری تھا جس میں تکلف اور تصنع کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ ایسی آسان زبان استعمال کرتے تھے کہ قارئین کے دلوں میں اُتر جاتی تھی۔ اُن کے یہاں متنوع موضوعات پائے جاتے ہیں۔ اُنہوں نے متعدد کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن کی تفصیل درجِ ذیل ہے:

﴿۱﴾ تکلف برطرف (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ) ۱۹۶۸ء

﴿۲﴾ قطعِ کلام (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ) ۱۹۶۹ء

﴿۳﴾ قصہ مختصر (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ) ۱۹۷۲ء

﴿۴﴾ بہ ہرحال (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ) ۱۹۷۴ء

﴿۵﴾ آدمی نامہ (خاکوں کا مجموعہ) ۱۹۸۱ء

﴿۶﴾ بالآخر (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ) ۱۹۸۲ء

﴿۷﴾ جاپان چلو، جاپان چلو (سفرناموں کا مجموعہ) ۱۹۸۳ء

﴿۸﴾ الغرض (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ) ۱۹۸۷ء

﴿۹﴾ سوہے وہ بھی آدمی (خاکوں کا مجموعہ) ۱۹۸۷ء

﴿۱۰﴾ چہرہ در چہرہ (خاکوں کا مجموعہ) ۱۹۹۴ء

﴿۱۱﴾ سفرلخت لخت (سفرناموں کا مجموعہ) ۱۹۹۵ء

﴿۱۲﴾ آخرکار (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ) ۱۹۹۷ء

﴿۱۳﴾ ہوئے ہم دوست جس کے (خاکوں کا مجموعہ) ۱۹۹۹ء

﴿۱۴﴾ میرا کالم (کالموں کا انتخاب) ۱۹۹۹ء

﴿۱۵﴾ مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں، جلد اول مرتب حسن چشتی ۲۰۰۱ء

﴿۱۶﴾ مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں، جلد دوم مرتب حسن چشتی ۲۰۰۲ء

﴿۱۷﴾ مجتبیٰ حسین کے سفرنامے، جلد دوم مرتب حسن چشتی ۲۰۰۴ء

﴿۱۸﴾ مجتبیٰ حسین کے منتخب کالم، جلد دوم مرتب حسن چشتی ۲۰۰۵ء

﴿۱۹﴾ آپ کی تعریف (خاکوں کا مجموعہ) مرتب امتیاز الدین ۲۰۰۷ء

﴿۲۰﴾ کالم برداشتہ (کالموں کا انتخاب) مرتب امتیاز الدین ۲۰۰۷ء

﴿۲۱﴾ مہرباں کیسے کیسے (خاکوں کا مجموعہ) ۲۰۰۹ء

﴿۲۲﴾ امریکہ گھاس کاٹ رہا ہے (سفرناموں اور کالموں کا انتخاب) ۲۰۰۹ء

﴿۲۳﴾ اُردو کے شہر، اُردو کے لوگ (رپورتاژ اور خاکوں کا مجموعہ) مرتب رحیل صدیقی، ۲۰۱۰ء

﴿۲۴﴾ کالم میں انتخاب (منتخب کالموں کا مجموعہ) مرتب امتیاز الدین، ۲۰۱۱ء

مجتبیٰ حسین کی کچھ کتابوں کا ہندی اور جاپانی زبانوں میں ترجمہ بھی کیا جا چکا ہے جن میں سے کچھ کتابوں کے نام درجِ ذیل ہیں:

﴿۱﴾ قصہ آرام کرسی کا (ہندی) ۱۹۶۸ء

﴿۲﴾ مجتبیٰ حسین رَچناولی (ہندی) ۱۹۸۲ء

﴿۳﴾ جاپان چلو، جاپان چلو (جاپانی) ۱۹۸۲

﴿۴﴾ جاپان چلو، جاپان چلو (ہندی) ۱۹۸۸ء

﴿۵﴾ سوئز بینک میں کھاتا ہمارا (ہندی) ۱۹۹۰ء

﴿۶﴾ سندباد کا سفرنامہ (ہندی) ۱۹۹۴ء

﴿۷﴾ چہرہ در چہرہ (ہندی) ۱۹۹۹ء

06.05 مجتبیٰ حسین کے انعامات واعزازات

مجتبیٰ حسین کی شخصیت ایک بڑے فن کار اور ایک عظیم انسان کا حسین سنگم تھی۔ عجز وانکسار، انسان دوستی، احترام اور اخلاقِ حسنہ اُن کی شخصیت کے نمایاں اوصاف تھے۔ یہ ایسے اوصاف ہیں جو اُن کی شخصیت میں چار چاند لگاتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین اُردو طنز ومزاح کی آبرو تھے۔ اُن کی تحریریں اُردو ادب کا قابلِ قدر سرمایہ ہیں۔ مجتبیٰ حسین بہ یک وقت خاکہ نگار، انشائیہ نگار، مضمون نگار، طنز ومزاح نگار، سفرنامہ نگار، کہانی کار اور کالم نگار سب کچھ تھے۔ اُنہوں نے متعدد کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ مجتبیٰ حسین کو اُن کی تصانیف کی وجہ سے متعدد انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔ ذیل میں مجتبیٰ حسین کو دیے گئے انعامات واعزازات کی ایک فہرست پیش ہے:

﴿۱﴾ ہاسیہ رَتن سرس ساہتیہ سمیتی، کٹک ۱۹۸۰ء

﴿۲﴾ نشانِ اِمتیاز بزمِ ساز وادب، دہلی ۱۹۸۳ء

﴿۳﴾ غالب ایوارڈ غالب اِنسٹی ٹیوٹ، دہلی ۱۹۸۴ء

﴿۴﴾ ایوارڈ برائے تخلیقی نثر اُردو اکیڈمی، دہلی ۱۹۸۹ء

﴿۵﴾ کل ہند مخدوم ادبی ایوارڈ اُردو اکیڈمی، آندھرا پردیش ۱۹۹۴ء

﴿۶﴾ کل ہند مہندر سنگھ بیدی ایوارڈ اُردو اکیڈمی، ہریانہ ۱۹۹۸ء

﴿۷﴾ کل ہند ایوارڈ برائے مجموعی خدمات، اُردو اکیڈمی، کرناٹک ۲۰۰۲ء

﴿۸﴾ کل ہند جوہر قریشی ایوارڈ اُردو اکیڈمی، مدھیہ پردیش ۲۰۰۳ء

﴿۹﴾ میر تقی میرؔ ایوارڈ اَمریکی فیڈریشن آف مسلمس آف اِنڈین آرتج ۲۰۰۶ء

﴿۱۰﴾ پدم شری حکومتِ ہند ۲۰۰۷ء

﴿۱۱﴾ کل ہند صوفی جمیل اختر ایوارڈ کولکاتا ۲۰۰۹ء

﴿۱۲﴾ کل ہند امیر خسروؔ نیشنل ایوارڈ انجمن ترقیِ اُردو، جھارکھنڈ ۲۰۰۹ء

﴿۱۳﴾ ڈی.لِٹ کی اعزازی ڈگری گلبرگہ یونی وَرسٹی، کرناٹک ۲۰۱۰ء

﴿۱۴﴾ سَنت گیانیشور نیشنل ایوارڈ اُردو ساہتیہ اکیڈمی، مہاراشٹر ۲۰۱۱ء

﴿۱۵﴾ وِزیٹنگ پروفیسر یونی وَرسٹی آف حیدرآباد ۲۰۱۱-۱۲ء

﴿۱۶﴾ اعترافِ خدمات زندہ دِلانِ حیدرآباد .....

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۴﴾ ''چہرہ در چہرہ'' کس کے خاکوں کا مجموعہ ہے؟

﴿۵﴾ ''قطعِ تعلق'' کس قسم کا مجموعہ ہے؟

﴿۶﴾ مجتبیٰ حسین کو ''پدم شری ایوارڈ'' کب دیا گیا؟

06.05 مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری

مجتبیٰ حسین بنیادی طور پر ایک قصہ گو ہیں۔اُن کا موضوع قارئین کو زندگی کے روزمرہ مسائل سے رُوشناس کرتا ہے۔اُن کا مشاہدہ وسیع اور گہرا ہے۔اُن کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے۔وہ کسی بھی موضوع پر عام فہم اور سیدھی سادی زبان میں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔وہ بین الاقوامی شہرت کے مالک اور ہر دل عزیز فن کار ہیں۔دنیا کے ہر خطے میں اُن کی تحریروں کے شیدائی اور دیوانے موجود ہیں۔مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری اُنہیں ایک خاص امتیاز عطا کرتی ہے۔خاکہ نگاری آسان کام نہیں ہے بلکہ تلوار کی دَھار پر چلنے کا فن ہے۔خاکہ نگار کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اُسے جس شخصیت کا خاکہ لکھنا ہے، اُس کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کی نشان دہی کرے ورنہ خاکہ یا تو قصیدہ بن جائے گا یا پھر ہجو بن کر رہ جائے گا۔مجتبیٰ حسین کے خاکوں کی تعداد تقریباً ۲۰۰/ ہے جو اُن کے مختلف مجموعوں میں شامل ہیں۔آیئے مجتبیٰ حسین کے خاکوں کی روشنی میں اُن کی خاکہ نگاری کے اُسلوب کا مطالعہ کرتے ہیں:

اپنی خاکہ نگاری کے بارے میں مجتبیٰ حسین خود لکھتے ہیں:

> ''میں نے پہلا خاکہ ۱۹۶۹ء میں اپنے بزرگ دوست حکیم یوسف حسین خاں کا لکھا تھا.....جب اُن کی کتاب ''خوابِ زلیخا'' کی تقریبِ رُونمائی کا مرحلہ آیا تو نہ جانے اُن کے جی میں کیا آئی کہ مجھ سے اپنا خاکہ لکھنے کی فرمائش کر بیٹھے۔اُس وقت تک میں نے مزاحیہ مضامین ہی لکھے تھے۔کسی کا خاکہ نہیں لکھا تھا۔ بہت عذر پیش کیے۔پہلے تو اپنی کم علمی اور کم مائیگی کا حوالہ دیا۔یہ عذر قابلِ قبول نہ ہوا تو عمر کے اُس فرق کا حوالہ دیا جو میرے اور اُن کے بیچ حائل تھا۔اُس پر بھی وہ مُصر رہے کہ مجھے خاکہ لکھنا ہی ہوگا۔یہ پہلا خاکہ تھا جسے

سامعین اور صاحبِ خاکہ دونوں نے پسند فرمایا تھا.....بعد میں جتنے بھی خاکے لکھے، اُنہیں اگر سامعین پسند کرتے تھے تو صاحبِ خاکہ کو ناگوار گزرتا تھا، اور اگر صاحبِ خاکہ خوش ہوتے تھے تو سامعین ناخوش۔ عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ حکیم یوسف حسین خاں پر میں نے پہلا شخصی خاکہ لکھا تھا اور اِس طرح میری خاکہ نگاری کی ابتدا ہوئی تھی''۔

(آدمی نامہ، مجتبیٰ حسین، ص/۶-۵، ۱۹۸۱ء)

''قطعِ کلام'' میں مجتبیٰ حسین کے دو خاکے شائع ہوئے جن میں سے ایک خاکہ ''طیب انصاری'' کا ہے جو خاکہ نگاری کے سارے اُصولوں پر کھرا اترتا ہے اور اُس خاکے میں مجتبیٰ حسین بھی اپنے مقصد میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین اپنے اُسلوبِ خاص میں ''طیب انصاری'' کی تنقید نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''وہ جب کسی ادیب یا شاعر پر تنقید کرتا ہے تو اِس قدر جوش میں آجاتا ہے جیسے وہ ابھی قلم رکھ کر اُٹھ جائے گا اور اُس ادیب کے گھر پر پہنچ کر اُس کا گلا پکڑے گا اور بقیہ تنقید کو ہاتھا پائی کے ذریعہ مکمل کر دے گا .....مثال کے طور پر ''کلیم الدین احمد'' کی تنقید پر طیب انصاری نے یوں تنقید کی ہے: ''اگر مَیں کلیم الدین احمد کو چیخوف کی مکھی اور اُن کی تنقید کو ادب کے جسم پر کوڑھ سے تعبیر کرتا ہوں تو اِس میں میرا کیا قصور ہے؟ میرا یہ خیال ہے کہ کلیم الدین احمد کی تنقید نیم وحشی ہے، اُردو ادب کے جسم پر کوڑھ ہے۔ اُن کی حیثیت اُس مکھی کی سی ہے جو گھوڑے کو ہل چلانے سے روکتی ہے۔ اِسی وجہ سے وہ عظیم نقاد تو کیا کہلائیں گے، بڑے نقاد بھی نہیں ہیں، اُن کی تنقید کا ادب میں کوئی مقام نہیں ہے۔''

(قطعِ کلام، مجتبیٰ حسین، ص/۱۴۸، ۱۹۶۹ء)

مجتبیٰ حسین کے مطابق انسان کو انسان کی نگاہ سے دیکھنا، سمجھنا اور پرکھنا چاہیے تاکہ ایک مکمل اور زندہ و جاوید خاکہ وجود میں آسکے۔ مجتبیٰ حسین نے وہی بیان کیا ہے جو اُنہوں نے دیکھا اور سمجھا ہے۔ ''چہرہ در چہرہ'' میں ''دیوان بریندر ناتھ'' کا خاکہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دیوان بریندر ناتھ کے ناموں اور ٹیلی فونوں کی کثرت کے علاوہ اُن کے ہاں ایک اور شَے کی کثرت بھی ہے اور وہ ہے کُتّوں کی کثرت۔ مَیں شیر سے اتنا نہیں گھبراتا جتنا کُتّوں سے گھبراتا ہوں۔ کُتّوں سے گھبرانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وفادار جانور ہوتا ہے۔ آج کے معاشرہ میں جو بھی وفادار ہوگا وہ خطرناک ضرور ہوگا، بلکہ اُسے تو پارٹی تک سے نکال دیا جائے گا۔ دیوان بریندر ناتھ کے گھر کی کال بیل جب بھی بجاتا ہوں تو مجھے اچانک کئی کُتّوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی ہیں۔ میں نے اُن سے پوچھا بھی کہ اُن کے گھر میں کتنے کُتّے پلتے ہیں؟ بولے: ''ہیں تو دو ہی کُتّے، لیکن بھونکتے کچھ اِس طرح ہیں کہ بہ یک وقت چار، پانچ کُتّوں کی ''بھونک'' بھونک لیتے ہیں۔''

(چہرہ در چہرہ، مجتبیٰ حسین، ص/۵۴، ۱۹۹۴ء)

مجتبیٰ حسین کے خاکوں کا ایک بنیادی وصف طنز و مزاح ہے۔ اُن کے بیش تر خاکوں میں طنز و مزاح کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ ''سو ہے وہ بھی آدمی'' میں مشتاق احمد یوسفی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''جو لوگ مشتاق احمد یوسفی سے ملنے کے خواہش مند ہیں، اُنہیں ہم آگاہ کیے دیتے ہیں کہ اُن کے لکھے پر بالکل نہ جائیں۔ یہ اُن مزاح نگاروں میں سے ہیں جن کے قول و فعل پر کبھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اِن کی ''زرگزشت''، ''خاکم بہ دَہن'' اور ''چراغ تلے'' کو پڑھ کر ہم نے اپنے تئیں یہ سوچ رکھا تھا کہ یہ عمارت تو اب کھنڈر بن گئی ہوگی۔ سوچا تھا کہ اِن کے ساتھ بھی وہی سلوک کریں گے جو ہم عموماً تاریخی عمارتوں کے ساتھ کرتے آئے ہیں، یعنی ہاتھ لگائے بغیر دُور سے دیکھ لیا، کچھ طرزِ تعمیر کی تعریف کی، کچھ بچے کھچے آثار اور نقش و نگار کو دیکھ کر اصل عمارت کی عظمت کا نقش ذہن میں تازہ کر لیا، ایک فوٹو کھینچ لیا، کوئی محافظ نہ دیکھ رہا ہو تو عمارت پر اپنا نام بھی کندہ کر دیا۔''

(سو ہے وہ بھی آدمی، مجتبیٰ حسین، ص/۳۶، ۱۹۸۷ء)

مجتبیٰ حسین نے جن شخصیات کے خاکے لکھے ہیں، اگر اُن کی خوبیوں کو بتایا ہے تو خامیوں کو بھی بیان کیا ہے اور اِس طرح بیان کیا ہے کہ یہ احساس نہ ہو کہ خامیوں کا بیان ہو رہا ہے۔ یہ فن اُن کے یہاں باقاعدہ موجود ہے۔ ''چہرہ در چہرہ'' میں شہریار کے بارے میں لکھتے ہیں:

''شہریار سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ مَیں اُن کی شاعری کا پرانا مداح تو تھا ہی لیکن تاش کے لئے اُن کے اِنہماک کو دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ جو شخص تاش کے لئے اتنا سنجیدہ ہو سکتا ہے وہ دوستی کیا خاک کر سکے گا؟ مگر.....شہریار نے.......احساس دلایا کہ جس اِنہماک کے ساتھ وہ تاش کھیلتے ہیں، اُسی اِنہماک کے ساتھ دوستی بھی کر سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جب دوستی کرتے ہیں تو تاش نہیں کھیلتے اور جب تاش کھیلتے ہیں تو دوستی نہیں کرتے۔''

(چہرہ در چہرہ، مجتبیٰ حسین، ص/۷۰، ۱۹۹۴ء)

مجتبیٰ حسین کے خاکوں کا مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُنہوں نے اشخاص کی سچی اور غیر جانب دارانہ تصویریں کھینچی ہیں۔ ''ہوئے ہم دوست جس کے'' میں شمس الرحمٰن فاروقی کی ایک عادت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شمس الرحمٰن فاروقی کو بچپن ہی سے کتابیں پڑھنے کا شوق رہا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اِس شوق کی تکمیل کے لئے اُنہوں نے گورکھ پور کے ایک جلد ساز سے دوستی کر لی تھی۔ چنانچہ جب بھی کوئی کتاب جلد بندی کے لئے جلد ساز کے پاس آتی تو فاروقی پہلے اُس کتاب کو پڑھتے تھے اور تب کہیں جلد ساز اُس کی جلد بندی کرتا تھا۔ ہمیں یقین ہے کہ فاروقی کو جب کوئی کتاب پسند نہ آتی ہوگی تو وہ جلد ساز سے کہہ دیتے ہوں گے کہ بھیّا! اِس کتاب کی جلد نہ بناؤ! اِس کا ضائع ہو جانا ہی بہتر ہے۔ علم اور اَدب کے معاملے میں اُن کے رائے دینے کا انداز یہی ہوتا ہے۔''

(ہوئے ہم دوست جس کے، مجتبیٰ حسین، ص/۱۹، ۱۹۹۹ء)

مجتبیٰ حسین عام فہم اور سیدھی سادی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔اُن کی گفتگو کا انداز اَکثر وبیش تر طنزیہ ومزاحیہ ہوتا ہے۔طنز ومزاح کے پیرائے میں جب وہ کسی شخصیت کا خاکہ کھینچتے ہیں تو اُس وقت ایک الگ ہی قسم کا لطف حاصل ہوتا ہے۔''چہرہ در چہرہ'' میں کمار پاشی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مَیں جب تک کمار پاشی سے نہیں ملا تھا، دماغ پاشی کے نقصانات، آب پاشی اور گلاب پاشی کے فائدوں سے تو اچھی طرح واقف تھا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ ''یہ کمار پاشی'' کیا ہوتی ہے؟ کیسے ہوتی ہے؟ کب ہوتی ہے؟ کیوں ہوتی ہے اور کہاں ہوتی ہے؟ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ اِس پاشی کے فائدے ہوتے ہیں یا نقصانات؟ کھوج کی تو پتہ چلا کہ کمار پاشی اصل میں نام ہے اُردو کے ایک شاعر کا۔سوچا کہ اگر یہ پاشی ہے تو اِس پاشی کے نقصانات ہی نقصانات ہوں گے لیکن یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ ۱۹۷۲ء میں دہلی آنے کے بعد جس پہلی ادبی شخصیت سے میری ملاقات ہوئی وہ یہی حضرتِ کمار پاشی تھے۔''

(چہرہ در چہرہ، مجتبیٰ حسین، ص ۹۲، ۱۹۹۴ء)

مجتبیٰ حسین خوبی اور خامی دونوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں اور خامی کا بیان اِس طرح کرتے ہیں کہ کردارِ خاکہ سے ایک قسم کی ہم دَردی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔''مہرباں کیسے کیسے'' میں خواجہ عبدالغفور کے بارے میں مزاحیہ انداز میں لکھتے ہیں:

''مَیں مسلسل اِس نکتہ پر غور کرتا رہا کہ خواجہ عبدالغفور صاحب آخر کس طرح لطیفے کہتے ہوں گے اور اُن پر کس طرح ہنستے ہوں گے؟ میں نے سوچا کہ وہ لوگوں کو اپنے لطیفوں سے زیادہ اپنی کمشنری کے بَل بُوتے پر ہنساتے ہوں گے۔حکم دیا کہ ہنسو! اور لوگ ہنسنے لگے۔ مجھے وہ لطیفہ بھی یاد آیا کہ کوریا کی جنگ کے زمانے میں ایک امریکی جنرل کوریا کے سپاہیوں کے سامنے تقریر کر رہا تھا اور ایک مترجم اُس کی انگریزی تقریر کا کوریائی زبان میں ترجمہ کر رہا تھا......جنرل نے ایک طویل لطیفہ سنایا اور اُس کے بعد مترجم نے اُس طویل لطیفہ کے سلسلے میں صرف ایک جملہ کہا اور سارے کوریائی سپاہی پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگے۔امریکی جنرل بہت حیران ہوا۔ اُس نے مترجم سے پوچھا: بھئی! تم نے ایک جملہ میں اتنے طویل لطیفہ کا ترجمہ کیسے کر دیا؟ اِس پر مترجم بولا: حضور! میں نے لطیفہ کا ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ میں نے سپاہیوں سے یہ کہا ہے کہ ابھی ابھی جنرل صاحب نے ایک لطیفہ سنایا ہے، لہٰذا تم لوگ زور زور سے ہنسنے لگ جاؤ!، عہدے داری چیز ہی ایسی ہوتی ہے کہ آدمی کو مارے خوف کے ہنسنا ہی پڑتا ہے۔''

(مہرباں کیسے کیسے، مجتبیٰ حسین، ص ۹۳، ۲۰۰۹ء)

اِن کے علاوہ مجتبیٰ حسین کے دوسرے خاکے بھی ہیں جن میں کسی شخص کی کسی ایک خوبی کو عنوان بنا کر پیش کیا گیا ہے۔''چہرہ در چہرہ'' میں خواجہ احمد عباس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ جس عقیدے کو اُنہوں نے سچا جانا، اُس پر آخر وقت تک قائم رہے۔ ذہنی قلابازیاں لگانے اور کرتب دِکھانے کے وہ قائل نہیں تھے۔ ادیب پیدا ہوتے رہیں گے لیکن خواجہ احمد عباس جیسے بُوتے والا ادیب اب اُردو کو شاید ہی نصیب ہو۔ پانی پت اپنی جنگوں کے لئے مشہور ہے اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پانی پت کی آخری اور اصلی لڑائی خواجہ احمد عباس نے اپنی تحریروں کے ذریعے لڑی تھی۔ یہ لڑائی تھی ظالم کے خلاف مظلوم کے حق میں، سرمایہ دار کے خلاف مزدور کے حق میں، ظلمت کے خلاف اُجالے کے حق میں اور طاقت وَر کے خلاف کم زور کے حق میں''۔

(چہرہ در چہرہ، مجتبیٰ حسین، ص ۲۲، ۱۹۹۴ء)

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۷﴾ ''سو ہے وہ بھی آدمی'' کس کے خاکوں کا مجموعہ ہے؟

﴿۸﴾ ''مہرباں کیسے کیسے'' کس قسم کا مجموعہ ہے؟

﴿۹﴾ ''ہوئے ہم دوست جس کے'' کب لکھا گیا؟

06.07 مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری کا جائزہ ''آدمی نامہ'' کے حوالے سے

''آدمی نامہ'' مجتبیٰ حسین کے خاکوں کا پہلا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ ''آدمی نامہ'' میں کل ۱۵/ادبی شخصیات کے خاکے شامل ہیں جن کی تفصیل درجِ ذیل ہے تاکہ آپ ''آدمی نامہ'' کے خاکوں کی روشنی میں مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری اور اُن کے اُسلوب سے واقفیت حاصل کرسکیں:

﴿۱﴾	کنہیالال کپور	لمبا آدمی
﴿۲﴾	راجندر سنگھ بیدی	سو ہے وہ بھی آدمی
﴿۳﴾	اعجاز صدیقی	اُردو کا آدمی
﴿۴﴾	مخدومؔ محی الدین	یادوں میں بسا آدمی
﴿۵﴾	کرشن چندر	آدمی ہی آدمی
﴿۶﴾	سجاد ظہیر	مسکراہٹوں کا آدمی
﴿۷﴾	ابراہیم جلیسؔ	اپنا آدمی
﴿۸﴾	فکرؔ تونسوی	بھیڑ کا آدمی
﴿۹﴾	عمیق حنفی	آدمی دَر آدمی
﴿۱۰﴾	رضا نقوی واہیؔ	منظوم آدمی
﴿۱۱﴾	خواجہ عبدالغفور	لطیفوں کا آدمی

﴿۱۲﴾ حسن الدین احمد لفظوں کا آدمی

﴿۱۳﴾ نریندر لُوتھر شیشے کا آدمی

﴿۱۴﴾ بانیؔ نَو آدمیوں کا آدمی

﴿۱۵﴾ مخمورؔ سعیدی بہ حیثیتِ مجموعی آدمی

آیئے! ''آدمی نامہ'' کے خاکوں کی روشنی میں مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری اور اُن کے اُسلوب کا مطالعہ کرتے ہیں:

مجتبیٰ حسین نے ''آدمی نامہ'' میں پہلا خاکہ ''کنہیالال کپور.....لمبا آدمی'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

''کنہیالال کپور کو جب بھی دیکھتا ہوں، قطب مینار کی یاد آتی ہے اور جب قطب مینار کو دیکھتا ہوں تو آپ جان گئے ہوں گے کہ کس کی یاد آتی ہوگی۔ چوں کہ دہلی میں ایسی جگہ رہتا ہوں جہاں سے ہر دَم قطب مینار سے آنکھیں چار ہوتی رہتی ہیں۔ اِس لئے کپور صاحب بے تحاشہ، لگاتار اور بنا کوشش یاد آتے رہتے ہیں۔ کیا کریں، دہلی میں کسی اچھی لوکیالیٹی میں مکان بھی تو نہیں ملتا۔ کپور صاحب اور قطب مینار میں مجھے فرق یہ نظر آیا کہ قطب مینار پر رات کے وقت ایک لال بتی جلتی رہتی ہے تاکہ ہوائی جہاز وغیرہ اُدھر کا رُخ نہ کریں۔ کپور صاحب پر رات کے وقت یہ حفاظتی انتظام نہیں ہوتا، جو خطرے سے خالی نہیں ہے۔، کیا پتہ کسی دن کوئی ہوائی جہاز اندھیرے میں کپور صاحب سے نبرد آزما ہو جائے اور ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے (مراد ہوائی جہاز سے ہے)۔ ایسی ''سات منزلہ شخصیتیں'' اب بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔''

(آدمی نامہ، مجتبیٰ حسین، ص/۹، ۱۹۸۱ء)

مجتبیٰ حسین نے ''آدمی نامہ'' میں دوسرا خاکہ ''راجندر سنگھ بیدی.....سو ہے وہ بھی آدمی'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''بیدیؔ صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ اُن کا حافظہ خاصا کم زور ہے۔ وہ اپنے قریبی دوستوں کے نام بھی بھُول جاتے ہیں۔ اِس لئے یوسف ناظمؔ نے بیدیؔ صاحب کی شخصیت پر اپنے بھرپور مضمون میں بیدیؔ صاحب کے دوستوں کو یہ مشورہ دے رکھا ہے کہ وہ جب بھی اُن سے ملیں تو حفظِ ماتقدم کے طور پر اپنا نام ضرور بتا دیں.....اِس مخلصانہ مشورے پر عمل کرتے ہوئے جب ہم نے پچھلی بار دہلی میں بیدیؔ صاحب سے ملنے کے بعد اپنا نام بھی بتا دیا تو بولے: ''مَیں جانتا ہوں، آپ مجھ پر لکھے گئے ایک مزاحیہ خاکے کی بنا پر یہ حرکت کر رہے ہیں، جب کہ بات ایسی نہیں ہے، میرا حافظہ اتنا خراب نہیں ہے''۔ ہم نے پوچھا: بیدیؔ صاحب! یہ خاکہ کس نے لکھا تھا؟ بولے: اِس وقت لکھنے والے کا نام یاد نہیں آ رہا ہے۔''

(آدمی نامہ، مجتبیٰ حسین، ص/۲۸-۲۷، ۱۹۸۱ء)

مجتبیٰ حسین نے ''آدمی نامہ'' میں تیسرا خاکہ ''اعجاز صدیقی.....اُردو کا آدمی'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

''اکثر بیماریوں کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ اعجاز صاحب کے خطوط کے ذریعے ہی ہوا۔ میں اکثر مذاق میں اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا کہ اعجاز صاحب نے بیماریوں کا اتنا عملی تجربہ حاصل کرلیا ہے کہ کوئی یونی ورسٹی اُنہیں اِس تجربہ کی بنا پر ایم. بی. بی. ایس کی ڈگری دے سکتی ہے۔ عملی تجربہ علم سے کہیں زیادہ معتبر اور مستند ہوتا ہے.....ایک صاحب نے شرط لگائی کہ اگر کوئی شخص اعجاز صاحب کا ایسا خط بتلا دے جس میں کسی بیماری کا ذکر نہ ہو تو وہ اُسے سَو روپیے دیں گے۔ ایک شاعر نے بڑی کوشش کے بعد ایک خط ایسا حاصل کیا اور اُن صاحب سے شرط کی رقم کا طلب گار ہوا۔ یہ صاحب بہت سٹپٹائے۔ اِس لئے کہ اُس خط میں سچ مچ کسی بیماری کا ذکر نہیں تھا.....اچانک اُن کی نظر پوسٹ کارڈ کے اُس حصے پر پڑی جہاں ڈاک کی مُہریں لگی ہوتی ہیں، وہاں نہایت خفی حروف میں لکھا تھا.....بسترِ علالت سے۔''

(آدمی نامہ، مجتبیٰ حسین، ص/۳۱-۳۰، ۱۹۸۱ء)

مجتبیٰ حسین نے ''آدمی نامہ'' میں چوتھا خاکہ ''مخدومؔ محی الدین..... یادوں میں بسا آدمی'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ خود لکھتے ہیں:

''میں اور میرا وہ دوست جو ''سرخ سویرا'' کو رِحل پر رکھ کر پڑھا کرتا تھا، اِسٹیشن کی طرف بھاگے، معلوم ہوا کہ شاہ آباد جانے والا مدراس میل ابھی جا چکا ہے۔ اِنکوائری سے پوچھا کہ شاہ آباد کا یہاں سے کتنا فاصلہ ہے؟ جواب ملا: ۲۵/کلومیٹر۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے۔ آج عشق، آتشِ نمرود میں کُود پڑے گا اور ۲۵/کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کرے گا.....یہ ہماری زندگی کی پہلی اور آخری ''لانگ مارچ'' تھی مگر شاہ آباد پہنچے تو معلوم ہوا کہ مخدومؔ آئے بھی اور چلے بھی گئے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ماتھے پیٹ کر چپ ہو رہے۔''

(آدمی نامہ، مجتبیٰ حسین، ص/۴۵، ۱۹۸۱ء)

مجتبیٰ حسین نے ''آدمی نامہ'' میں پانچواں خاکہ ''کرشن چندر.....آدمی ہی آدمی'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

''مہمان نوازی اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ کوئی ملنے جاتا تو اُس کے سامنے پھلوں کی پلیٹ رکھ کر خود پھلوں کو کاٹنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ سیب ایسی نفاست سے کاٹتے تھے کہ ایک جگہ چاقو لگا دیتے تو سارے چھلکے کو ''بہ یک جنبشِ قلم'' اُتار دیتے تھے۔ اُن کو سیب کاٹتے دیکھنا بھی ایک انوکھی مسرت تھی۔ وہ ایک سیب کاٹ لیتے تو جی کہنے کو چاہتا تھا ''سبحان اللہ! مرحبا! مکرّر ارشاد ہو! کیا فصاحت ہے! کیا بلاغت ہے!۔''

(آدمی نامہ، مجتبیٰ حسین، ص/۶۱-۶۰، ۱۹۸۱ء)

مجتبیٰ حسین نے ''آدمی نامہ'' میں چھٹا خاکہ ''سجاد ظہیر.....مسکراہٹوں کا آدمی'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

''مونالیزا'' کی شہرۂ آفاق مسکراہٹ کے بعد اگر کسی مسکراہٹ نے مجھے مسحور کیا تو یہ ''بنّے بھائی (سجاد ظہیر)'' کی مسکراہٹ تھی۔ اِن دونوں مسکراہٹوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ''لیونارڈو دَاوِنسی'' نے ''مونالیزا'' کی مسکراہٹ کو کینوس پر قید کر لیا تھا جب کہ بنّے بھائی کی مسکراہٹ پھیل کر ایک عقیدہ، ایک نظریہ اور ایک تحریک بن گئی اور پھر یہ مسکراہٹ ہمارے ادب، ہمارے ذہن، ہمارے احساس اور ہماری فکر کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئی۔ مجھے تو بعض اوقات پوری ''ترقی پسند تحریک'' کے پیچھے بنّے بھائی کی مسکراہٹ کی کارفرمائی جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔''

(آدمی نامہ، مجتبیٰ حسین، ص/۶۵، ۱۹۸۱ء)

مجتبیٰ حسین نے ''آدمی نامہ'' میں ساتواں خاکہ ''ابراہیم جلیسؔ.....اپنا آدمی'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

''ابراہیم جلیس افسانہ نگار تھے مگر میرے لئے صرف افسانہ تھے۔ حالاں کہ وہ میرے بڑے بھائی تھے۔ وہ پڑوسی ملک کے شہر کراچی میں رہتے تھے مگر لگتا تھا کہ وہ لاکھوں، کروڑوں میل دُور ہیں۔ وہ مجھ سے بارہ، تیرہ برس بڑے تھے لیکن لگتا تھا وہ کافی عمر رَسیدہ ہو گئے ہیں۔ حالاں کہ اُن کی عمر ۵۴/برس سے زیادہ نہیں تھی۔ حقیقت جب افسانہ بن جاتی ہے، فاصلے جب پھیل جاتے ہیں، عمریں جب دھوکہ دینے لگتی ہیں تو دو بھائیوں کے رشتے کتنے بے بس، مجبور اور بے معنی ہو جاتے ہیں۔''

(آدمی نامہ، مجتبیٰ حسین، ص/۷۱، ۱۹۸۱ء)

مجتبیٰ حسین نے ''آدمی نامہ'' میں آٹھواں خاکہ ''فکرؔ تونسوی.....بھیڑ کا آدمی'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

''یہ جو حضرتِ فکرؔ تونسوی اُردو کے بڑے طنز نگار بنے پھرتے ہیں، دنیا کے بے وقوف ترین آدمی ہیں۔ اِن کی ذاتِ بابرکات کا جتنا مذاق اُڑایا جا سکتا ہے، اتنا شاید ہی کس کا اُڑایا جا سکے۔ یہ اتنے بڑے طنز نگار ہیں مگر چھوٹی سے چھوٹی بات پر اتنے خوش ہوں گے کہ دیکھنے والا افسوس کرنے لگ جائے۔ ایک بار میرے ساتھ بَس اِسٹاپ پر بَس کا انتظار کر رہے تھے۔ ابھی انتظار کے دو سیکنڈ بھی نہ گزرے تھے کہ بَس آ گئی اور اتفاق سے خالی آ گئی۔ اب اِس بات پر جو فکرؔ تونسوی خوش ہوئے تو بس خوش ہوتے ہی چلے گئے۔ بار بار کہتے ''بھئی! کمال ہے، آج ہمیں اتنی آسانی سے بَس مل گئی''۔ بچوں کی طرح تالیاں بجاتے ہوئے وہ بَس میں داخل تو ہوئے ہی تھے مگر جب بَس سے اُترنے لگے.....تب بھی تالیاں بج رہی تھیں۔''

(آدمی نامہ، مجتبیٰ حسین، ص/۸۶، ۱۹۸۱ء)

مجتبیٰ حسین نے ''آدمی نامہ'' میں نَو اں خاکہ ''عمیق حنفی.....آدمی دَر آدمی'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

''مجھے اِن تین برسوں میں عمیق حنفی کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کا موقع ملا۔ عمیق حنفی اصل میں کئی اچھے، بُرے عمیق حنفیوں کے مجموعے کا نام ہے۔ ''شاعر عمیق حنفی، تاریخ داں عمیق حنفی، فلسفہ شناس عمیق حنفی، ناقد عمیق حنفی، ریڈیو فیچر نگار عمیق حنفی، ہندی اور سنسکرت کے ماہر عمیق حنفی، مذہب پرست عمیق حنفی، سیکولر عمیق حنفی، مُنہ پھَٹ عمیق حنفی، مقروض عمیق حنفی، پریشان حال عمیق حنفی، عجیب عمیق حنفی، غریب عمیق حنفی''۔ جس شخص کی ذات میں اِتنے سارے عمیق حنفی ہوں، اُس سے ملتے ہوئے عموماً بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ مَیں ''شاعر عمیق حنفی'' سے ملنے گیا تو دیکھا کہ ''مقروض عمیق حنفی'' بیٹھے ہیں۔ کبھی ''ناقد عمیق حنفی'' سے ملنے کے ارداہ سے نکلا اور ملاقات ہوئی ''مذہب پرست عمیق حنفی'' سے۔''

(آدمی نامہ، مجتبیٰ حسین، ص ۱۰۲/۳، ۱۹۸۱ء)

مجتبیٰ حسین نے ''آدمی نامہ'' میں دَسواں خاکہ ''رضا نقوی واہی.....منظوم آدمی'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

''۱۹۶۸ء کے اَوائل میں اُن کا پہلا منظوم خط ہمیں ملا تھا۔ اُس خط کو پا کر ہم کئی دن پریشان رہے کہ اُنہیں کیسے جواب دیں؟ کیوں کہ ہم ہمیشہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے عادی رہے ہیں اور یہاں ہمارا یہ حال تھا کہ ''نہ ردیف کی خبر ہے نہ قافیہ معلوم''۔ ایک دوست کے ذریعہ زبانی پیغام اُن تک پہنچایا کہ اگر طبعِ نازک پر گراں نہ گزرے تو ہمیں نثر میں جواب دینے کی اجازت دی جائے۔ ہم نے کہلوایا کہ آدمی کو کبھی کبھی نثر بھی لکھنی چاہیے۔ یوں اچھی بھلی زندگی کو آغا حشر کاشمیری کا ڈرامہ بنانے کا کیا فائدہ؟''

(آدمی نامہ، مجتبیٰ حسین، ص ۱۵/-۱۱۴، ۱۹۸۱ء)

مجتبیٰ حسین نے ''آدمی نامہ'' میں گیارہواں خاکہ ''خواجہ عبدالغفور.....لطیفوں کا آدمی'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

''مَیں مسلسل اِس نکتہ پر غور کرتا رہا کہ خواجہ عبدالغفور صاحب آخر کس طرح لطیفے کہتے ہوں گے اور اُن پر کس طرح ہنستے ہوں گے؟ میں نے سوچا کہ وہ لوگوں کو اپنے لطیفوں سے زیادہ اپنی کمشنری کے بَل بُوتے پر ہنساتے ہوں گے۔ حکم دیا کہ ہنسو! اور لوگ ہنسنے لگے۔ مجھے وہ لطیفہ بھی یاد آیا کہ کوریا کی جنگ کے زمانے میں ایک امریکی جنرل کوریا کے سپاہیوں کے سامنے تقریر کر رہا تھا اور ایک مترجم اُس کی انگریزی تقریر کا کوریائی زبان میں ترجمہ کر رہا تھا.....جنرل نے ایک طویل لطیفہ سنایا اور اُس کے بعد مترجم نے اُس طویل لطیفہ کے سلسلے میں صرف ایک جملہ کہا اور سارے کوریائی سپاہی پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگے۔ امریکی جنرل بہت حیران ہوا۔ اُس نے مترجم سے پوچھا: بھئی! تم نے ایک جملہ میں اتنے طویل لطیفہ کا ترجمہ کیسے کر دیا؟ اِس پر مترجم بولا: حضور! میں نے لطیفہ کا ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ میں نے سپاہیوں سے یہ کہا ہے کہ ابھی ابھی جنرل صاحب

نے ایک لطیفہ سنایا ہے۔ لہٰذا تم لوگ زور زور سے ہنسنے لگ جاؤ! عہدے داری چیز ہی ایسی ہوتی ہے کہ آدمی کو مارے خوف کے ہنسنا ہی پڑتا ہے۔''

(آدمی نامہ، مجتبیٰ حسین، ص ر۲۷-۱۲۶، ۱۹۸۱ء)

مجتبیٰ حسین نے ''آدمی نامہ'' میں بارہواں خاکہ ''حسن الدین احمد..... لفظوں کا آدمی'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

''وہ ہر تھوڑی دیر بعد موضوع کو ''الفاظ شماری'' کی طرف موڑ کر لے آتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اُونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے، یہ کوئی بتلا نہیں سکتا لیکن اُن دنوں ''حسن الدین صاحب'' کی بات چیت کا اُونٹ ہمیشہ ہی ''الفاظ شماری'' کی کروٹ میں بیٹھتا تھا۔ یہ بات اُن کی فطرت کے اِس پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جب وہ ایک کام میں لگ جاتے ہیں تو سدا اُسی کی دُھن میں لگے رہتے ہیں اور جب تک اُسے پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچا لیتے، تب تک اُنہیں قرار نہیں آتا۔ اپنے کام میں اِس بُری طرح غرق ہونے والے انسان مَیں نے بہت کم دیکھے ہیں۔''

(آدمی نامہ، مجتبیٰ حسین، ص ر۱۳۹، ۱۹۸۱ء)

مجتبیٰ حسین نے ''آدمی نامہ'' میں تیرہواں خاکہ ''نریندر لُوتھر..... شیشے کا آدمی'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

''لُوتھر صاحب نے اپنے ایک اور مضمون میں لکھا ہے کہ بڑے عہدے دار کُتّے کو صرف اِسی لئے پالتے ہیں کہ وہ اُنہیں بھونکنا سکھا سکے۔ اِس معاملہ میں میری رائے یہ ہے کہ لُوتھر صاحب اپنے کُتّے سے کم سیکھتے ہیں اور کُتّا اُن سے زیادہ سیکھتا ہے۔ ایک بار جب میں اُن کے گھر گیا تو دیکھا کہ اُن کا کُتّا ایک درخت کے نیچے لیٹا بکری کی طرح جُگالی کر رہا ہے۔ مَیں کُتّوں سے بہت گھبراتا ہوں۔ اُسے دیکھ کر واپس جانا چاہتا تھا کہ لُوتھر صاحب کے ملازم نے کہا صاحب! اِس کُتّے سے نہ ڈریے۔ یہ کُتّا تو بالکل گدھا ہے۔ نہ بھونکتا ہے، نہ کاٹتا ہے، ایسا اَہنسا وادی کُتّا آپ کو کہیں نہیں ملے گا، یہ چوکی داری نہیں کرتا بلکہ صرف افسری کرتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چوکی داری کا کام بھی نہ صرف مجھی کو کرنا پڑتا ہے بلکہ ہنگامی حالات میں دُم بھی ہلانی پڑتی ہے۔''

(آدمی نامہ، مجتبیٰ حسین، ص ر۱۶۱، ۱۹۸۱ء)

مجتبیٰ حسین نے ''آدمی نامہ'' میں چودہواں خاکہ ''باقؔی..... وآدمیوں کا آدمی'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

''باقؔی اُن دنوں چھوٹی بحر کا مصرع بَن گئے تھے۔ ہاتھ میں ایک چھڑی بھی آگئی تھی جو اِس مصرع کو وَزن سے گرنے نہیں دیتی تھی۔ چھڑی کیا تھی، اچھی خاصی ضرورتِ شعری تھی۔ اُس وقت باقؔی کے حسابِ رنگ میں ایک ہی رنگ جڑا ہوا تھا، اور وہ تھا زَرد رنگ۔ یوں لگتا تھا جیسے باقؔی نہیں بلکہ ہلدی کی گانٹھ ہیں...... اُردو غزل میں مقطع کی اِیجاد صرف اِس لئے ہوئی تھی کہ شاعر اُس میں حسبِ اِستطاعت اپنی تعریف وتوصیف

کر سکے لیکن باقؔی اپنی تعریف کے لئے مقطع کو نا کافی سمجھتے.....اِسی لئے وہ عام نثری بات چیت میں بھی ہر دَم مقطع ہی کہتے رہتے ہیں۔''

(آدمی نامہ، مجتبیٰ حسین، ص/۷۳-۱۷۲، ۱۹۸۱ء)

مجتبیٰ حسین نے ''آدمی نامہ'' میں پندرَ ہواں خاکہ ''مخمورؔ سعیدی..... بہ حیثیتِ مجموعی آدمی'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مَیں مخمورؔ کے ماضی سے واقف نہیں ہوں۔ سنا ہے کہ ٹونک میں اُن کے گھر پر ہاتھی جھوما کرتے تھے۔ اب اُن کے اشعار پر سامعین جھوما کرتے ہیں مگر مخمورؔ کو ہاتھی اور سامعین کے فرق کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے، کیوں کہ ہاتھی سوچ سمجھ کر جھومتا ہے اور سامعین سوچے سمجھے بغیر ہی جھومتے ہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ وہ کسی زمانے میں ایک ہوٹل کے منیجر بھی تھے مگر مجھے یقین ہے کہ وہ ہوٹل کا کاروبار بھی کتاب کے اِسٹال کی طرح ہی چلاتے ہوں گے، اکیلے اکیلے ہی بیٹھے، اپنے ہی ہوٹل میں رکھی ہوئی چیزیں کھا کھا کر۔''

(آدمی نامہ، مجتبیٰ حسین، ص/۱۸۶، ۱۹۸۱ء)

06.08 خلاصہ

مجتبیٰ حسین ''ریاستِ کرناٹک'' کے ضلع ''گلبرگہ'' کی تحصیل ''چنچولی'' میں مولوی احمد حسین کے یہاں ۱۵/جولائی ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ مجتبیٰ حسین کی والدہ کا نام ''اَمیر النسا بیگم'' تھا۔ اُن کے بھائیوں میں محبوب حسین جگرؔ، عابد حسین، ابراہیم جلیسؔ، یوسف حسین اور سرتاج حسین وغیرہ تھے۔ مجتبیٰ حسین کی شادی ۱۲/نومبر ۱۹۵۶ء میں اُن کی چچازاد بہن ''ناصرہ رئیس بیگم'' سے ہوئی۔ مجتبیٰ حسین نے ابتدائی تعلیم اپنے والد مولوی احمد حسین کی نگرانی میں گھر ہی پر حاصل کی۔ اُس کے بعد پہلی، دوسری اور تیسری جماعت کے بجائے سیدھا چوتھی جماعت میں گلبرگہ کے ''مدرسہ تحتانیہ، آصف گنج'' میں داخلہ لیا۔ اُس کے علاوہ ضلع عثمان آباد میں بھی کچھ عرصہ زیرِ تعلیم رہے۔ اُس کے بعد ۱۹۵۱ء میں ''گورنمنٹ ہائی اسکول، تانڈور'' سے ''میٹرک'' کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۵۳ء میں ''انٹرمیڈیٹ کالج، گلبرگہ'' سے ''انٹرمیڈیٹ آرٹس'' کا امتحان پاس کیا۔ پھر عثمانیہ یونی وَرسٹی، حیدرآباد میں ''گریجویشن'' میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۵ء میں گریجویشن مکمل کیا۔ اُس کے بعد ۱۹۵۸ء میں عثمانیہ یونی وَرسٹی، حیدرآباد ہی سے ''ڈپلومہ اِن پبلک اِیڈمنسٹریشن'' میں امتیازی نمبرات کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔

مجتبیٰ حسین نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا اور صحافت کے میدان میں اُن کی تربیت اُن کے بڑے بھائی محبوب حسین جگرؔ نے کی۔ مجتبیٰ حسین ایک صحافی کی حیثیت سے ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۲ء تک تقریباً سات سال ''روزنامہ سیاست'' سے منسلک رہے اور اپنے کام کو بہ خوبی انجام دیتے رہے۔ مجتبیٰ حسین ''روزنامہ سیاست'' کے کالم ''شیشہ و تیشہ'' میں ''کوہ پیما'' کے فرضی نام سے لکھتے تھے۔ ۱۹۶۴ء میں اُنہوں نے اپنے اصلی نام سے اپنا پہلا مزاحیہ مضمون ''ہم طرف دار ہیں غالبؔ کے، سخن فہم نہیں'' کے نام سے لکھا۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۲ء تک محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ حکومتِ آندھرا پردیش سے وابستہ رہے۔ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۴ء تک حکومتِ ہند کی طرف سے گجرال کمیٹی کے شعبۂ ریسرچ، گجرال کمیٹی، دہلی میں خدمات انجام دیں۔ مختلف عہدوں پر فائز ہوئے اور ۱۹۹۲ء میں ریٹائر ہوگئے۔ مجتبیٰ حسین نے بہت ساری کتابیں لکھیں جن پر اُن کو کئی سارے انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔ مجتبیٰ حسین نے مختلف ممالک جیسے جاپان، امریکہ، برطانیہ، فرانس، کنیڈا، روس اور پاکستان وغیرہ کے سفر کیے۔ مجتبیٰ حسین کا انتقال ۲۷/مئی ۲۰۲۰ء میں حیدرآباد میں ہوا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۰﴾ مجتبیٰ حسین کو ''میر تقی میر ایوارڈ'' کب دیا گیا؟

﴿۱۱﴾ مجتبیٰ حسین کو ''غالب ایوارڈ'' کب دیا گیا؟

﴿۱۲﴾ مجتبیٰ حسین کی کس کتاب کا جاپانی زبان میں ترجمہ کیا گیا؟

06.09 فرہنگ

اَشخاص	:	شخص کی جمع، لوگ	گَرتَب	:	کھیل
بُوتا	:	بَل، طاقت	کم مائیگی	:	ناداری
بےتحاشہ	:	بےروک ٹوک	کندہ	:	لکھا ہوا
بےتکلف	:	آزادانہ	کھنڈر	:	ویران مکان
تخلیقات	:	تخلیق کی جمع، تصنیفات	گراں	:	بھاری
تصنع	:	بناوٹ	لطف اَندوزی	:	لذت حاصل کرنا
جلدبَندی	:	کتاب کی جلدیں بنانے کا کام	متعدد	:	کئی
حافظہ	:	یادداشت	متنوع	:	قسم قسم کا
حفظِ ماتقدم	:	پیشگی حفاظت کا بندوبست	مداح	:	ثناخواں
خفی	:	پوشیدہ	مشغلہ	:	کام
داغ بیل	:	بنیاد	مُصِر	:	ضد پر اَڑ جانا
رِحل	:	وہ لکڑی جس پر قرآن رکھ کر پڑھا جاتا ہے	مقلد	:	پیروکار
رَسیا	:	شیدائی	مکرَّر	:	دوبارہ
سَٹپٹانا	:	گھبرانا	ملحوظ	:	پیشِ نظر
سرمایہ	:	پُونجی	ممالک	:	مُلک کی جمع، کئی مُلک
سنگم	:	مجموعہ، ملاپ	منسلک	:	وابستہ
طبعِ نازک	:	نازک طبیعت	نقش ونگار	:	بیل، بُوٹے
علالت	:	بیماری	ہم آہنگی	:	مطابقت

06.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : مجتبیٰ حسین کے مختصر حالاتِ زندگی بیان کیجیے؟

سوال نمبر۲ : کتاب ''آدمی نامہ'' میں کتنے خاکے ہیں؟ بیان کیجیے؟

سوال نمبر۳ : مجتبیٰ حسین کی خاکا نگاری کے زبان اور اسلوب کا جائزہ کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : مجتبیٰ حسین کے خاندانی حالات تفصیل سے لکھیے؟

سوال نمبر۲ : مجتبیٰ حسین کی تعلیمی زندگی کے بارے میں تفصیل سے لکھیے؟

سوال نمبر۳ : ''آدمی نامہ'' کی روشنی میں مجتبیٰ حسین کے اُسلوب کا جائزہ لیجیے؟

06.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ آدمی نامہ	از	مجتبیٰ حسین
۲۔ اُردو ادب میں خاکہ نگاری	از	ڈاکٹر صابرہ سعید
۳۔ چہرہ در چہرہ	از	مجتبیٰ حسین
۴۔ قصہ مختصر	از	مجتبیٰ حسین
۵۔ قطعِ کلام	از	مجتبیٰ حسین
۶۔ مہرباں کیسے کیسے	از	مجتبیٰ حسین
۷۔ ہوئے ہم دوست جس کے	از	مجتبیٰ حسین

06.12 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ مجتبیٰ حسین کی پیدائش ۱۵/جولائی ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔

﴿۲﴾ مجتبیٰ حسین کے والد کا نام ''مولوی احمد حسین'' تھا۔

﴿۳﴾ مجتبیٰ حسین کی والدہ کا نام ''اَمیر النسا بیگم'' تھا۔

﴿۴﴾ ''چہرہ در چہرہ'' مجتبیٰ حسین کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔

﴿۵﴾ ''قطعِ تعلق'' مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔

﴿۶﴾ مجتبیٰ حسین کو ''پدم شری ایوارڈ'' ۲۰۰۷ء میں دیا گیا۔

﴿۷﴾ ''سو ہے وہ بھی آدمی'' مجتبیٰ حسین کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔

﴿۸﴾ ''مہرباں کیسے کیسے'' خاکوں کا مجموعہ ہے۔

﴿۹﴾ ''ہوئے ہم دوست جس کے'' ۱۹۹۹ء میں لکھا گیا۔

﴿۱۰﴾ مجتبیٰ حسین کو ''میر تقی میر ایوارڈ'' ۲۰۰۶ء میں دیا گیا۔

﴿۱۱﴾ مجتبیٰ حسین کو ''غالب ایوارڈ'' ۱۹۹۴ء میں دیا گیا۔

﴿۱۲﴾ مجتبیٰ حسین کی کتاب ''جاپان چلو، جاپان چلو'' کا جاپانی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔

بلاک نمبر 02

اکائی 07	سوانح نگاری کا فن	محمد افضل حُسین
اکائی 08	اُردو میں سوانح نگاری کی روایت	ڈاکٹر شریف احمد قریشی
اکائی 09	حالؔی : یادگارِ غالبؔ	ڈاکٹر سید محمود کاظمی
اکائی 10	یادگارِ غالب کی سوانحی خصوصیات	محمد سالم
اکائی 11	یادگارِ حالؔی : صالحہ عابد حسین	ڈاکٹر اختر علی
اکائی 12	یادوں کی برات: جوشؔ ملیح آبادی	ڈاکٹر دبیر احمد

اکائی 07 : سوانح نگاری کا فن

ساخت

07.01 : اغراض ومقاصد

07.02 : تمہید

07.03 : سوانح نگاری کا فن

07.04 : سوانح نگاری کی تعریف

07.05 : سوانح نگاری کے اُصول وضوابط

07.06 : اردو کی چند مشہور سوانح عمریاں

07.07 : خلاصہ

07.08 : فرہنگ

07.09 : نمونہ امتحانی سوالات

07.10 : حوالہ جاتی کتب

07.01 اغراض ومقاصد

اُردو نثر کی تمام اَصناف کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا اَفسانوی اَدب ہے جس کے تحت اُن اَصنافِ نثر کو شامل کیا گیا ہے جن کی بنیاد قصہ یا کہانی پر قائم ہے جیسے داستان، ناول، اَفسانہ، اور ڈراما وغیرہ۔ دوسرا غیر اَفسانوی اَدب ہے جس کے تحت اُن اَصنافِ نثر کو شامل کیا گیا ہے جن کی بنیاد قصہ یا کہانی پر قائم نہیں ہے جیسے خاکہ، اِنشائیہ، آپ بیتی، سفرنامہ، رپورتاژ اور سوانحِ عمری وغیرہ۔

07.02 تمہید

سوانح نگاری کے لئے سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ سوانح نگار اپنے موضوع سے متعلق تمام ضروری معلومات کی تحقیق کر کے اُن کو ایک جگہ جمع کر لے اَور اُنہیں تنقید کے پیمانے پر جانچ کر اِس ترتیب سے پیش کرے کہ صاحبِ سوانح کی پیدائش سے لے کر موت تک کے تمام اہم واقعات اور نمایاں کارنامے قارئین کی نگاہوں کے سامنے آ جائیں۔

07.03 سوانح نگاری کا فن

لفظ ''سوانح'' عربی زبان کے لفظ ''سانحہ'' کی جمع ہے جس کا لغوی معنی ''حادثات، واقعات، حالاتِ زندگی، اور سَرگذشت'' وغیرہ ہے۔ اصطلاحی اعتبار سے سوانح کا مطلب ہے ''کسی شخص کے حالاتِ زندگی کا بیان جس میں اُس شخص کی زندگی کے تلخ وشیریں واقعات و حادثات کے بیان کے ساتھ ساتھ اُس شخص کی شخصیت اور سیرت کے اچھے اور برے پہلو کا بھی ذِکر ہو۔ اِس کے علاوہ اپنی زندگی میں اُس شخص

نے جو کارنامے انجام دیے ہیں، اُنہیں سوانح میں پیش کیا جائے تا کہ قارئین اُس شخص کی سوانح کا مطالعہ کر کے اُس کی سیرت و شخصیت اور اُس کی کام یابی و ناکامی سے واقفیت حاصل کر سکیں۔

07.04 سوانح نگاری کی تعریف

ماہرینِ اَدب نے سوانح نگاری کی مختلف تعریفات بیان کی ہیں۔

اِنسائیکلوپیڈ میں سوانح نگاری کی تعریف اِن الفاظ میں درج ہے:

''سوانح نگاری ایک ایسا بیانیہ ہے جو کسی فرد کی زندگی اور شخصیت کی باز آفرینی اور اُس کے عمل کو شعوری اور فن کارانہ اَنداز میں قلم بند کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ سوانح نگاری کسی شخص کی حقیقی زندگی کا حساب و کتاب ہے۔''

اِس تعریف میں جن اہم نکات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ درجِ ذیل ہیں:

﴿۱﴾ سوانح نگاری ایک ایسا فن ہے جس کا تعلق براہِ راست تاریخ نگاری سے ہے۔

﴿۲﴾ سوانح نگاری دَر حقیقت تاریخ کی ایک شاخ ہے۔ اِس لئے تاریخ نویسی کی طرح سوانح نگاری میں بھی غیر جانب داری، صداقت اور دیانت داری ضروری ہے۔

﴿۳﴾ سوانح نگار کو اَدبی اور فنی اَقدار کا لحاظ رکھنا چاہیے تا کہ سوانح نگاری کا اَدبی حُسن مجروح نہ ہو۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی سوانح نگاری کی اَہمیت و اِفادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کسی بھی بڑے انسان کی سوانحِ عمری تنہا اُس کی سوانحِ عمری نہیں ہوتی۔ اُس کا ماحول اور اُس کے ماحول سے وابستہ بہت سے اَفراد اور اَشخاص بھی اپنے ذہن اور زندگی کے اعتبار سے اُس میں شریک ہوتے ہیں۔''

شمس الرحمٰن فاروقی سوانح نگاری کی اَہمیت کا اِعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سوانحِ عمری صاحبِ سوانح کی شخصیت کے تمام اَہم پہلوؤں کے بارے میں ہماری معلومات میں اضافہ کرتی ہے اور صاحبِ سوانح کے ذہنی اِرتقا کو سمجھنے میں ہماری معاون ہوتی ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کوئی ایک سوانحِ حیات صاحبِ سوانح کی مکمل ذہنی اور تاریخی تصویر پیش کر سکتی ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ اچھی سوانحِ عمری ہمیں صاحبِ سوانح سے اِس قدر قریب کر دیتی ہے کہ اتنی قربت شاید ذاتی ملاقاتوں سے نہ حاصل ہو۔''

ڈاکٹر گیان چند جین سوانح نگاری کی ضخامت کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اِس میں کسی شخص کے حالاتِ زندگی اور شخصیت کے بارے میں لکھا جاتا ہے۔ یہ ایک مختصر مضمون بھی ہو سکتا ہے، پوری کتاب بھی۔''

ڈاکٹر عبدالقیوم سوانح نگاری کے تاریخی اور اَدبی پہلو کا اعتراف کرتے ہوئے اُس کی خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سوانح، تاریخ کی ایک شاخ ہے لیکن بعض خصوصیات کی وجہ سے اس کا شمار اَدب میں بھی کیا جاتا ہے۔ اب سوانح محض انسان کی پیدائش، خاندان، تعلیم، مشاغلِ زندگی اور وفات کا ہی بیان نہیں بلکہ فرد کے ظاہر و باطن، عادات واَطوار، اَخلاق و معاشرت، وراثت ونفسیاتی کیفیت اور اُس کی زندگی کے نشیب وفراز کی داستان بن گئی ہے۔''

ڈاکٹر الطاف فاطمہ سوانح نگاری کے بارے میں لکھتی ہیں:

''سوانح نگاری کسی فردِ واحد کی شخصیت کو منظرِ عام پر اِس طرح لانے کا نام ہے کہ اُس کی فطرت اور سیرت کا کوئی پہلو پوشیدہ نہ رہے۔''

مذکورہ بالا تعریفات کا مطالعہ کر کے ہم سوانح نگاری کی تعریف اِس طرح متعین کر سکتے ہیں کہ دنیا کے کسی بھی خطے میں جنم لینے والے انسان پر اُس سماج میں رائج تہذیبی، سماجی، اور مذہبی رُسوم ورواج کا جو اَثر پڑتا ہے، جس قسم کے ماحول میں اُس کی تربیت ہوتی ہے اور اُس کا شعور پروان چڑھتا ہے، اُس کی سیرت وشخصیت ایک خاص سانچے میں ڈھلتی ہے جس کے زیرِ اَثر وہ شخص اپنی زندگی میں کام یابیوں اور ناکامیوں سے ہم کنار ہوتا ہے۔ سوانح نگار ان تمام حالات کو تاریخی ترتیب سے واقعات کی صحت کے ساتھ اَدبی پیرائے میں بیان کرتا ہے تاکہ اُس شخص کے ظاہر و باطن کی پوری تصویر قارئین کی نگاہوں کے سامنے آجائے۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ سوانح نگاری کسی شخص کی پیدائش سے لے کر موت تک کے حالات وواقعات کی ایک مکمل اَور مستند دَستاویز ہے۔

07.05 سوانح نگاری کے اُصول وضوابط

سوانح نگاری کا مطلب کسی شخص کی زندگی میں پیش آنے والے حادثات وواقعات اور اُس کی کام یابیوں وناکامیوں کا تفصیلی بیان ہی نہیں ہے بلکہ سوانح نگاری کا اَدب سے گہرا تعلق ہے، لہٰذا سوانح نگاری ایک تخلیقی عمل ہے۔ سوانح نگاری تخلیقی عناصر کی کارفرمائی، جمالیاتی حُسن کی آمیزش اور اَدبی اَقدار کی شمولیت کی وجہ سے اَدب کا ایک اَہم جزو ہے۔ سوانح نگاری چوں کہ اصنافِ ادب میں ایک اہم صنف کی حیثیت رکھتی ہے، لہٰذا سوانح نگاری میں فن اور اَدب کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا بے حد ضروری ہے۔ ماہرینِ اَدب نے سوانح نگاری کی اَدبی حیثیت و اَہمیت کا تعین کرنے کے لئے تین عناصر کی نشان دہی کی ہے:

﴿۱﴾موضوع ﴿۲﴾مواد ﴿۳﴾اُسلوب

سوانح نگاری ایک تخلیقی عمل ہے لیکن دیگر ادبی اصناف کے برعکس یہ عمل شعوری ہے۔ کیوں کہ سوانح نگار کو غور وفکر کے بعد موضوع کا انتخاب کرنا پڑتا ہے اَور اُس کے متعلق مواد تک رسائی حاصل کر کے اُسے جمع کرنا پڑتا ہے۔ پھر اُس مواد کو تحقیقی وتاریخی اُصول وضوابط پر پرکھ کر واقعات کو منطقی ترتیب میں اَدبی فن کو ملحوظ رکھتے ہوئے پرونا پڑتا ہے۔ غرض یہ کہ موضوع کے انتخاب سے لے کر مواد کی فراہمی اور اُسے منظّم اَنداز میں پیش کرنے تک تحقیق وتنقید اور تخلیق کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ سوانح نگاری میں اَدبی حُسن ہوتا ہے مگر سوانح نگاری اور

دیگر اصنافِ ادب میں اچھا خاصا فرق ہے۔ کیوں کہ سوانح نگاری بہ ہر حال جذبات واحساسات اور مشاہدات ونظریات کا خالص اَدبی بیان نہیں بلکہ اُس بیان میں تنقید وتحقیق کا عنصر اُسے دیگر اصنافِ ادب سے ایک الگ شناخت عطا کرتا ہے۔ چنانچہ ہم کہ سکتے ہیں کہ سوانح نگاری کا اَدبی حُسن تحقیق وتنقید کی آمیزش سے تشکیل پاتا ہے۔

دَراصل انسانی زندگی پیدائش سے موت تک کے واقعات کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ زندگی میں رُونما ہونے والے ہر واقعے کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ ہر واقعہ ہمارے لئے خوشی یا رنج کا باعث ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ انسانی زندگی کا حُسن، اُمنگ، آرزو یا اُداسی ان واقعات کی ہی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ لیکن سوانح نگاری کے نقطۂ نظر سے تمام واقعات اہم نہیں ہوتے۔ سوانح نگار کو واقعات کے ڈھیر کو کھنگالنا پڑتا ہے اور ایسے واقعات کا انتخاب کرنا پڑتا ہے جن سے صاحب سوانح کی شخصیت اور سیرت پر روشنی پڑ سکے۔ واقعات کے ڈھیر میں وہ واقعات بہت اہم ہوتے ہیں جو انسان کی زندگی میں تبدیلیاں لاتے ہیں اور زندگی کو ایک نئی سمت عطا کرتے ہیں۔ سوانح نگار کے لئے وہی واقعات اہم ہیں جن سے صاحب سوانح کی شخصیت کے خدوخال واضح طور پر اُبھر سکیں۔ چاہے وہ واقعات عام نقطۂ نظر سے کتنے غیر اہم کیوں نہ ہوں۔ چوں کہ سوانح عمری کسی شخص کی زندگی اور اس کے کارناموں کی بازیافت کا عمل ہے۔ لہٰذا محض واقعات کا بیان ہی فنی اعتبار سے کافی نہیں ہوتا۔ دراصل واقعات کی تحقیق، ان کی کتر بیونت یا کانٹ چھانٹ سوانح نگاری کے فن کا اہم مسئلہ ہے۔

انسان کی اپنے سماجی وتہذیبی اقدار وروایات سے جو ٹکراؤ ہوتا ہے، سوانح نگاری میں اس کا بھر پور اظہار ہونا چاہیے۔ کیوں کہ اس کے بغیر کسی انسان کی شخصیت پہ مکمل روشنی نہیں پڑتی۔ اس کے علاوہ سوانح نگار کو ان تمام عناصر پر توجّہ دینی چاہیے جن کی مدد سے شخصیت کی تعمیر اور تکمیل کے سامان فراہم ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں خارجی حالات کے ساتھ ساتھ صاحب سوانح کی نفسیاتی اور ذہنی کیفیت کا تجزیہ بہت ضروری ہے۔ انسانی شخصیت اکہری نہیں ہوتی بلکہ اس کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ تمام انسانی خوبیوں اور خامیوں یا اچھائیوں اور برائیوں کا پیکر ہوتے ہیں۔ چنانچہ سوانح نگاری میں انسانی شخصیت کے کمزور پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالنی چاہیے جن سے انسان کی زندگی پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ سوانح نگار کو علم نفسیات کے اصولوں کو بہ رُوے کار لا کر صاحب سوانح کی ذہنی اور اور نفسیاتی کیفیت تک رسائی حاصل کر کے اس کے باطن کے پیچ وخم کا سراغ لگانا چاہیے۔ پھر جو نتیجہ برآمد ہو اسے بے کم وکاست و بے باکی اور دیانت داری سے بیان کر دینا چاہیے۔ یک رُخی سوانح عمری جس میں صرف مدّاحی ہو فنی اعتبار سے کمزور ہوتی ہے۔ سوانح نگار کی صاحب سوانح سے کسی قسم کی قربت یا تعلق سوانح نگاری کے راستے کی ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ صاحب سوانح کے تئیں عقیدت واحترام کا جذبہ اس کی ذات کے اس پہلو کو ہمیشہ نظر انداز کر دیتا ہے جو شخصیت کا کمزور پہلو ہوتا ہے۔ سوانح عمری میں شخصیت کے کسی پہلو کو بھی، خواہ وہ کتنا ہی کمزور ہو، بر بنائے مصلحت عوام کی نگاہ سے پوشیدہ رکھنا انتہائی نامناسب ہے۔ کیوں کہ تصویر کو اصل سے زیادہ حسین بنانا یا اس کو زیادہ بدصورت بنا دینے کا عمل فنّی دیانت داری کے اصولوں کی خلاف ورزی ہے۔ ڈاکٹر جانسن کے مطابق سوانح نگار کو صداقت، وضاحت اور نفسیاتی کیفیت پر توجّہ دینی چاہیے۔

جو لوگ عقیدت واحترام یا کسی قسم کے اختلاف کے سبب صداقت سے گریزاں ہوتے ہیں وہ یقیناً غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ در حقیقت صداقت ہی وہ عنصر ہے جو سوانح نگاری میں سوانح نگار کو ہر قسم کے الزام سے بچا لیتا ہے۔ اور اگر یہ عنصر سوانح عمری میں موجود نہ ہو تو ایسی سوانح عمری کا ہونا یا نہ ہونا ایک جیسا ہے۔ سوانح نگار کو صاحب سوانح کی زندگی کے واقعات کا تجزیہ کر کے نتیجہ نکالنے کا حق حاصل ہے لیکن

ان نتائج کی بنیاد پر اسے شخصیت و کردار کے متعلق کسی قسم کا فیصلہ صادر کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اچھا سوانح نگار اپنی مرضی سے تصویر نہیں بناتا بلکہ صاحب سوانح کی مکمل تصویر اس کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ قارئین کے پیش کر دیتا ہے۔ سوانح نگار کے پیشِ نظر صرف یہ مقصد ہوتا ہے کہ سوانح عمری میں ایسی فضا پیدا کی جائے کہ صاحب سوانح کی زندگی کا ارتقا اور اس کا نشیب و فراز واضح طور پر سامنے آسکیں۔

غرض کہ سوانح عمری میں صداقت اور دیانت داری کی بے حد اہمیت ہے۔ اس کے ساتھ ہی خشک و بے رنگ واقعات میں دل چسپی پیدا کرنے کے لئے بیان اور اسلوب میں شگفتگی اور ندرت ضروری ہے جس کا تعلق براہ راست فن ادب سے ہے۔ ادبی حُسن سوانح عمری میں دل کشی اور دل چسپی پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ سوانح عمری میں تاریخی، فرد کی سیرت و شخصیت اور ادب کی چاشنی، چاروں عناصر کی آمیزش سے ایک عمدہ مرکب تیار کیا جاتا ہے۔ لیکن سوانح نگاری میں سوانح نگار کا اسلوب تخیلاتی نہیں ہوتا بلکہ اس کے اسلوب میں زندگی کے واقعات، بیان کی تازگی اور شگفتگی سے ہم آمیز ہوتا ہے۔ سوانح نگار کا اسلوب مہذب و شائستہ ہونا چاہیے۔ کیوں کہ اسلوب کی شوخی بے احتیاطی کو جنم دے کر سوانح عمری کے معیار اور صاحب سوانح کے وقار کو مجروح کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔

07.06 اردو کی چند مشہور سوانح عمریاں

سوانح نگاری نے اپنی کم عمری کے باوجود ایسے سوانح نگاروں کو جنم دیا ہے جن کی مثالیں آج بھی دنیا دیتی ہے۔ ان ہی سوانح نگاروں میں الطاف حسین حالؔی، مولانا شبلی نعمانی، سیّد سلیمان ندوی، حبیب الرّحمٰن خاں شیروانی، مولوی اکرام اللہ بدوی، رئیس احمد جعفری، غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام، قاضی عبدالغفار، صالحہ عابد حسین، مولانا عبدالماجد دریابادی اور جوشؔ ملیح آبادی وغیرہ احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

اردو زبان و ادب میں سوانح نگاری کے اوّلین نقوش دکنی مثنویوں میں دَست یاب ہیں۔ اس کے بعد محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' اور سرسید احمد خان کی تصنیف ''خطباتِ احمدیہ'' کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ مذکورہ کتابوں میں سوانح نگاری کے اوّلین نقوش واضح ہیں۔ اردو میں الطاف حسین حالؔی پہلے ادیب و شاعر ہیں جنہوں نے باضابطہ سوانح نگاری کا آغاز کیا۔ اُنہوں نے ''حیاتِ سعدی''، ''یادگارِ غالب'' اور ''حیاتِ جاوید'' جیسی سوانح عمریاں لکھیں۔

حیاتِ سعدی: حالؔی کی پہلی کوشش بحیثیت سوانح نگار ''حیاتِ سعدی'' ہے جو ۱۸۸۶ء میں منصۂ شہود پر آئی۔ اردو زبان کی پہلی سوانح حیات ہونے کی وجہ سے اسے سوانح نگاری کا سنگِ میل کہا جاسکتا ہے۔ ''حیاتِ سعدی'' فارسی کے مشہور شاعر و ادیب شیخ سعدی کی سوانح عمری ہے جس میں حالؔی نے صاحبِ سوانح کی نظم و نثر پر تبصرہ کرتے ہوئے شاعر کے حالاتِ زندگی کا بغور جائزہ لیا ہے نیز سعدی کے کلام کا تجزیہ بھی کیا ہے۔

یادگارِ غالب: ''یادگارِ غالب'' الطاف حسین حالؔی کی دوسری سوانح عمری ہے۔ اس سوانح کو شاہ کار کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ اس میں حالی نے اردو کے مشہور شاعر اسد اللہ خاں غالبؔ کی سوانح لکھی ہے اور غالبؔ کے کلام پر مکمل اور جامع تبصرہ کیا ہے۔ اس کا سنِ اشاعت ۱۸۹۶ء ہے۔ غالب کی فطرت میں جس طرح کی شوخی اور رنگینی پائی جاتی ہے اس سے حالؔی خوب واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے طرزِ تحریر سے بعض جگہوں پر غالبؔ کے نقش کو پوری طرح اُبھارنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

حیاتِ جاوید: ''حیاتِ جاوید'' اردو کے مشہور ادیب اور قوم کے ہم دَرد سرسید احمد خاں کی مکمل اور جامع سوانح ہے جسے حالؔی نے ۱۹۰۱ء میں لکھا۔ حالی سرسید کے رفقائے کار میں سے تھے اور انہیں سرسید سے عقیدت کے ساتھ ساتھ محبت بھی تھی۔ حیاتِ جاوید حالؔی کی دوسری سوانح عمریوں کی بہ نسبت شاہ کار کا درجہ رکھتی ہے جس میں سرسید کا کوئی بھی گوشہ تشنہ نظر نہیں آتا اس سوانح کا مطالعہ یہ باور کراتا ہے کہ حالی غیر جانب دار رہے ہیں۔ حالؔی نے اس کتاب میں ایک ایسی شخصیت کی تصویر کشی کی ہے جو بذاتِ خود اپنی ذات میں انجمن تھا۔ بظاہر یہ سر سید کی سوانح ہے مگر حقیقت میں یہ پوری اُمت مسلمہ کی تاریخ ہے۔

الطاف حسین حالؔی نے جس سوانح نگاری کی بنیاد ڈالی تھی اس پر سوانح نگاروں کا ایک طویل کارواں چلتا ہوا نظر آتا ہے۔ حالی کے معاصرین میں سے بیش تَر ادبا و شعرا نے اس صنف پر طبع آزمائی کی۔ انہیں ادبا و شعرا میں ایک معتبر نام علامہ شبلی نعمانی کا ہے۔ شبلؔی نے مولوی فاروق چریا کوٹی سے فیض حاصل کیا۔ اس کے بعد سرسید جیسی شخصیت کی صحبت کا اثر قبول کیا۔ قوم وملت کی زبوں حالی کو محسوس کیا اور انگریزی تعلیم کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے دوسروں کو اس تعلیم پر توجہ دلائی۔ وہ اسلامی عظمت کے پرستاروں میں تھے، اسلام کی عظمت اور برتری ان کے نزدیک اہمیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جن پر قلم اُٹھانا آسان نہ تھا۔ اُنہوں نے سفر کے دَوران شاہی محلوں کا نظارہ بھی کیا تھا۔ سوانح عمری ''المامون'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

المامون: ''المامون'' کا سنہ اشاعت ۱۸۸۷ء ہے۔ اس میں شبلی نے مامون الرشید کی پیدائش، تربیت، تعلیم، اخلاق وعادات اور حالات کو بیان کیا ہے۔ اس سوانح کو رقم کرتے وقت وہ بالکل غیر جانب دار نظر آتے ہیں کیوں کہ مامون الرشید کی سیرت، خانہ جنگیوں اور سیاسی حالات کے ساتھ ان کی بشری کمزوریوں پر بھی نظر ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ شبلی نے سوانح 'المامون' میں بغداد کی سیر بھی کرائی ہے۔ زبیدہ اور ہارون رشید کے محلوں کی خوب صورت اور دل کش فضا کی رنگینی سے قاری لطف اندوز بھی ہوتا ہے۔

سیرۃ النعمان: ''سیرۃ النعمان'' علامہ شبلی نعمانی کی لکھی ہوئی سوانح عمری ہے جس میں امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی پوری حیات پیش کی گئی ہے۔ اس سوانح میں صاحبِ سوانح کے حالاتِ زندگی، تعلیم وتربیت، عادات وخصائل، علم الکلام اور فنِ حدیث پر امام کے دَست رَس وغیرہ کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۹۱ء میں لکھی گئی۔

الفاروق: علامہ شبلی نعمانی کی اہم سوانح ''الفاروق'' ہے جسے ۱۸۹۸ء میں علامہ نے مکمل کیا۔ اس کتاب کو مکمل اور جامع بنانے کے لئے اُنہوں نے روم اور شام کا سفر بھی کیا۔ ''الفاروق'' دراصل خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی حیات ہے۔ اس میں سوانح نگار نے صاحبِ سوانح کی سیرت پر خصوصی توجہ دی ہے تاکہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شخصیت دل چسپ اور جاذبِ توجہ ہو سکے۔ شبلی نے الفاروق لکھتے وقت دیانت داری کا ثبوت دیا ہے اور اس ماحول کا جائزہ بھی لیا ہے جس نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شخصیت اور کردار کی تعمیر میں اہم رول ادا کیا تھا۔

الغزالی: ''الغزالی'' شبلی نعمانی کی چوتھی سوانح عمری ہے جسے اُنہوں نے ۱۹۰۲ء میں زیورِ طبع سے آراستہ کیا یہ امام غزالی کی سوانح حیات ہے۔ اس سوانح کو لکھتے وقت شبلی نے مستقل مزاجی کا ثبوت دیا ہے۔ امام غزالی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی متنوّع شخصیت صاف نظر نہیں آتی ہے۔ اس لئے اسے تاریخ کا حصہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

سوانح مولانا روم: شبلی نے اس سوانح کو حیدر آباد کے قیام کے دنوں میں ۱۹۰۶ء میں لکھنا شروع کیا۔ اس سوانح میں بھی سوانح نگار نے مولانا روم کی شخصیت پر بھرپور روشنی نہیں ڈالی بلکہ علم الکلام کی تشریح میں عرق ریزی کا مظاہرہ کیا ہے۔

سیرۃ النبی ﷺ: شبلی نعمانی کی آخری تصنیف سیرۃ النبی ﷺ ہے جسے شبلی نے ۱۹۱۰ء میں مکمل کیا۔ اس کتاب کو لکھنے کی وجہ یہ تھی کہ یورپی مؤرخین نبی کریم ﷺ کی سوانح عمریاں لکھتے ہوئے غلط بیانی سے کام لے رہے تھے جس سے نئی نسل متاثر ہو رہی تھی۔ لہٰذا ان اثرات کو زائل کرنے کے لئے ایسی کتاب کا لکھنا ناگزیر تھا جس میں نبی کریم ﷺ کی صحیح تصویر پیش کی جاتی اس کام کے لئے شبلی نے خود کو تیار کیا۔ دوسری طرف سرسید احمد نے بھی سر ولیم مور کا جواب خطباتِ احمدیہ لکھ کر دیا تھا۔ بھلا شبلی خاموش کیوں کر رہ سکتے تھے۔ انہیں نبی کریم ﷺ سے سچی محبت تھی۔ وہ نبی کریم ﷺ کی ایسی جامع اور مکمل سوانح حیات لکھنا چاہتے تھے جس سے یورپی مؤرخین کا جواب بھی ہو جائے اور نئی نسل پر نبی کریم ﷺ کی مکمل سیرت واضح ہو سکے۔ اس کے لئے اُنہوں نے محنت، لگن اور یک سوئی سے کام شروع کیا۔ ابھی دو جلد ہی مکمل کر پائے تھے کہ موت کا پروانہ آ پہنچا۔ باقی چار جلدوں کو ان شاگرد سید سلیمان ندوی نے مکمل کر کے اپنے استاد شبلی نعمانی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا۔

حیاتِ شبلی: یہ سید سلیمان ندوی کی سب سے مشہور سوانح حیات شبلی ہے۔ جس میں سید سلیمان ندوی نے اپنے استاد شبلی نعمانی کی سوانح لکھ کر ان تمام غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا جو اس زمانے میں پھیل چلی تھیں۔ اس سوانح میں سلیمان ندوی نے شبلی کی خوبیوں اور خامیوں کے دونوں رُخ کو پیش کیا۔ تاکہ اس زمانے کی سیاسی، سماجی اور معاشی حالات سے قاری کو واقفیت حاصل ہو سکے۔ یہ کتاب ۱۹۴۳ء میں لکھی گئی۔ اس کے علاوہ سید سلیمان ندوی نے رحمتِ عالم، حیاتِ امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سیرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا اور عمر خیام پر سوانح لکھی۔

یادگارِ حالی: صالحہ عابد حسین کی لکھی ہوئی سوانح عمری ہے جسے مصنفہ نے ۱۹۵۰ء میں لکھا۔ اس سوانح کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ نشو ونما ہے۔ دوسرا حصہ آب ورنگ اور تیسرا حصہ برگ و بار سے تعلق رکھتا ہے۔ صالحہ عابد حسین نے اس سوانح میں اردو کے پہلے سوانح نگار الطاف حسین حالی کی مکمل تصویر پیش کی ہے۔

07.07 خلاصہ

اُردو نثر کی تمام اَصناف کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا اَفسانوی اَدب ہے جس کے تحت اُن اَصنافِ نثر کو شامل کیا گیا ہے جن کی بنیاد قصہ یا کہانی پر قائم ہے جیسے داستان، ناول، اَفسانہ، اور ڈراما وغیرہ۔ دوسرا غیر اَفسانوی اَدب ہے جس کے تحت اُن اَصنافِ نثر کو شامل کیا گیا ہے جن کی بنیاد قصہ یا کہانی پر قائم نہیں ہے جیسے خاکہ، اِنشائیہ، آپ بیتی، سفرنامہ، رپورتاژ اور سوانحِ عمری وغیرہ۔

لفظ ''سوانح'' عربی زبان کے لفظ ''سانحہ'' کی جمع ہے جس کا لغوی معنی ''حادثات، واقعات، حالاتِ زندگی، اور سَرگذشت'' وغیرہ ہے۔ اصطلاحی اعتبار سے سوانح کا مطلب ہے ''کسی شخص کے حالاتِ زندگی کا بیان جس میں اُس شخص کی زندگی کے تلخ و شیریں واقعات وحادثات کے بیان کے ساتھ ساتھ اُس شخص کی شخصیت اور سیرت کے اچھے اور برے پہلو کا بھی ذِکر ہو۔ اِس کے علاوہ اپنی زندگی میں اُس شخص نے جو کارنامے انجام دیے ہیں، اُنہیں سوانح میں پیش کیا جائے تاکہ قارئین اُس شخص کی سوانح کا مطالعہ کر کے اُس کی سیرت وشخصیت اور اُس کی کامیابی و ناکامی سے واقفیت حاصل کر سکیں۔

ماہرینِ اَدب نے سوانح نگاری کی مختلف تعریفات بیان کی ہیں۔

اِنسائیکلوپیڈ میں سوانح نگاری کی تعریف اِن الفاظ میں درج ہے:

''سوانح نگاری ایک ایسا بیانیہ ہے جو کسی فرد کی زندگی اور شخصیت کی باز آفرینی اور اُس کے عمل کو شعوری اور فن کارانہ اَنداز میں قلم بند کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ سوانح نگاری کسی شخص کی حقیقی زندگی کا حساب و کتاب ہے۔''

اِس تعریف میں جن اہم نکات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ درجِ ذیل ہیں:

﴿۱﴾ سوانح نگاری ایک ایسا فن ہے جس کا تعلق براہِ راست تاریخ نگاری سے ہے۔

﴿۲﴾ سوانح نگاری دَر حقیقت تاریخ کی ایک شاخ ہے۔ اِس لئے تاریخ نویسی کی طرح سوانح نگاری میں بھی غیر جانب داری، صداقت اور دیانت داری ضروری ہے۔

﴿۳﴾ سوانح نگار کو اَدبی اور فنی اَقدار کا لحاظ رکھنا چاہیے تا کہ سوانح نگاری کا اَدبی حُسن مجروح نہ ہو۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی سوانح نگاری کی اَہمیت و اِفادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کسی بھی بڑے انسان کی سوانحِ عمری تنہا اُس کی سوانحِ عمری نہیں ہوتی۔ اُس کا ماحول اور اُس کے ماحول سے وابستہ بہت سے اَفراد اور اَشخاص بھی اپنے ذہن اور زندگی کے اعتبار سے اُس میں شریک ہوتے ہیں۔''

شمس الرحمٰن فاروقی سوانح نگاری کی اَہمیت کا اِعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سوانحِ عمری صاحبِ سوانح کی شخصیت کے تمام اَہم پہلوؤں کے بارے میں ہماری معلومات میں اضافہ کرتی ہے اور صاحبِ سوانح کے ذہنی اِرتقا کو سمجھنے میں ہماری معاون ہوتی ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کوئی ایک سوانحِ حیات صاحبِ سوانح کی مکمل ذہنی اور تاریخی تصویر پیش کر سکتی ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ اچھی سوانحِ عمری ہمیں صاحبِ سوانح سے اِس قدر قریب کر دیتی ہے کہ اتنی قربت شاید ذاتی ملاقاتوں سے نہ حاصل ہو۔''

ڈاکٹر گیان چند جین سوانح نگاری کی ضخامت کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اِس میں کسی شخص کے حالاتِ زندگی اور شخصیت کے بارے میں لکھا جاتا ہے۔ یہ ایک مختصر مضمون بھی ہوسکتا ہے، پوری کتاب بھی۔''

ڈاکٹر عبدالقیوم سوانح نگاری کے تاریخی اور اَدبی پہلو کا اعتراف کرتے ہوئے اُس کی خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سوانح، تاریخ کی ایک شاخ ہے لیکن بعض خصوصیات کی وجہ سے اس کا شمار اَدب میں بھی کیا جاتا ہے۔ اب سوانح محض انسان کی پیدائش، خاندان، تعلیم، مشاغلِ زندگی اور وفات کا ہی بیان نہیں بلکہ فرد کے

ظاہر و باطن، عادات واَطوار، اَخلاق ومعاشرت، وراثت ونفسیاتی کیفیت اور اُس کی زندگی کے نشیب وفراز کی داستان بن گئی ہے۔''

ڈاکٹر الطاف فاطمہ سوانح نگاری کے بارے میں لکھتی ہیں:

''سوانح نگاری کسی فردِ واحد کی شخصیت کو منظرِ عام پر اِس طرح لانے کا نام ہے کہ اُس کی فطرت اور سیرت کا کوئی پہلو پوشیدہ نہ رہے۔''

حاصلِ کلام یہ ہے کہ سوانح نگاری کسی شخص کی پیدائش سے لے کر موت تک کے حالات و واقعات کی ایک مکمل اَور مستند دَستاویز ہے۔

07.08 فرہنگ

انتخاب	: چننا	متنوع	: قسم قسم کا
پروانہ	: فرمان	مرتکب	: قصوروَار
تبصرہ	: رائے دینا	مروجہ	: رائج، مستعمل
تشنہ	: ناقص	مستقل مزاجی	: ثابت قدمی
رنگینی	: لطف آفرینی	مصلحت	: حالات کے مطابق
زائل	: دُور ہونا	معاون	: مددگار
شاہ کار	: بہترین کام	منظّم	: باقاعدہ
ضخامت	: موٹاپا، جسامت	مؤرخ	: تاریخ لکھنے والا
عناصر	: عنصر کی جمع، اَجزا	مہذب	: شائستہ
غیر جانب داری	: بغیر طرف داری کے	ناگزیر	: ضروری
فراہمی	: دَست یابی	نشوونما	: پرورش پانا
قربت	: نزدیکی	نشیب وفراز	: اُتار، چڑھاؤ
گریزاں	: پرہیز کرنے والا	یک سُوئی	: دل جمعی

07.09 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : سوانح نگاری کی تعریف کیجیے؟

سوال نمبر۲ : سوانح نگاری کا لغوی معنی بیان کیجیے؟

سوال نمبر۳ : سوانح نگاری کے لئے کیسی شخصیات کا انتخاب کرنا چاہیے؟

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : سوانح نگاری کے کسی اہم عنصر پر روشنی ڈالیے؟

سوال نمبر۲ : سوانح نگاری کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

سوال نمبر۳ ''یادگارِ غالبؔ'' کی سوانحی خصوصیات بیان کیجیے۔

07.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اُردو ادب کا فنی اِرتقا از ڈاکٹر فرمان فتح پوری

۲۔ اُردو میں سوانح نگاری از سید شاہ علی

۳۔ اردو میں فن سوانح نگاری کا اِرتقا از الطاف فاطمہ

اکائی 08 : اُردو میں سوانح نگاری کی روایت

ساخت

08.01 : اغراض ومقاصد

08.02 : تمہید

08.03 : سوانح کی تعریف

08.04 : اُردو ادب میں سوانح نگاری کے ابتدائی نقوش

08.05 : اُردو ادب میں سوانح نگاری کی مختلف قسمیں

08.06 : اُردو ادب میں سوانح نگاری کی روایت

08.07 : اُردو ادب کے دو اہم سوانح نگار

08.08 : اُردو ادب کی دو اہم سوانح عمریاں

08.09 : خلاصہ

08.10 : فرہنگ

08.11 : نمونہ امتحانی سوالات

08.12 : حوالہ جاتی کتب

08.01 اغراض ومقاصد

سوانح نگاری اُردو نثر کی ایک اہم صنف ہے۔ اس لئے ادب کے طلبا و طالبات کے لئے ضروری ہے کہ وہ صنف سوانح نگاری سے اچھّی طرح واقف ہوں۔ اسی مقصد کے تحت اس اکائی میں ''اُردو میں سوانح نگاری کی روایت'' کا جائزہ لیا گیا ہے۔ سوانح نگاری کے فن سے اچھّی طرح واقفیت کرانے کے لئے سوانح کی تعریف، سوانح نگاری کے ابتدائی نقوش، عالمی ادب میں سوانح نگاری کا آغاز اور سوانح عمری کی اقسام پر روشنی ڈالنے کے علاوہ اُردو کے چند اہم سوانح نگاروں اور اُردو کی چند اہم سوانح عمریوں کا مختصر تعارف بھی کرایا گیا ہے۔

ایسا محسوس کیا گیا ہے کہ طلبا و طالبات نثری ادب کی اصناف داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ اور انشائیہ کے مقابلے میں سوانح نگاری کی طرف کم متوجّہ ہوتے ہیں۔ جب کہ یہ صنف نثری ادب کی ایک اہم صنف ہے لہٰذا اس اکائی میں ''اُردو میں سوانح نگاری کی روایت'' کو شامل کرنے اور سوانح نگاری کے فن کا جائزہ لینے کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ آپ نہ صرف سوانح نگاری کے فن کی طرف متوجّہ ہوں بلکہ اس فن سے لگاؤ اور دل چسپی میں بھی اضافہ ہو۔

08.02 تمہید

آپ بخوبی واقف ہوں گے کہ اُردو ادب میں صنف سوانح عمری کی روایت بہت زیادہ قدیم نہیں ہے۔اس کا شمار اُردو کی جدید نثری اصناف میں کیا جاتا ہے۔سوانح عمری کا باضابطہ آغاز خواجہ الطاف حُسین حالؔی کی تصنیف کردہ سوانح عمریوں حیاتِ سعدی، یادگارِ غالبؔ اور حیاتِ جاوید سے ہوا ہے۔اس کے بعد شبلی نعمانی، عبدالسلام ندوی، غلام رسول مہر، عبدالماجد دریا آبادی، صالحہ عابد حُسین وغیرہ نے اس صنف کی روایت میں اضافہ کیا ہے۔

آپ کو یہ بھی پتہ ہونا چاہیے کہ سوانح عمری قلم بند کرنے کے دو طریقے رائج ہیں۔ایک طریقہ تو یہ ہے کہ لکھنے والا اپنی زندگی کے حالات و واقعات بیان کرتا ہے جسے خودنوشت سوانح یا آپ بیتی کہتے ہیں۔دوسرا طریقہ یہ ہے کہ لکھنے والا دوسروں کے سوانحی حالات تحریر کرتا ہے جسے سوانح عمری کہتے ہیں۔اسے جگ بیتی بھی کہا جاسکتا ہے۔بیشتر سوانح عمریوں میں کسی اہم شخصیت کی زندگی کے حالات و واقعات دل کش و مؤثر ادبی انداز میں پیش کیے جاتے ہیں۔

سوانح نگاری کا دائرہ بہت وسیع ہے دیگر زبانوں کے علاوہ اُردو میں مختلف اقسام کی سوانح عمریاں قلم بند کی گئی ہیں جن کے ذریعہ اہم مذہبی رہنماؤں یا پیشواؤں، سیاسی قائدوں، بادشاہوں، نوابوں، تاریخی ہستیوں و معزز افراد کی زندگیوں کے حالات و واقعات نہ صرف محفوظ ہو جاتے ہیں بلکہ نام وَر ہستیوں کے کارنامے حیرت انگیز اور سبق آموز بھی ہوتے ہیں اس لئے سوانح نگاری کے فن اور اُس کی روایت سے واقفیت ہونا بہت ضروری ہے۔

08.03 سوانح کی تعریف

انگریزی اصطلاح Biography کا اُردو متبادل سوانح یا سوانح عمری ہے۔ڈکشنریز اور دیگر کتابوں میں سوانح کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں جن میں بڑی حد تک مماثلت نظر آتی ہے۔آپ کو سوانح، سوانح عمری یا سوانح نگاری سے اچھّی طرح واقفیت ہو جائے اس مقصد کے تحت سوانح (Biography) کی چند تعریفیں پیش کی جارہی ہیں :

﴿۱﴾ ایک حقیقی زندگی کی تحریر کو سوانح کہتے ہیں۔ (Encyclopedia of Americana)

﴿۲﴾ سوانح ایک شخص کی تحریری زندگی ہوتی ہے (Concise Oxford Dictionary of Current English)

﴿۳﴾ کسی شخص کی زندگی کے متعلّق لکھی گئی کسی مصنّف کی تحریر کو سوانح کہتے ہیں۔ (Longman Dictionary)

﴿۴﴾ کسی شخص کی زندگی کی تحریری دستاویز یا تاریخ کو سوانح کہتے ہیں۔

(Chamber's Twentieth Century Dictionary)

﴿۵﴾ سوانح انفرادی زندگی کی تعریف ہے جسے ادب کی ایک شاخ قرار دیا جاتا ہے۔کسی شخص کی زندگی کا ایک لیکھا جوکھا ہے جسے کوئی دوسرا شخص بیان کرتا ہے۔ (Websters' New World Dictionary)

﴿۶﴾ کسی شخص کی زندگی کا تحریری حساب کتاب یا کسی چھوٹے گروپ مثلاً خاندان کا لیکھا جوکھا ہوتا ہے۔اس طرح سوانح عمری تاریخ کی ایک شاخ ہے جس میں تواتر، ترتیب اور وضاحت کے ساتھ کسی خاص عوام، مُلک، عہد یا شخص کا بیان ہوتا ہے۔ (Dictionary of Literary Terms)

ڈرائیڈن نے ۱۶۶۳ء میں سوانح عمری کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے :

مندرجہ بالا تعریفوں کے پیشِ نظر سوانح کی مختصر تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے :

''کسی فرد واحد کی پوری زندگی یا کسی خاص زمانہ کی زندگی کے سچّے حالات و واقعات کو کسی شخص کے ذریعہ ادبی انداز میں تحریر کیے جانے کو سوانح عمری کہتے ہیں۔

08.04 اُردو ادب میں سوانح نگاری کے ابتدائی نقوش

اُردو کی قدیم داستانوں، مثنویوں اور مرثیوں میں سوانحی عناصر پائے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں دکن کی مثنویوں کو سوانح نگاری کے اوّلین نقوش کہا جاسکتا ہے۔ سترہویں صدی عیسوی میں گول کُنڈہ اور بیجاپور کی ریاستوں میں کئی ایسی مثنویاں منظوم کی گئیں جن میں کچھ افراد کی زندگی کے حالات کے ساتھ اُن کے مزاج اور عادات واطوار کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ مُلّا وجہی، قلی قطب شاہ، نصرتی، غواصی اور ابن نشاطی نے صنفِ مثنوی کو قابلِ قدر فروغ دیا۔ نصرتی نے اپنی شہرہ آفاق مثنوی ''گلشنِ عشق'' میں اپنے والد کے اطوار و خصائل کو نہایت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اُن کی مثنوی ''علی نامہ'' میں بھی سوانح کے بہترین نمونے پائے جاتے ہیں۔ 'علی نامہ' علی عادل شاہ ثانی کی زندگی کے حالات پر مشتمل مثنوی ہے۔ علی عادل شاہ ثانی کو شواجی کی سرکشی، زمینداروں کی بغاوت اور مغلوں کے پے در پے حملوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ نصرتی نے غیر جانب داری، غیر جذباتی اور تاریخی صداقت کے ساتھ اُس کی جنگی مہمات، شجاعت، دلیری، دُور اندیشی اور تدابیر کا ایسا دل کش نقشہ کھینچا ہے کہ تمام واقعات کی تصاویر نگاہوں میں پھرنے لگتی ہیں۔ رومی کی مثنوی ''غوث نامہ'' کا شمار بھی سوانحی انداز کی مثنوی میں کیا جاسکتا ہے۔ وجہی، غواصی، ابن نشاطی کے پیش رَو اور ابراہیم قطب شاہ کے ہم عصر فیروز کی مثنوی ''توصیف نامہ'' بھی اُردو کی قدیم ترین سوانحی مثنوی ہے۔ عبدالملک نے احادیث واقوال کی روشنی میں اپنی مثنوی ''مولود نامہ'' میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیّبہ کو مرتّب کیا ہے۔ لہٰذا اسے بھی سوانحی مثنوی کے ضمن میں رکھا جاسکتا ہے۔

مثنویوں کے علاوہ تذکروں میں بھی سوانح نگاری کے ابتدائی نقوش نظر آتے ہیں۔ میر تقی میر نے اپنے تذکرہ ''نکات الشعرا'' میں شاعروں کی زندگی کے بعض گوشوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ گردیزی نے اپنے تذکرہ ''تذکرہ ریختہ گویان'' میں بھی اُتنے ہی شاعروں کا تذکرہ کیا ہے۔ قائم کے تذکرہ مخزنِ نکات، غلام حُسین کے تذکرۂ شورش اور واجد علی شاہ کے تذکرۂ اختر میں بھی شاعروں کے حالاتِ زندگی کے کچھ بہترین نمونے پائے جاتے ہیں۔ نوّاب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے تذکرۂ گلشنِ بے خار میں شاعروں کے حالات قدرے تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ اگرچہ بیشتر تذکروں میں اہم شعرا سے متعلّق چند الفاظ سے زیادہ کچھ تحریر نہیں کیا گیا ہے پھر بھی اُن کی افادیت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تاریخِ ادب، خاکہ نگاری اور سوانح نگاری کے بے شبہ اوّلین نقوش ہیں۔ ان کے ذریعے شاعروں کی ولادت و وفات کی تاریخیں، اُس عہد کی تہذیب و معاشرت، ماحول و مشاغل، ادبی سرگرمیوں، مشاعروں، دیگر دل چسپیوں اور تفریحات کا کسی حد تک پتہ چلتا ہے۔

مثنویوں اور تذکروں کے علاوہ مرثیوں میں بھی سوانحی نقوش نظر آتے ہیں۔ بیشتر مرثیے شہدائے کربلا اور حضرتِ امام حُسین کی بلند کرداری، صبر، استقلال، عزم اور حوصلہ سے عبارت ہیں۔ میر خلیق، میر ضمیر، میر انیس، مرزا دبیر وغیرہ نے اپنے مرثیوں میں امام حُسین اور

شہیدانِ کربلا کی عظمت، ایثار، جرأت اور حوصلہ مندی کے لافانی نمونے پیش کیے ہیں۔ان مرثیہ نگاروں نے سیرت کے علاوہ متعلّقہ کرداروں کے خدوخال کو بھی نہایت فنّی مہارت سے اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔سیرت نگاری اور نفسیاتی اثر انگیزی کے باوجود قدیم داستانوں، تذکروں اور مرثیوں کو سوانح عمری نہیں کہا جا سکتا۔البتہ متذکّرہ اصنافِ ادب میں سوانح نگاری کے ابتدائی یا اوّلین نقوش ضرور نظر آتے ہیں۔

مولانا محمّد حُسین آزاد نے اپنی تصنیف ''آبِ حیات میں'' شاعروں کے سوانحی کوائف تفصیل سے درج کیے ہیں۔اُنہوں نے اس کتاب کو پانچ اَدوار میں تقسیم کیا ہے اور اپنی معلومات و تحقیق کی روشنی میں شاعروں کے ذاتی حالات اور عادات و اطوار کے ساتھ اُن کے عہد و ماحول کی عکّاسی بھی کی ہے۔تحقیقی نقطۂ نظر سے آبِ حیات کے بیانوں سے پوری طرح اتّفاق نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی اس شہرہ آفاق تصنیف کے ذریعے سوانح نگاروں کے لئے سوانح نگاری کی راہ ہموَار کی ہے۔''آبِ حیات'' جہاں اِنشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے وہیں تاریخِ ادب، تحقیق، خاکہ نگاری اور سوانح نگاری کے واضح نقوش کے اعتبار سے بھی نہایت اہم ہے۔دراصل اُردو کے قدیم شعرا سے ہماری بھرپور واقفیت اسی تصنیف کی مرہونِ منّت ہے۔

08.05 اُردو ادب میں سوانح نگاری کی مختلف قسمیں

اُردو اور دُنیا کی دیگر زبانوں میں مختلف قسم کی متعدّد سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں جن کی کسی خاص اصول کے تحت درجہ بندی نہیں کی جا سکتی کیوں کہ زیادہ تر سوانح عمریاں موضوع کے اعتبار سے ایک دوسرے سے گڈ مڈ یا وابستہ ہو جاتی ہیں پھر بھی مطالعہ کی سہولت کے پیشِ نظر سوانح عمریوں کو درج ذیل اقسام میں منقسم کر کے اُن کی درجہ بندی کی جا سکتی ہے:

﴿۱﴾ ادبی و فکری سوانح عمری ﴿۲﴾ تاریخی سوانح عمری ﴿۳﴾ سیاسی و سماجی سوانح عمری

﴿۴﴾ مذہبی سوانح عمری ﴿۵﴾ افسانوی سوانح عمری

آپ سوانح عمری کی اقسام سے اچھّی طرح واقف ہو جائیں اس لئے

مندرجہ بالا اقسام پر اجمالاً روشنی اس لئے ڈالی جا رہی ہے کہ آپ سوانح عمری کی قسموں سے اچھّی طرح واقف ہو جائیں۔

﴿۱﴾ ادبی و فکری سوانح عمری

ادبی و فکری سوانح عمری میں کسی شاعر یا ادیب کی زندگی کے حالات قلم بند کیے جاتے ہیں۔اس میں متعلّقہ شخص کی زندگی اور اُس کے کارناموں کا مفصل ذکر کیا جاتا ہے یا اُس کے کسی ایک پہلو پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ایسی سوانح عمریوں میں ادیب یا شاعر کے ادبی کارناموں کا اُس کے عہد کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی تناظر میں اس طرح جائزہ لیا جاتا ہے کہ اُس کے تمام ادبی کارنامے بھی منظر عام پر آ جائیں اور قارئین اُس کی ادبی و فکری شخصیت سے پوری طرح روشناس بھی ہو سکیں۔اس عمل میں سوانح نگار کو نہایت چابک دستی سے ادیب یا شاعر کے عہد کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی شعور کو اس طرح پیش کرنا چاہیے کہ وہ سوانح پر غالب نہ ہو سکیں بلکہ اُن کی حیثیت محض ضمنی یا معاون عناصر کی سی ہو۔

﴿۲﴾ تاریخی سوانح عمری

اگر چہ سوانح عمری کو تاریخ کی ایک شاخ بھی کہا جاتا ہے لیکن کچھ خصوصیات کی بنیاد پر سوانح عمری اور تاریخ کی شناخت الگ الگ قائم کی جا سکتی ہے۔تاریخ میں تاریخی واقعات کو صداقت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے جب کہ سوانح عمری میں کسی فرد کے ظاہر و باطن، مزاج

واخلاق، عادات واطوار، معاشرت ونفسیاتی کیفیات اور اُس کی زندگی کے حالات قلم بند کیے جاتے ہیں۔ تاریخی سوانح عمری میں کسی تاریخی شخصیت یا اُس سے متعلّقہ اشخاص کے حالات وواقعات کو تاریخی اعتبار سے ادبی انداز میں رقم کیے جاتے ہیں۔ اس طرح تاریخی سوانح عمری سے مراد ایسی سوانح عمری ہے جس میں کسی خاص عہد کے سلطان، حکمراں، فرماں روا، نوّاب یا کسی تاریخی ہستی کی شان وشوکت، جاہ وجلال اور نشیب وفراز کو تاریخی واقعات کے ساتھ ادبی اُسلوب میں تحریر کیا جاتا ہے۔

﴿۳﴾ سیاسی وسماجی سوانح عمری

سیاسی وسماجی سوانح عمری میں کسی اہم یا خاص سیاسی وسماجی رہنما کے حالاتِ زندگی قلم بند کیے جاتے ہیں۔ دیگر سوانح کی طرح ایسی سوانح میں بھی متعلّقہ شخص کی ولادت سے وفات تک کے حالات کا بیان بنیادی حیثیت رکھتا ہے مگر سیاسی یا سماجی کارکن یا رہنما کے خاص سیاسی اور سماجی حالات، خاص سیاسی اور سماجی تحریکات سے وابستگی اور اُس کے نظریات کی روشنی میں اُس کے کارناموں کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ اگر چہ بیش تر سیاست داں سماجی کارکن بھی ہوتے ہیں اور سماجی کارکن سیاست میں بھی دخل رکھتے ہیں مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ بعض افراد اپنی تمام زندگی خدمتِ خلق میں گزار دیتے ہیں۔ اُنہیں سیاست سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے خالص سیاست داں سے متعلّق تحریر کی گئی سوانح عمری کو سیاسی سوانح عمری اور سماجی کارکن سے متعلّق قلم بند کی گئی سوانح عمری کو سماجی سوانح عمری کہنا زیادہ مناسب ہے۔

﴿۴﴾ مذہبی سوانح عمری

مذہبی سوانح عمری میں کسی مذہبی شخص کی زندگی کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ ایسی سوانح عمری میں مذہبی اُمور پر زیادہ توجّہ دی جاتی ہے۔ دراصل مذہبی سوانح عمری کا تعلّق کسی ایسے مذہبی رہنما یا مذہبی پیشوا سے ہوتا ہے جس کی زندگی کا بیشتر حصّہ مذہبی اُمور کو بہ رُوے کار لانے میں گزرا ہو۔ اس قسم کی سوانح عمریاں عام طور پر ایسے سوانح نگار یا عقیدت مند تحریر کرتے ہیں جن کا جذباتی تعلّق کسی مذہبی رہنما یا پیشوا سے ہوتا ہے۔ وہ عقیدت اور جذباتی لگاؤ کے سبب اپنے پیر ومرشد یا رہنما کی خامیوں اور لغزشوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور اُس کے روشن یا تابناک گوشوں کو وَا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے ایسی سوانح عمریاں سوانح نگاری کے فن پر کھری ثابت نہیں ہوتی ہیں۔ دراصل مذہبی سوانح عمری کا مقصد مذہبی جوش وخروش کے ساتھ مذہب کی تبلیغ واشاعت اور مذہبی رہنا کی خوبیوں اور صفات کو منظرِ عام پر لانا ہوتا ہے۔

﴿۵﴾ افسانوی سوانح عمری

افسانوی سوانح عمری میں افسانوی رنگ پوری طرح نمایاں ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص کی زندگی کو افسانوی ادب یعنی ناول یا افسانہ وغیرہ کی ہیئت میں قلم بند کیا جائے تو اُسے افسانوی سوانح عمری کہتے ہیں۔ اُردو کے متعدد ناول نویسوں اور افسانہ نگاروں نے اپنے تخلیق کردہ ناولوں یا افسانوں میں اپنی یا دیگر اشخاص کی زندگی اور حالات کی نہایت دل کش تصویر کشی کی ہے۔ ''اُمراؤ جان ادا'' اور ''ٹیڑھی لکیر'' ایسے ہی ناول ہیں جن میں قلم کاروں نے اپنی زندگی کو ناول کے فارم میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ مولوی نذیر احمد نے اپنے ناول ''ابن الوقت'' میں سرسیّد احمد خاں کی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس قسم کی سوانح عمری میں سوانح نگار کو حقائق میں افسانوی رنگ بھرنے اور کرداروں کے اصلی ناموں میں تغیر وتبدّل کرنے کی پوری آزادی حاصل ہوتی ہے۔ مختصر طور پر افسانوی سوانح عمری کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے کہ جب کوئی مصنّف اپنے یا کسی کے حالاتِ زندگی کو افسانوی ادب کی کسی ہیئت میں پیش کرتا ہے تو اُسے افسانوی سوانح عمری کہتے ہیں۔

08.06 اُردو ادب میں سوانح نگاری کی روایت

اُردو میں سوانح نگاری کے ابتدائی نقوش تذکروں، داستانوں، مرثیوں اور مثنویوں میں نظر آتے ہیں۔ دکن کی مثنویوں میں منظوم سوانح کے عکس دکھائی دیتے ہیں جن میں سے نصرتیؔ کی مثنوی گلشنِ عشق اور علی نامہ، رومیؔ کی مثنوی غوث نامہ، فیروزؔ کی مثنوی توصیف نامہ، عبدالملک کی مثنوی مولود نامہ نہایت اہم ہیں۔ مرثیوں میں حضرتِ امام حُسین اور شہیدانِ کربلا کی سیرت وفضائل کو سوانح نگاری کے نقوش کہا جا سکتا ہے۔ شعرائے اُردو کے تذکروں میں شعرا کے حالات وکوائف بھی سوانح نگاری کے ابتدائی نمونے قرار دیے جا سکتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیّبہ، صحابہ کرام اور بزرگانِ دین کی سیرت نگاری سے بھی سوانح نگاری کی روایت میں اضافہ ہوا ہے۔

مولانا محمد حُسین آزاد کی تصنیف ''آبِ حیات'' میں شعرائے اُردو کی سوانح کے بہترین اور واضح نقوش پائے جاتے ہیں۔ اگر چہ ''آبِ حیات'' کا مقصد سوانح نگاری نہیں تھا تاہم اُس میں شخصیت نگاری کا پہلو اس قدر نمایاں ہے کہ اُسے سوانح نگاری کے قدیم وجدید طرز کی عبوری کڑی تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ سرسیّد احمد خاں کی تصانیف آثارالصنادید، خطباتِ احمدیہ اور سیرتِ فریدیہ کے علاوہ تہذیب الاخلاق کے مضامین اور خطوط میں بھی سیرت نگاری کے واضح اور غیر واضح عناصر نظر آتے ہیں۔ آثارالصنادید کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں دہلی کی تاریخی عمارتوں اور دوسرے باب میں لال قلعہ اور اُس کی عمارتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ تیسرا باب شہرِ شاہ جہاں سے متعلّق ہے۔ چوتھے باب میں مشاہیرِ دہلی کا تذکرہ ہے جس میں سوانح نگاری کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ خطباتِ احمدیہ کے آخری چار خطبات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی ولادتِ باسعادت، تعلیم وتربیت، فصاحت وبلاغت، مُہرِ نبوت وغیرہ کو عقلی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے۔ اس لئے اس تصنیف میں سوانحی عناصر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ سیرتِ فریدیہ کو مختصر سوانح عمری کا مرقع کہا جا سکتا ہے۔ ۵۷ر صفحات کی اس مختصر کتاب میں سرسیّد نے سب سے پہلے ۱۸۵۷ء کے حالات اور شاہی دربار کی منظر کشی کی ہے۔ اس کے بعد اپنے نانا خواجہ فریدالدّین اور اُن کی دختر یعنی اپنی والدہ عزیز النساء کے حالات درج کیے ہیں۔ اس کتاب سے خود سرسیّد احمد خاں کے بچپن کے حالات اور تعلیم وتربیت کے بعض گوشے بھی بڑی حد تک نمایاں ہوئے ہیں۔ اُن کی اس تصنیف کو قدیم وجدید سوانح نگاری کی درمیانی کڑی کہا جا سکتا ہے۔

اس عہد کی تصانیف احسن التواریخ، احسن السیر، مرآۃ الکونین، تواریخِ تعلّقہ دارانِ اودھ اور سفرِ اودھ سے بھی سوانح نگاری کی روایت کو استحکام حاصل ہوا ہے۔ آقا حسن رضوی کی تصنیف احسن التواریخ دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب سوانح حیات سے قریب تر ہے۔ پہلے حصّہ پر ملکہ وکٹوریہ کے قصیدے کے علاوہ راجا دِگ وجے سنگھ بلرام پور وتُلسی پور کے اکتیس سالہ دَور کا احاطہ کرتے ہوئے خاندانی حالات، تعلیم وتربیت، سیر وشکار اور جنگ وجدال کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے حصّے میں انگریز افسروں سے تعلّقات، اخلاق، اولوالعزمی، تدبیر، سیاست وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ منشی اکبر جہاں کی تصنیف احسن السیر ہندوستان کی تاریخی عمارتوں کا تعارف نامہ اور اولیاء کرام وبزرگانِ دین کے مختصر سوانحی حالات کا تذکرہ ہے۔ مولوی غلام نبی کی تصنیف مرآۃ الکونین کو نیم سوانحی اور نیم تاریخی کتاب کہہ سکتے ہیں۔ اس میں سلاطینِ ہند، سلاطینِ روم، اولیاء کرام اور مشاہیر کے علاوہ رسول اکرم اور صحابہ کرام کی مقدّس زندگیوں پر بھی طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ منشی کشوری لال کی تواریخِ تعلّقہ دارانِ اودھ میں تاریخی رنگ کے ساتھ سوانحی عناصر بھی نظر آتے ہیں۔ سفرِ اودھ واجد علی شاہ کے سفیر برائے انگلستان خان بہادر محمد مسیح الدّین خاں کی خود نوشت سوانح ہے۔ اگر چہ متذکّرہ تمام تصانیف میں سوانحی عناصر نظر آتے ہیں مگر انہیں باقاعدہ سوانح عمری نہیں کہا جا سکتا۔

اُردو میں سوانح نگاری کا موجد خواجہ الطاف حُسین حالؔی کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ اُن کی تصنیف ''حیاتِ سعدی'' سوانح نگاری کے فن پر کھری ثابت ہوتی ہے۔ اس کتاب کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصّے میں شیخ سعدی کے بچپن اور جوانی کے حالات بیان کیے گئے ہیں اور حصّہ دوم میں اُن کے کلام کی خصوصیات کی وضاحت کی گئی ہے۔ ''یادگارِ غالب'' میں حالؔی نے غالبؔ کی شخصیت اور اُن کے نثری و شعری کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ ''حیاتِ جاوید'' میں حالؔی نے سرسیّد احمد خاں کی زندگی کے تمام نشیب و فراز کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

شبلی نعمانی نے المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم اور سیرۃ النبی جیسی اہم سوانح عمریاں لکھ کر اُردو سوانح نگاری کی روایت میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ المامون کا انداز مورخانہ ہے۔ سیرۃ النّعمان امام اعظم ابوحنیفہ کی سوانح عمری ہے۔ اسے شبلی نے دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصّہ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے عہد کی تاریخ اور تہذیب و تمدّن سے متعلّق ہے۔ دوسرے حصّہ میں حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے نسب، رشد، قبول اسلام، رسول اکرم کی وصال اور غزوات کا ذکر ہے۔ الغزالی امام غزالی کی سوانح عمری ہے۔ سوانح مولانا روم میں مولانا روم کی حیات اور مثنوی مولانا روم کا جائزہ لیا گیا ہے۔ سیرۃ النبی رسول اکرم کی سیرتِ مبارکہ اور فضائلِ اخلاق کا بہترین مجموعہ ہے۔

عبدالسلام ندوی کی سیرتِ عمر بن عبدالعزیز اور اقبالِ کامل کا شمار اُردو کی اہم سوانح عمریوں میں کیا جاتا ہے۔ سیّد سلیمان ندوی کی رحمتِ عالم، حیاتِ امام مالک، سیرتِ عائشہ اور حیاتِ شبلی اُردو کی بہترین سوانح عمریاں ہیں۔ اُنہوں نے شبلی کی نامکمّل سیرۃ النبی کی آخری چار جلدیں لکھ کر نا قابلِ فراموش کارنامہ انجام دیا ہے۔ غلام رسول مہر کی تصانیف غالب، جوزفین اور سیرتِ سیّد احمد شہید نے اُردو سوانح نگاری کی روایت کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ قاضی عبدالغفّار کی شہرت اگرچہ لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری سے ہے لیکن اُنہوں نے آثارِ جمال الدّین افغانی اور آثارِ ابوالکلام آزاد جیسی سوانح عمریاں لکھ کر اُردو سوانح نگاری کی روایت میں اضافہ کیا ہے۔ عبدالماجد دریا آبادی کی تصانیف حکیم الامّت نقوش و تاثرات اور محمد علی ذاتی ڈائری کے چند اوراق جدید سوانحی طرز کا بہترین نمونہ ہیں۔ صالحہ عابد حُسین، خواجہ الطاف حُسین حالؔی کی نواسی ہیں۔ اُنہوں نے یادگارِ حالی کے عنوان سے خواجہ الطاف حُسین حالؔی کے حالاتِ زندگی اس طرح قلم بند کیے ہیں کہ اُن کی شخصیت زندہ و جاوید ہوگئی ہے۔

متذکرہ سوانح نگاروں کے علاوہ دیگر سوانح نگاروں نے سوانح عمریاں تحریر کر کے اُردو سوانح نگاری کی روایت کو فروغ دیا ہے۔ دَورِ حاضر میں بھی بہترین اور قابلِ قدر سوانح عمریاں قلم بند کی گئی ہیں جن میں متعلّقہ اشخاص کی علمی اور ادبی خدمات پر بے لاگ تبصرے بھی کیے گئے ہیں اور اُن کی تصانیف، اُن کے خطوط یا دیگر ذرائع سے حاصل مواد کی روشنی میں حالات و واقعات اور اُن کی نفسیات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ درج بالا سوانح نگاری کے مطالعہ سے واضح ہے کہ مستقبل میں بھی سوانح نگاری کے امکانات روشن اور تابناک ہیں۔

08.07 اُردو ادب کے دو اہم سوانح نگار

﴿۱﴾ خواجہ الطاف حُسین حالؔی

خواجہ الطاف حُسین حالؔی پانی پت میں خواجگان انصاری کے ایک معزز اور مہذّب خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کی والدہ کی دماغی حالت درست نہ تھی اور والد کا کم عمری ہی میں انتقال ہوگیا تھا لہٰذا بھائیوں نے اُن کی پرورش کی۔ ۱۷ سال کی عمر میں اُن کی شادی کر دی گئی۔ اُنہوں نے معاشی تنگی سے نجات حاصل کرنے کے لئے کئی جگہ ملازمتیں کیں۔ وہ غالبؔ کے شاگرد ہی نہیں تھے بلکہ اُنہوں نے غالبؔ کی

زندگی کو بہت قریب سے دیکھا بھی تھا۔ سرسیّد کے خیالات سے متاثر ہوکر اُنہوں نے تہذیب الاخلاق کے لئے بہت سے مضامین ومقالات لکھے تھے۔ اُنہوں نے صاف وشستہ اُسلوب میں زندگی کے اُن مسائل کی عکّاسی کی ہے جو اُن کے عہد سے مطابقت رکھتے تھے۔ اُنہوں نے شاعری کی تنقید اور سوانح نگاری کے لئے نئی راہیں ہموار کی ہیں۔ حالؔی کو نثر ونظم میں یکساں عبور حاصل تھا۔ اُن کی پہلی نثری تصنیف مجالس النساء ہے جس میں انہوں نے ناول کی ہیئت میں تعلیمِ نسواں کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔

حالؔی کی گراں قدر تصانیف حیاتِ سعدی، مقدّمہ شعروشاعری، یادگارِ غالبؔ اور حیاتِ جاوید ہیں۔ ان تصانیف کے علاوہ اُن کے مقالات، مضامین اور خطوط کے مجموعے بھی نہایت اہم ہیں۔ ۱۸۸۲ء میں تصنیف کی گئی ''حیاتِ سعدی'' کو اُردو کی پہلی باقاعدہ سوانح عمری تسلیم کیا جاتا ہے۔ ''مقدّمہ شعروشاعری'' اُن کے شعری مجموعہ کا ضخیم مقدّمہ ہے جو بجائے خود اُردو شاعری کی تنقید کی ایک اہم تصنیف ہے۔ اس مقدّمہ میں پہلی بار منظّم اور علمی انداز میں شاعری سے متعلّق معروضی اُصول پیش کیے گئے ہیں۔ ''یادگارِ غالبؔ'' مرزا غالبؔ کی حیات و شاعری سے متعلّق پہلی باقاعدہ تصنیف ہے۔ یہ تصنیف غالبؔ کی سرگزشت کے ساتھ غالب فہمی کے نکتۂ نظر سے بھی اہم تصنیف ہے۔ ''حیاتِ جاوید'' سرسیّد احمد خاں کی سوانح عمری ہے۔ اس سوانح عمری میں حالؔی نے سرسیّد احمد خاں کو ایک قومی رہنما اور مفکّر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

﴿۲﴾ شبلؔی نعمانی

شبلؔی نعمانی کی ولادت ۱۸۵۷ء میں اعظم گڑھ میں ہوئی تھی۔ اُنہوں نے عربی، فارسی، مذہبی اور فلسفہ کی تعلیم اپنے دَور کے جیّد علما سے حاصل کی تھی۔ اُن کے والد اپنے دَور کے نام وَر وکیل تھے اور اُنہیں بھی وکیل بنانا چاہتے تھے۔ اس لئے شبلی نے وکالت کا امتحان پاس کیا اور کچھ دن وکالت کے پیشے سے بھی وابستہ رہے مگر یہ پیشہ اُن کے مزاج کے موافق نہ تھا۔ ۱۸۸۲ء میں اُن کی تقرری علی گڑھ کالج میں فارسی کے اُستاد کی حیثیت سے ہوگئی۔ وہاں اُن کو سرسیّد احمد خاں، الطاف حُسین حالؔی، محسن الملک، پروفیسر آرنلڈ وغیرہ کی صحبت نصیب ہوئی۔

شبلی کو نثر اور نظم دونوں میں مہارت حاصل تھی۔ پہلے وہ زیادہ تر نظموں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ سرسیّد احمد خاں کی تحریک سے متاثر ہوکر اُنہوں نے عظیم مسلم رہنماؤں کی سوانح عمریاں قلم بند کیں۔ اُنہوں نے پروفیسر آرنلڈ کے ساتھ مصر، شام اور دوسرے اسلامی ممالک کا دَورہ بھی کیا اور وہاں کی اسلامی طرزِ معاشرت کا بہت قریب سے مطالعہ اور مشاہدہ بھی کیا۔ وہ ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ کالج سے استعفیٰ دے کر اعظم گڑھ آ گئے۔ وہاں اُنہوں نے ایک نیشنل اسکول کے علاوہ ایک ادارہ دارالمصنّفین کے نام سے بھی قائم کیا۔ شبلی نعمانی قدیم وجدید کا مرکب تھے۔ اُن کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اگرچہ اُن کے بیشتر مضامین ادب، تاریخ، سوانح وغیرہ سے متعلّق ہیں مگر المامون، الفاروق، سیرت النبی، علم الکلام، شعرالعجم، موازنۂ انیس ودبیر، سیرت النعمان، الغزالی، سوانح مولانا روم نہایت اہم اور گراں قدر تصانیف ہیں۔

08.08 اُردو ادب کی دو اہم سوانح عمریاں

﴿۱﴾ سوانح عمری : یادگارِ غالبؔ سوانح نگار : الطاف حُسین حالؔی

خواجہ الطاف حُسین حالؔی کی تحریر کردہ سوانح عمری ''یادگارِ غالب'' ایسی پہلی سوانح عمری ہے جس نے اربابِ علم وادب کو مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کی شخصیت اور اُن کی نثری وشعری نگارشات کی خصوصیات کی طرف خصوصیت سے متوجّہ کیا۔ یادگارِ غالب سے قبل غالب اور اُن کے کلام کا تذکرہ بعض تذکروں کے علاوہ سرسیّد احمد خاں کی آثار الصنادید اور محمد حُسین آزاد کی آبِ حیات میں نظر آتا ہے۔ آبِ حیات میں

غالبؔ کا ذکر ضرور کچھ تفصیل سے کیا گیا ہے مگر ان تذکروں اور آبِ حیات سے غالبؔ کی شخصیت اور اُن کی شعری ونثری نگارشات کی اہمیت پر کوئی خاص روشنی نہیں پڑتی ہے۔ حالیؔ نے اس سوانح عمری کو دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصّے میں غالبؔ کی زندگی کے حالات بیان کیے گئے ہیں اور دوسرے حصّے میں اُن کی نثری اور شعری تخلیقات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

خواجہ الطاف حُسین حالیؔ نہ صرف غالبؔ کے شاگرد تھے بلکہ اُنہیں ایک عرصہ تک اُن کی قربت بھی میسر رہی تھی اس لئے اُنہیں دوسروں کی بہ نسبت اُن کی زندگی کی جزئیات کا علم زیادہ تھا۔ اس لئے یادگارِ غالب میں درج زیادہ تر واقعات و حالات واقفیت اور صحیح معلومات پر مبنی ہیں۔ غالبؔ کی شخصیت کے اہم اور غیر اہم یعنی معمولی پہلوؤں کو بھی حتی الامکان پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں غالبؔ کی زندگی کے ابتدائی حالات، روزمرّہ کے معمولات، اخلاق و عادات، اعتقاد، بذلہ سنجی، جدّت پسندی، مزاج اور رہن سہن جیسے متعدد پہلوؤں کو بڑی خوبی سے اُبھار کر اُن کے کردار و مزاج کو منظرِ عام پر لانے کا قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔

سوانحی حصّہ سے قطعِ نظر ''یادگارِ غالبؔ'' کا تنقیدی حصّہ نہایت اہم ہے کیوں کہ اس حصّہ سے غالب شناسی کی راہ ہم وَار ہوئی ہے اور اُن کے کلام کے مطالعہ کا ذوق بھی پیدا ہوا ہے۔ اس سوانح عمری میں غالبؔ کی بعض کمزوریوں پر پردہ بھی ڈالا گیا ہے۔ اس میں درج بعض بیانات و واقعات بھی مشکوک ہیں پھر بھی اس کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ سوانح عمری منفرد نظر آتی ہے۔

﴿۲﴾ سوانح عمری : یادگارِ حالیؔ سوانح نگار : صالحہ عابد حُسین

صالحہ عابد حُسین کی تصنیف کردہ سوانح عمری ''یادگارِ حالی'' کا شمار اُردو کی اہم سوانح عمریوں میں کیا جاتا ہے۔ خواجہ الطاف حُسین حالیؔ کی شخصیت و نگارشات سے متعلّق یہ پہلی باضابطہ سوانح عمری ہے جو ۱۹۵۰ء میں قلم بند کی گئی تھی۔ صالحہ عابد حُسین رشتہ میں الطاف حُسین حالیؔ کی نواسی تھیں۔ شاید اسی لئے انہوں نے ''یادگارِ حالی'' کے عنوان سے اس مبسوط سوانح عمری کو تحریر کیا۔ انہوں نے نہایت تحقیق و تلاش سے حالیؔ سے متعلّق مواد کو جمع کیا۔ شائع شدہ فن پاروں کے علاوہ حالیؔ کے احباب و دوست اور عزیز و اقارب سے رابطہ قائم کر کے حالیؔ کی سیرت و کردار کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔

''یادگارِ حالی'' کو تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصّے کا عنوان ''نشو ونما'' ہے جس میں حالیؔ کی زندگی کے واقعات نہایت سادگی اور برجستگی سے پیش کیے گئے ہیں۔ اس حصّہ کے مطالعہ سے حالیؔ کے خاندان، پیدائش اور بچپن کے حالات و واقعات سے واقفیت ہوتی ہے۔ دوسرے حصّہ کا عنوان ''آب و رنگ'' ہے، یہ حصّہ نہایت دل کش اور پر لطف ہے۔ اس حصّہ میں حالیؔ کے مزاج، کردار، سیرت، عادات واطوار کی نہایت دل کش انداز میں عکّاسی کی گئی ہے۔ حالیؔ کی شخصیت کی تمام تر خصوصیات اس حصّہ میں نظر آتی ہیں۔ سوانح عمری کے تیسرے حصّہ کا عنوان ''برگ و بار'' ہے جو پہلے دو حصّوں کی بہ نسبت زیادہ تفصیلی ہے۔ اس میں حالیؔ کی نگارشات کا تعارف بھی کرایا گیا ہے اور تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ آخر میں منتخب غزلوں کو بھی تحریر کیا گیا ہے۔

''یادگارِ حالی'' میں درج واقعات سے حالیؔ اپنی تمام فطری خصوصیات یعنی رحم دلی، شفقت، قناعت، نرمی، انکساری، محبت، سنجیدگی اور لطافت کے پیکر میں نظر آتے ہیں۔ صالحہ عابد حُسین نے حالیؔ کے روزمرّہ کے مشاغل، اُن کی عادات واطوار اور چھوٹے چھوٹے واقعات سے

حالؔی کی شخصیت کے نقوش کو نہ صرف اُبھارنے بلکہ روشن و تابناک کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔انہوں نے حالؔی کی شخصیت و سیرت کے مطابق سادہ، متوازن، سنجیدہ اور شگفتہ اُسلوب اختیار کیا ہے۔دراصل یہ سوانح عمری حالی کی پُرکشش شخصیت اور قابلِ قدر کارناموں کا سچّا اور دل کش مرقع ہے۔

08.09 خلاصہ

کسی فرد واحد کی پوری زندگی یا کسی خاص زمانہ کی زندگی کے سچّے حالات و واقعات کو کسی شخص کے ذریعے ادبی انداز میں تحریر کیے جانے کو سوانح عمری کہتے ہیں۔پتّھروں، کتبوں اور بھوج پتّھروں پر لکھی تحریریں سوانح عمری کے ابتدائی نقوش کی غمّاز ہیں۔دکن کی قدیم مثنویوں میں بادشاہوں اور معزز ہستیوں کے منظوم خصائل کو بھی سوانح عمری کے ابتدائی نقوش کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ان کے علاوہ داستانوں اور مرثیوں میں بھی سوانح عمری کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

مولانا محمّد حُسین آزادؔ نے ''آبِ حیات'' میں شاعروں کے سوانحی کوائف مفصّل درج کر کے سوانح نگاری کی راہ کو ہموار کیا ہے۔ دوسری صدی عیسوی میں یہودی قلم کار پلوٹارک کی تصنیف کردہ سوانح عمری سوانح نگاری کا نقشِ اوّل ہے۔ڈرائڈن پہلا مصنّف ہے جس نے ۱۶۶۳ء میں سوانح نگاری کو باقاعدہ ادب کی ایک صنف قرار دیا۔رفتہ رفتہ یہ صنف انگریزی ادب میں داخل ہوئی پھر بڑی تیزی کے ساتھ دنیا کی دوسری زبانوں میں داخل ہوگئی۔عربی زبان کے ادیب خصوصیت سے اس کی طرف متوجّہ ہوئے۔سیرت نگاری اور افادیت کی وجہ سے یہ صنف کافی مقبول ہوئی۔اس صنف کو ایران میں بھی کافی تقویت حاصل ہوئی۔سوانح عمریوں کو کسی اُصول کے تحت تقسیم نہیں کیا جا سکتا پھر بھی مطالعہ کی سہولت کے پیشِ نظر اس کی اہم اقسام ادبی و فکری سوانح عمری، تاریخی سوانح عمری، سیاسی و سماجی سوانح عمری، مذہبی سوانح عمری اور افسانوی سوانح عمری ہیں۔اُردو میں سوانح عمری کا موجد الطاف حُسین حالؔی کو تسلیم کیا جاتا ہے۔اُن کی تصنیف کردہ سوانح عمریوں میں حیاتِ سعدی، یادگارِ غالبؔ اور حیاتِ جاوید نہایت اہم ہیں۔اوّلین سوانح نگاروں میں شبلی نعمانی نے المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم اور سیرۃ النبی جیسی اہم سوانح عمریاں قلم بند کی ہیں۔

عبدالسلام ندوی کی سیرتِ عمر بن عبدالعزیز اور اقبالِ کامل بھی اُردو کی قابلِ ذکر سوانح عمریاں ہیں۔سیّد سلیمان ندوی کی رحمتِ عالم، حیاتِ امام مالک، سیرتِ عائشہ اور حیاتِ شبلی کا شمار اُردو کی اہم سوانح عمریوں میں کیا جاتا ہے۔غلام رسول مہر کی تصانیف غالب، قاضی عبدالغفّار کی تصانیف آثارِ جمال الدّین افغانی اور آثارِ ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریا آبادی کی تصانیف حکیم الامّت نقوش و تاثرات اور محمد علی ذاتی ڈائری کے چند اوراق اور صالحہ عابد حُسین کی تصنیف یادگارِ حالی سے اُردو سوانح نگاری کی روایت میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

08.10 فرہنگ

اُجاگر ہونا	: نمایاں ہونا۔ظاہر ہونا۔عیاں ہونا	تذکرہ	: ذکر۔وہ کتاب جس میں کسی کا حال لکھا جائے
افسانوی	: افسانہ سے منسوب۔جس کا تعلّق افسانہ یا فکشن سے ہو	ثقافتی	: جس کا تعلق ثقافت سے ہو۔تہذیبی
الوہیت	: ربّانیت۔شانِ خداوندی	جاہ وجلال	: شان و شوکت۔عظمت۔دبدبہ
		حقائق	: حقیقت کی جمع۔حقیقتیں۔اصلی حالات۔

انحراف : انکار۔مخالفت۔برخلاف ہونا

انفرادی : شخصی۔ذاتی۔کسی شخص کی ذات سے مخصوص

باضابطہ : ضابطہ کے مطابق۔دستور کے مطابق۔قاعدہ کے ساتھ

باقاعدہ : قاعدہ کے مطابق۔باضابطہ۔دستور کے مطابق

بھوج پَتر : بھوج نامی درخت کا پتّہ۔(قدیم زمانہ میں ورق کے بجائے اسی پر لکھا جاتا تھا)

پیش رَو : آگے چلنے والا۔آگے گزرنے والا۔پہلے کا

تابناک کرنا : روشن کرنا۔چمکانا۔آشکار کرنا

سچّی باتیں

خاتمہ بالخیر ہونا : نیک انجام ہونا۔ایمان کی سلامتی اور دین داری کے ساتھ وفات ہونا

خصائل : خصلت کی جمع۔عادات۔سیرت۔مزاج

رنگ بھرنا : رنگ آمیزی کرنا۔کسی عبارت کو دل چسپ بنانے کے لئے لطف اندوز واقعات کی شمولیت کرنا

کتبہ : وہ عبارت جو اکثر مقابر، مساجد، مکانات، تاریخی عمارتوں وغیرہ پر لکھ کر یا کندہ کرا کر لگاتے ہیں

08.11 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : سوانح نگاری کی تعریف بیان کیجیے۔

سوال نمبر۲ : سوانح عمری کی اقسام کی نشان دہی کیجیے۔

سوال نمبر۳ : ''یادگارِ حالیؔ'' کی اہم خصوصیات کی نشان دہی کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : اُردو میں سوانح نگاری کی روایت پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۲ : سیاسی وسماجی سوانح عمری کی خصوصیت قلم بند کیجیے۔

سوال نمبر۳ : ''یادگارِ غالبؔ'' کی خصوصیات کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

08.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اُردو ادب میں سوانح نگاری از الطاف فاطمہ

۲۔ اُردو میں سوانح نگاری از سید شاہ علی

۳۔ اُردو میں سوانحی ادب: فن اور روایت از عمر رضا

۴۔ فنِ سوانح نگاری اور دیگر مضامین از امیر اللہ شاہین

اکائی 09 : حالؔی: یادگارِ غالبؔ

ساخت

09.01 : اغراض ومقاصد
09.02 : تمہید
09.03 : خواجہ الطاف حُسین حالؔی کے حالاتِ زندگی
09.04 : خواجہ الطاف حُسین حالؔی کی تصانیف
09.05 : خواجہ الطاف حُسین حالؔی بحیثیت سوانح نگار
09.06 : سوانح عمری ''یادگارِ غالب'' کا تنقیدی جائزہ
09.07 : ''یادگار غالبؔ'' سے ایک اقتباس
09.08 : ''یادگار غالبؔ'' کے اقتباس کا جائزہ
09.09 : خلاصہ
09.10 : فرہنگ
09.11 : نمونہ امتحانی سوالات
09.12 : حوالہ جاتی کتب
09.13 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

09.01 اغراض ومقاصد

اُردو زبان وادب کی دنیا میں خواجہ الطاف حُسین حالؔی کا نام محتاج تعارف نہیں۔ اُنہوں نے سوانح نگاری کی روایت کو ''حیاتِ سعدیؔ، یادگارِ غالبؔ اور حیاتِ جاوید'' جیسی اہم ترین سوانحات لکھ کر مستحکم بنایا۔ خصوصاً ''یادگارِ غالب'' کو تو غالب شناسی کا حرفِ آغاز قرار دیا جاتا ہے۔

اِس اکائی کے مطالعے سے آپ کو نہ صرف حالؔی کے حالاتِ زندگی اور اُن کی تصانیف سے آگاہی ہوگی بلکہ ان کے ادبی وعلمی کار ناموں سے بھی واقفیت حاصل کرسکیں گے۔ یادگارِ غالبؔ کے ایک منتخب اقتباس کا مطالعہ کریں گے۔ اکائی کے خلاصے کے ساتھ ساتھ مشکل الفاظ کے معانی، امتحانی سوالات کے نمونے اور معاون کتب کے نام بھی دیے گئے ہیں۔ اکائی کے آخر میں اپنے مطالعے کی جانچ کے عنوان سے چند سوالات دیے گئے ہیں تا کہ آپ یہ اندازہ کرسکیں کہ آپ نے اکائی کا مطالعہ کتنی سنجیدگی سے کیا ہے۔ آپ کی آسانی کے لئے اکائی کے آخر میں سوالات کے جوابات بھی دیے گئے ہیں۔

09.02 تمہید

سوانح نگاری کا آغاز حالؔی کی سوانح عمریوں حیاتِ سعدی، حیاتِ جاوید اور یادگارِ غالبؔ وغیرہ سے ہوتا ہے۔ یادگارِ غالبؔ کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ یادگارِ غالبؔ کو اُردو میں غالب شناسی کی روایت کا سنگِ میل قرار دیا جاسکتا ہے۔ غالب جیسے عظیم شاعر کی زندگی اور شاعرانہ مقام و مرتبے کی تفہیم کا عمل دراصل یادِگار غالب سے ہی شروع ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر حالؔی یادگارِ غالب نہ لکھتے تو غالب کی شخصیت اور ان کے فن پر ابھی مزید کچھ وقت پردے پڑے رہتے اور غالب شناسی کا عمل شروع بھی نہ ہوا ہوتا۔ ذیل میں ہم اسی شہرہ آفاق کتاب کے تعلق سے معلومات حاصل کریں گے لیکن پہلے حالؔی کے حالات زندگی، ان کی تصانیف اور ان کے ادبی مقام و مرتبے کے بارے میں آپ کو واقف کرایا جائے گا۔

09.03 خواجہ الطاف حُسین حالؔی کے حالاتِ زندگی

خواجہ الطاف حسین حالؔی ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت میں پیدا ہوئے۔ حالؔی کے والد خواجہ ایزد بخش کا انتقال حالؔی کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ ماں بھی بیمار رہتی تھی اور ان کی دماغی حالت بھی صحیح نہیں رہ گئی تھی اس لئے حالؔی کو والدین کا پیار پوری طرح نہ مل سکا۔ بڑے بھائی اور بڑی بہن نے ان کی پرورش کی۔ حالؔی کے اجداد سات سو برس قبل ہرات سے ہندوستان آئے تھے اور انصاریوں کا یہ خاندان صحابی رسول ایوب انصاری کی اولاد میں سے تھا۔ ابتدائی تعلیم حالؔی نے پانی پت میں حاصل کی اور قرآن شریف ختم کرنے کے بعد فارسی اور عربی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ البتہ اُنہیں انگریزی زبان کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔

تحصیلِ علم کا شوق حالؔی کو ابتدا ہی سے تھا اور وہ اس میں مصروف تھے کہ ان کے بڑے بھائی نے ان کی مرضی کے خلاف ان کی شادی کر دی۔ خانگی زندگی کو اس راہ میں رُکاوٹ سمجھ حالؔی گھر والوں کو بغیر بتائے دہلی چلے گئے اور تحصیلِ علم میں اپنا زیادہ وقت گزارنے لگے۔ شاعری کا بھی شوق تھا اور غالبؔ کے مشورے پر کہ ''اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر ظلم کرو گے'' حالؔی نے سنجیدگی سے اس طرف توجہ دی اور بہت جلد ان کا شمار اچھے شعرا میں ہونے لگا۔ اِبتدا میں انہوں نے اپنا تخلص ''خستہ'' رکھا تھا لیکن بعد میں حالؔی کر لیا۔ دلی سے حالؔی کی شہرت بہت جلد پانی پت پہنچ گئی اور ان کے بھائی نے انہیں دوبارہ خانگی ضرورتوں کی طرف توجہ دلائی اور اپنے ساتھ پانی پت لائے۔ ملازمت کی تلاش شروع ہوئی اور حصار میں پہلی ملازمت ملی۔ حالؔی نے ۱۸۵۶ء یہ ملازمت اختیار کی اور ۱۸۵۷ء غدر ہو گیا ملازمت ہاتھ سے جاتی رہی۔ اب انہوں نے دہلی کا رُخ کیا۔ غالبؔ کے قریبی دوست نواب مصطفٰے خان شیفتہؔ سے ان کی ملاقات ہوئی اور اُنہوں نے حالؔی کو اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کیا لیکن جلد ہی الطاف حسین حالؔی غالبؔ اور شیفتہؔ دونوں ہی کی صحبت سے محروم ہو گئے ۱۸۶۹ء میں غالبؔ کا اور اسی سال شیفتہؔ کا بھی انتقال ہو گیا۔ حالؔی نے غالبؔ کا وہ مرثیہ لکھا جو آج بھی اپنی ادبیت، شعریت اور شدّت تاثر کی بنا پر یاد کیا جاتا ہے۔ دہلی میں ہی حالؔی کی ملاقات سرسید احمد خاں سے ہوئی اور اب انہیں اپنا مقصدِ حیات حاصل ہو گیا۔ وہ دل و جان سے سرسید کے ہم نوا بن گئے اور اصلاحِ قوم کے لئے اپنی تمام تر صلاحیتیں وقف کر دیں۔ سرسید کے مشورہ پر انہوں نے مسدّس مدوجزرِ اسلام جیسی نظم لکھی جو انہیں شہرتِ دَوام دے گئی۔ سرسید نے حالؔی کی اس نظم کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا:

> ''اگر خدا مجھ سے پوچھے کہ دنیا میں تو نے کون سا اچھا کام کیا تو میں کہوں گا کہ میں نے حالی سے مسدس لکھوایا ہے''

حالؔی نے اس نظم کو جو مسدّس کے فارم میں لکھی گئی اور جس کا عنوان مدّ وجزرِ اسلام تھا' مسلمانوں کے عروج اور ان کے موجودہ زوال کو موضوع بنایا تھا۔ اس نظم سے حالؔی کو جو شہرت ملی اس نے ملازمت کا حصول بھی آسان کر دیا اور اسی دَوران انہیں پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ملازمت مل گئی۔ ان کا کام انگریزی زبان سے اردو میں ترجمہ کی گئی کتابوں کی عبارت درست کرنا تھا۔ اس طرح انگریزی نہ جاننے کے باوجود انہیں انگریزی زبان وادب سے استفادہ کا موقع مل گیا اور وہ انگریزی ادب کی بہت سی خوبیوں سے بھی واقف ہو گئے۔ لاہور میں ان دنوں کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں انجمن پنجاب بے حد فعّال تھی۔ جدید اردو شاعری کو رواج دینے میں اس انجمن کی کوششوں کو آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ حالؔی بھی اس انجمن سے وابستہ ہو گئے اور انہوں نے بھی محمد حسین آزادؔ کی طرح نئے موضوعات پر باقاعدہ نظمیں لکھیں جن میں چپ کی داد، مناجاتِ بیوہ اور حُبِ وطن جیسی نظمیں شامل ہیں۔ لاہور کی آب وہوا حالؔی کو راس نہیں آسکی۔ اسی دَوران دلی میں اینگلو عربک کالج میں عربی کے استاد کی جگہ خالی ہوگئی اور حالؔی کا اس پر تقرّر ہو گیا۔ نظام حیدآباد نے ان کا وظیفہ بھی مقرّر کر دیا۔ وظیفہ ملنے کے بعد حالؔی نے اس ملازمت سے بھی سبک دوشی اختیار کر لی۔ اور پانی پت آ کر تصنیف وتالیف میں لگ گئے۔ ان کی ان خدمات کے اعتراف میں انگریز سرکار نے انہیں ۱۹۰۴ء میں شمس العلما کا خطاب عطا کیا۔ پانی پت میں رہ کر حیاتِ جاوید، حیاتِ سعدی اور یادگارِ غالب جیسی کتابیں تصنیف کیں اور انتہائی بھرپور علمی وادبی زندگی گزارنے کے بعد ۳؍دسمبر ۱۹۱۴ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ حالؔی کے والد کا کیا نام تھا؟

﴿۲﴾ حالؔی کا پہلا تخلص کیا تھا؟

﴿۳﴾ ''مسدس مدوجزرِ اسلام'' حالؔی نے کس کی فرمائش پر لکھا؟

09.04 خواجہ الطاف حُسین حالؔی کی تصانیف

حالؔی کثیر التّصانیف بھی تھے۔ انہوں نے نثر میں تقریباً چودہ کتابیں تصنیف وترجمہ کیں اس کے علاوہ ان کے تحریر کردہ مضامین کے بھی دو حصہ اور خطوطِ حالؔی بھی شائع ہوئے ہیں۔ ذیل میں ان کی فہرست دی جارہی ہے۔

﴿۱﴾ عربی رسالہ	۱۸۵۲ء
﴿۲﴾ مولود شریف	۱۸۷۰ء
﴿۳﴾ تریاق مغموم	۱۸۶۸ء
﴿۴﴾ طبقات الارض	۱۸۷۲ء
﴿۵﴾ اصول فارسی	۱۸۷۲ء
﴿۶﴾ تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے	۱۸۷۲ء
﴿۷﴾ شواہد الہام	۱۸۷۲ء
﴿۸﴾ سوانح ناصر خسرو (فارسی)	۱۸۷۲ء

﴿۹﴾	مجالس النسا	۱۸۷۴ء
﴿۱۰﴾	تذکرۂ رحمانیہ	۱۸۷۶ء
﴿۱۱﴾	حیاتِ سعدی	۱۸۸۴ء
﴿۱۲﴾	مقدمہ شعروشاعری (مع دیوان حالی)	۱۸۹۳ء
﴿۱۳﴾	یادگارِ غالب	۱۸۹۷ء
﴿۱۴﴾	حیاتِ جاوید	۱۹۰۱ء
﴿۱۵﴾	مقالاتِ حالی (مضامین)	۱۹۰۱ء
﴿۱۶﴾	مضامینِ حالی (مضامین)	۱۹۰۲ء
﴿۱۷﴾	مکتوباتِ حالی (خطوط کا مجموعہ)	۱۹۲۵ء

09.05 خواجہ الطاف حُسین حالؔی بحیثیت سوانح نگار

اردو سوانح نگاری کی روایت کا باقاعدہ آغاز حالؔی کی تصنیف کردہ سوانحی کتب سے ہوتا ہے۔ان سوانح میں تین سوانح عمریاں حالؔی کی شہرتِ دوام کا سبب بنیں یعنی حیاتِ سعدی، حیاتِ جاوید اور یادگارِ غالب۔حالؔی نے یہ تینوں سوانح ان جدید اُصولوں کو سامنے رکھ کر لکھیں جو سوانح نگاری کے تعلق سے جدید مغربی ناقدین نے وضع کیے ہیں۔سوانح نگار کے تعلق سے حالؔی نے حیاتِ سعدی کے دیباچے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔حالؔی کے مطابق ابتدائی دَور میں جو سوانح لکھی گئی ہیں ان ہیں ''روایت'' کا بیان تو ملتا ہے لیکن ''درایت'' سے یکسر خالی ہیں۔یعنی صاحب سوانح کے متعلق جو کچھ عام طور پر بیان کیا جاتا تھا یا مشہور تھا اسے یہ سوانح نگار بغیر جانچے اور پرکھے لکھ دیا کرتے تھے۔حالؔی کی رائے اس سلسلے میں یہ ہے کہ خوبیوں کے ساتھ خامیاں بھی ضرور بیان کی جائیں مگر دونوں کی بنیاد محض روایت پر نہ ہو کر درایت پر ہو۔اس کے ساتھ ہی حالؔی کا خیال یہ بھی ہے کہ سوانح نگاری کے لئے ایسی شخصیتوں کا انتخاب کیا جائے جن سے ملک وملت کو فائدہ پہنچا ہے یا جن کے کمالات یا خوبیاں قوم کے زوال کو عروج میں بدلنے کا سبب بنیں۔

حالؔی نے جو پہلی سوانح لکھی وہ حیاتِ سعدی ہے جو ۱۸۸۴ء میں منظر عام پر آئی۔فارسی زبان کے عظیم شاعر شیخ سعدی کے حالات زندگی اور ان کی شاعرانہ عظمت نیز ان کی گراں مایہ تصانیف گلستاں اور بوستاں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ان کی کتابوں کی اہمیت اور ان کی مقبولیت کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔سعدی کی سیرت، مزاج اور فطرت کا جائزہ اس طرح لیا ہے کہ ہم ان کی شخصیت کے ہر پہلو سے واقف ہو جاتے ہیں۔

حیاتِ سعدی کے بعد حالؔی نے دوسری سوانح یادگارِ غالب لکھی جو ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی۔غالب جیسے عظیم شاعر کی اس سوانح نے حالؔی کی شہرت میں بے پناہ اضافہ کیا۔انہوں نے جس خوبی اور فن کاری کے ساتھ غالبؔ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اس دَور کے حالات اور معاشرتی مذاق کے پس منظر میں بیان کیا ہے اور ان کے کلام پر ایک گراں قدر ریویو لکھا ہے اس نے حالؔی کی اس تصنیف کو اردو سوانحات میں سنگِ میل کی حیثیت عطا کر دی ہے۔اس اہم ترین سوانح پر ہم آگے تفصیل سے گفتگو کریں گے

یادگارِ غالب کے بعد حالؔی نے سرسید کی سوانح حیاتِ جاوید کے نام سے لکھی جو ۱۹۰۱ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب دو حصوں میں ہے۔ اس کا پہلا حصہ سرسید کے علمی، ادبی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور تعلیمی کارناموں پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں حالؔی نے سرسید کے کارناموں پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اس طرح یہ ایک ضخیم تصنیف ہوگئی ہے جو کہیں کہیں پر تکرار کے باعث گراں گزرنے لگتی ہے۔ حالؔی نے اس سوانح کو حیاتِ سعدی اور حیاتِ غالب سے زیادہ اہم قرار دیا ہے کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ غالبؔ اور سعدیؔ کے حالاتِ زندگی اور ان کے کمالِ فن سے متعلق معلومات انہی لوگوں کے لئے اہمیت رکھتی ہیں جو زندگی کے محض ایک شعبہ یعنی ادب سے وابستگی رکھتے ہوں جب کہ سرسید جیسے لوگ ایک پوری قوم بلکہ دیگر اقوام کے لئے بھی ان مساعی جمیلہ کے سبب اہمیت رکھتے ہیں جو ان کے ہاتھوں انجام پاتی ہیں اور جو قومی وملی صورتِ حال میں تبدیلی کا باعث بنتی ہیں۔ حالؔی نے انہی اُمور کی بنیاد پر سرسید کو اور ان کے پورے عہد کو اپنی اس تصنیف میں تمام تر جزئیات کے ساتھ زندہ کر دیا ہے گویا کہ حالؔی کی یہ تصنیف یادگارِ غالب جتنی دل چسپ اور دل کش نہیں ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۴﴾ حالؔی کس کی تحریک پر مقصدیت اور اصلاح پسندی کی طرف آئے؟

﴿۵﴾ مسدّس مدّ وجزرِ اسلام کا موضوع کیا ہے؟

﴿۶﴾ شعر میں حالؔی کن تین خوبیوں کی موجودگی کو ضروری خیال کرتے ہیں؟

09.06 سوانح عمری ''یادگارِ غالب'' کا تنقیدی جائزہ

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ نہ صرف اردو کے عظیم شاعر ہیں بلکہ دنیا کے عظیم شعرا میں بھی وہ ایک ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ غالبیات اور غالب شناسی آج ہماری اردو تنقید وتحقیق کا ایک مستقل باب ہے۔ غالبؔ جیسے نابغۂ روزگار کے ادبی وشعری کارناموں کی تفہیم اور تعین قدر کی اس روایت کا آغاز حالؔی کی تصنیف ''یادگارِ غالب'' سے ہی ہوتا ہے۔ حالؔی اگر یادگارِ غالب نہ لکھتے تو ابھی مزید کچھ برسوں تک غالبؔ کے شاعرانہ مقام ومرتبے کا تعین نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ۱۸۹۷ء میں جب حالؔی کی تحریر کردہ غالبؔ کی یہ سوانح سامنے آئی تو اس وقت غالبؔ کے انتقال کو محض ۲۸ ؍برس گزرے تھے۔ تب سے آج تک غالبؔ پر قلم اُٹھانے میں کوئی بھی شخص یادگارِ غالب سے صرفِ نظر نہ کرسکا۔ ڈاکٹر سید شاہ علی جنہوں نے ''اردو میں سوانح نگاری'' کے عنوان سے تحقیقی کام کیا ہے وہ غالبؔ کی اس سوانح عمری کو سوانحی نظریات وتصوّرات کے عین مطابق تسلیم کرتے ہیں۔ حالؔی چوں کہ خود بھی ادیب اور شاعر تھے اور غالبؔ کے تقریباً ہم عصر بھی تھے۔ اُنہوں نے غالبؔ کی ذکاوت، ذہانت، حاضر جوابی، ملکۂ شعر وسخن اور ان کے دیگر اوصاف کا مشاہدہ کیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ جب انہوں نے غالبؔ کی زندگی اور شاعری پر قلم اُٹھایا تو اس کا حق ادا کر دیا۔ کتاب کی وجہِ تصنیف حالؔی کے نزدیک یہ تھی کہ غالبؔ کی زندگی، ان کی شاعری اور اِنشا پردازی کے باعث دارالخلافہ دہلی کے آخری دَور کی مہتم بالشان واقعہ بن گئی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالؔی، غالبؔ کی شخصیت سے زیادہ ان کی شاعری اور اِنشا پردازی کو ہی مہتم بالشان واقعہ سمجھتے تھے اور سوانح کی بنیاد انہی کو بنانا چاہتے تھے لیکن اس کے باوجود بھی غالبؔ کی حیات اور ان کے مشاغل کے متعلق انہوں نے سو صفحے تحریر کیے ہیں جب کہ غالبؔ کے کلام کا ادبی ریویو صرف ستر صفحے تک ہی محدود ہے۔

حالؔی کی سوانح نگاری کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے غالبؔ کی شخصیت، کردار ومزاج کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کو ایک حقیقی اور فطری مصوّر کی طرح اس طرح اُجاگر کیا ہے کہ ہر رنگ واضح طور پر سامنے آ گیا ہے۔ غالبؔ کا عشق، قمار بازی، رند مشربی، یار باشی اور قرض گیری غرض یہ کہ شخصیت کے ہر پہلو کو بے کم وکاست اس طرح پیش کر دیا ہے کہ غالبؔ کی مکمل تصویر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ حالؔی نے کتاب کے دو حصے کیے ہیں دوسرے حصہ میں غالبؔ کی شاعری کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ذیل میں ہم اس کتاب کی چند اہم خوبیوں کا ذکر کریں گے جن کی وجہ سے یہ کتاب اردو کی سوانح ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

﴿۱﴾ سوانح میں تاریخی تسلسل

حالؔی اس نکتے سے پوری طرح باخبر تھے کہ سوانح نگار کا یہ فرض ہے کہ وہ واقعات کے بیان میں تاریخی تسلسل کو ملحوظ خاطر رکھے۔ اس لئے انہوں نے سوانح میں شخصیت کے تدریجی اِرتقا کا خیال رکھا اور غالبؔ کی تمام اہم باتوں کو جزئیات کے ساتھ اس طرح پیش کیا کہ ان کی شخصیت کا اِرتقا پوری طرح سامنے آ گیا۔ غالبؔ کی ولادت، ان کا خاندان، تعلیم وتربیت، شادی، صورت شکل، مسکن، مطالعۂ کتب، کلکتے کا سفر، قید کا واقعہ، قلعہ کی ملازمت، اولاد، دستنبو کی تصنیف، برہانِ قاطع کا قضیہ، آموں سے رغبت، ناقدری کی شکایت، خانگی تعلقات، آخری لمحات اور موت وغیرہ جیسے عنوانات قائم کرتے ہوئے حالؔی نے تاریخی تسلسل کے ساتھ یعنی جو واقعہ پہلے ہوا اسے پہلے اور جو بعد میں ہوا اسے بعد میں رکھتے ہوئے غالبؔ کی زندگی کے ہر پہلو کو مکمل طور پر پیش کر دیا ہے۔ حالؔی نے غالبؔ کے حالات بیان کرتے ہوئے اس امر کا التزام بھی کیا ہے کہ محاسن اور خوبیاں تو وہ خود اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں اور خامیوں کے بیان کرنے کے لئے خود غالبؔ کا سہارا لیتے ہیں۔ جہاں ایسا کوئی مرحلہ آیا کہ غالبؔ کی کسی شخصی کمزوری کا ذکر ہو وہ فوراً خطوط غالبؔ کے وہ حصے پیش کرتے ہیں کہ جن میں خود غالبؔ نے اپنے عیوب کی طرف اشارے کیے ہیں۔ حالؔی چوں کہ سوانح لکھ رہے تھے اس لئے حالات کی بدلتی ہوئی تصویر کی انہوں نے بہ حسنِ خوبی عکاسی کی ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ جو غالبؔ کی زندگی اور ان کے حالات کے بارے میں ہے۔ اس کے آغاز سے انجام تک اگر مطالعہ کیا جائے تو قاری کو غالبؔ کی زندگی کے ساتھ ہی وقت، حالات، اقدار اور صورتِ حال سے اچھی طرح واقفیت حاصل ہو جائے گی۔

﴿۲﴾ سوانحی اوصاف

سوانح لکھنے کا پہلا اُصول یہ ہے کہ محاسن ومعائب کو یکساں طور پر پیش کیا جائے۔ حالؔی نے اس اُصول کی خاطر خواہ پیروی کی ہے جس پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ دوسرا اُصول یہ ہے کہ واقعات وحالات کو پیش کش کے تابع نہیں ہونا چاہیے یعنی سوانح نگار کو یہ آزادی نہیں ہے کہ وہ واقعات کو آگے پیچھے بیان کرے اور تقدیم وتاخیر کا کوئی خیال نہ کرے بلکہ اسے چاہیے کہ واقعات جس طرح پیش آئے ہیں اور جس طرح بدلے ہیں انہیں ویسا ہی تحریر کیا جائے۔ حالؔی کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ واقعات کی پیش کش صرف یونہی نہیں کرتے وہ ان سے چند نتائج بھی اخذ کرتے ہیں جو صاحبِ سوانح کے مزاج، کردار یا فطرت کو سامنے لانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

سوانح تحریر کرنے کا ایک اُصول یہ بھی ہے کہ بنیادی ماخذ سے استفادہ کیا جائے۔ حالؔی خود غالبؔ کے قریب رہ چکے تھے بہت سی باتوں کے وہ خود گواہ تھے لیکن اس کے علاوہ بھی انہوں نے بنیادی ماخذ سے صرفِ نظر نہیں کیا۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میں نے مرزا کی تصانیف کو دوسروں سے مستعار لے کر جمع کیا اور جس قدر اس میں ان کے حالات اور اخلاق و عادات کا سراغ ملا، قلم بند کیا۔ جو باتیں اپنے ذہن میں محفوظ تھیں یا دوستوں سے زبانی معلوم ہوئیں، ان کو بھی ضبطِ تحریر میں لایا''

(یادگار غالب، ص ۳)

اس طرح حالؔی نے سوانح نگاری کے تمام اُصولوں کی حتی الامکان پیروی کرنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ یادگارِ غالب کو آج بھی باوجود چند خامیوں کے اردو کی سب سے اچھی سوانح قرار دیا جاتا ہے۔

﴿۳﴾ اُسلوب اور طرزِ ادا

یادگارِ غالب میں حالؔی نے جو اُسلوب اختیار کیا وہ نہ تو حیاتِ سعدی کے اُسلوب کی طرح معرب و مفرس یعنی عربی و فارسی آمیز تھا اور نہ ہی حیاتِ جاوید کے اُسلوب کی مانند کہ جس میں انگریزی الفاظ کا استعمال زیادہ کیا گیا تھا۔ یادگارِ غالب کا اُسلوب سادہ و دل کش ہے۔ طرزِ اظہار میں سلاست اور روانی ہے۔ اندازِ بیان بے ساختگی لیے ہوئے ہے۔ حالؔی نے نہ صرف یہ کہ بامحاورہ اُسلوبِ اظہار اختیار کیا ہے بلکہ فصاحت و بلاغت اور تاثیر و نغمگی کا بھی بھرپور خیال رکھا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ کیجیے اور دیکھئے کہ کس قدر متوازن اور بے ساختہ انداز اختیار کیا ہے۔ غالبؔ کے اخلاق و عادات اور خیالات کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے وہ ہر ایک شخص سے جوان سے ملنے جاتا تھا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو شخص ایک دفعہ ان سے مل آتا تھا اس کو ہمیشہ ان سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے اور ان کی خوشی سے خوش اور ان کے غم سے غم گین ہو جاتے تھے اس لئے ان کے دوست ہر ملت اور ہر مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے۔''

(یادگارِ غالب، ص ۵۵)

حالؔی نے اسی طرح کے سادہ و شستہ اُسلوب میں تمام کتاب لکھی اور مسجع و مرصع نثر لکھنے سے یکسر پرہیز کیا۔ حالؔی کی تحریر کردہ نثر پر خالص کھڑی بولی کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ وہ دلی کی اس نثر سے قطعی طور پر اجتناب کرتے ہیں جو غالبؔ کے دَور تک رائج تھی اور جس کا کمال یہ تھا کہ معنی و مفہوم کی تفہیم کو تشبیہوں اور استعاروں کے پردے میں اس قدر چھپا دیا جائے کہ تفہیم گنجلک ہو جائے۔ حالؔی نے اس اُسلوبِ اظہار سے مکمل احتراز کیا اور سرسید کی نثر کی طرح سادہ اور آسان نثر لکھی ہے لیکن حالؔی کے اُسلوب کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں سرسید کے اُسلوب کے مقابلے میں زیادہ دل کشی اور تاثیر ہے۔

﴿۴﴾ اشعارِ غالب کا محاکمہ

یادگارِ غالب کا دوسرا حصہ حالؔی کے الفاظ میں غالبؔ کے کلام کا ریویو ہے۔ انہوں نے کتاب کے دیباچے میں ہی اس امر کی صراحت کر دی تھی کہ ان کا مقصد غالب کی حیات سے زیادہ ان کے ملکۂ شاعری پر گفتگو کرنا ہے۔ انہی کے الفاظ میں:

''میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ مرزا کی لائف میں کوئی مہتم بالشان واقعہ ان کی شاعری وانشا پردازی کے سوا نظر نہیں آتا۔ لہٰذا جس قدر واقعات ان کی لائف کے متعلق اس کتاب میں مذکور ہیں ان کو ضمنی اور استطرادی سمجھنا چاہیے۔ اصل مقصود اس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اس عجیب وغریب ملکہ کا لوگوں پر ظاہر کرنا ہے جو خدائے تعالیٰ نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا۔''

(یادگار غالب، ص۴)

اوپر کے اقتباس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس سوانح کا مقصد تصنیف دراصل شخصیت سے غالبؔ کے فن پر گفتگو کرنا ہے۔ یہ کام حالیؔ نے کیا بھی مکمل توجہ اور دیدہ ریزی سے۔ وہ غالبؔ کے اشعار کی لفظی ومعنوی خوبیوں پر جس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ غالبؔ کی تعیّنِ قدر کا مسئلہ بڑی حد تک حل کر دیتا ہے۔ حالیؔ چوں کہ خود بھی بہت اچھے شاعر تھے اور فنِ شاعری سے مکمل طور پر باخبر بھی تھے اس لئے غالبؔ کے اشعار کی تفہیم اور ان کی ادبی وفنی خوبیوں کی جیسی اچھی گرفت حالیؔ نے کی ہے ویسی غالبؔ کے دوسرے شارحین سے ممکن نہ ہوسکی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ حالیؔ، غالبؔ کے مزاج داں بھی تھے اور غالبؔ کی فطرت وطبیعت کے ان گوشوں سے بھی واقف تھے جن پر دوسروں کی نظر کم گئی ہوگی۔ غالبؔ کے درج ذیل شعر کو دیکھیے اور پھر حالیؔ نے اس کی جس انداز میں تشریح کی ہے اسے بھی نظر میں رکھیے۔ آپ کو اندازہ ہوگا کہ حالیؔ نے کس خوبی سے شعر کے نفسِ مضمون اور اس کی روح کو اپنی گرفت میں لیا ہے۔

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

''لاگ دشمنی اور لگاؤ محبت۔ یہ مضمون عجب نہیں ہے اور کسی اور نے بھی باندھا ہو۔ مگر ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ مگر کسی نے باندھا بھی ہوگا تو اس خوبی ولطافت سے ہرگز نہ باندھا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کو نہ ہمارے ساتھ دشمنی ہے نہ دوستی۔ مگر دشمنی بھی ہو تو اس لئے کہ اس میں بھی ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے۔ ہم اسی کو دوستی سمجھتے لیکن جب نہ دوستی ہو اور نہ دشمنی تو پھر کس بات پر دھوکا کھائیں۔ قطعِ نظر خیال کی عمدگی اور ندرت کے لگاؤ اور لاگ ایسے دو الفاظ بہم پہنچائے ہیں جن کا ماخذ متحد اور معنی متضاد ہیں اور یہ ایک عجیب التفاق ہے جس نے خیال کی خوبی کو چہار چند کر دیا ہے۔''

(یادگار غالب، ص۱۱۰)

مندرجہ بالا نکات پر غور کرنے کے بعد یہ واضح ہوتا ہے کہ یادگارِ غالب ایک عمدہ سوانح کی تمام خوبیاں اپنے اندر رکھتی ہے۔ یادگارِ غالب کی انفرادیت یہ ہے کہ اردو میں سوانح نگاری کا کوئی عمدہ نمونہ نہ ہونے کے باوجود حالیؔ نے جدید مغربی معیار کو برت کر ایک ایسی سوانح لکھی جو غالب کی زندگی، ان کے افکار، احوال اور شاعرانہ مقام ومرتبہ کا جس قدر عمدگی سے احاطہ کرتی ہے، وہ قابلِ تعریف ہے۔ حالیؔ نے محاسن ومعائب دونوں کا بیان کیا ہے مگر پوری کتاب پڑھنے کے بعد غالبؔ کی جو شخصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے وہ بے انتہا دل کش اور مرعوب کن ہے۔ ہاں یہ بات اور ہے کہ وہ اس جاگیردارانہ نظام کی چند خامیاں بھی اپنے اندر رکھتی ہے جو اس معاشرے کا ناگزیر حصہ تھیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۷﴾ یادگارِ غالب کو سوانحی نظریات وتصوّرات کے معیار کے مطابق کس نے قرار دیا ہے؟

﴿۸﴾ سوانح لکھنے کا پہلا اُصول کیا ہے؟

﴿۹﴾ یادگارِ غالب کا اُسلوب بیان کیسا ہے؟

09.07 ''یادگارِ غالبؔ'' سے ایک اقتباس

مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے جوان سے ملنے جاتا تھا کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو شخص ایک دفعہ ان سے مل آتا تھا اس کو ہمیشہ ان سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے: اور ان کی خوشی سے خوش اور ان کے غم سے غم گین ہوتے تھے۔ اس لئے ان کے دوست ہر ملت اور ہر مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے۔ جو خطوط اُنہوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں۔ ان کے ایک ایک حرف سے مہر ومحبت وغم خواری ویگانگت ٹپکی پڑتی۔ ہر ایک خط کا جواب لکھنا وہ اپنے ذمے فرض عین سمجھتے تھے۔ ان کا بہت سا وقت دوستوں کے خطوں کے جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی وہ خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے۔ وہ دوستوں کی فرمایشوں سے کبھی تنگ دل نہ ہوتے تھے۔ غزلوں کی اصلاح کے سوا اور طرح طرح کی فرمایشیں ان کے بعض خالص ومخلص دوست کرتے تھے اور ان کی تعمیل کرتے تھے۔ لوگ ان کو اکثر بے رَنگ خط بھیجتے تھے مگر ان کو کبھی ناگوار نہ گزرتا تھا۔ اگر کوئی شخص لفافے میں ٹکٹ رکھ کر بھیجتا تھا تو سخت شکایت کرتے تھے۔ اُنہوں نے میسور کے ایک شہزادے کو اپنی کوئی کتاب بھیجی ہے اس نے کتاب کی رسید لکھی ہے اور قیمت دریافت کی ہے۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

> ''حرف پرسش مقدار قیمت چرا بر زبان قلم رفت! نہجار نوازش نیازمندانِ بے نوا نہ اینست، بے سرمایہ ام نہ فرو مایہ۔ سخنورم نہ سودا گرِ موئینہ پوشم نہ کتاب فروش، پذیرندہ عطایم نہ گیرندۂ بہا۔ ہر چہ آزادگاں بشہزادگاں فرستند نذر ست' دہر چہ شاہزادگاں بآزادگاں بخشند تبرک۔ بیع ویرا نیست۔ چون وچرا نیست۔ ہر چہ فرستادہ ام ارمغان ست۔ دہر چہ خواہم فرستادارمغاں خواہد بود۔''

مروّت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجۂ غایت تھا۔ باوجود یکہ اخیر عمر میں وہ اشعار کی اصلاح دینے سے بہت گھبرانے لگے تھے، باایں ہمہ۔ کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح کے واپس نہ کرتے تھے۔ ایک صاحب کو لکھتے ہیں ''جہاں تک ہو سکا احباب کی خدمات بجالایا۔ اَوراقِ اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے۔ نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں کہ شاہ شرف بوعلی قلندر کو بسبب کبرسن کے خدا نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کر دی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست بھی خدمت اصلاحِ اشعار مجھ پر معاف کریں۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہو سکے گا لکھ دیا کرونگا باوجود اس کے بعد بھی لوگ مرزا کو برابر ستاتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ کہیں مرزا تفتہ نے یہ لکھ دیا تھا کہ آپ نے بسبب ذوق سخن کے اصلاح اشعار منظور فرمائی تھی۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں ''لاحول ولاقوۃ! کس ملعون نے بسبب ذوق شعر کے اشعار کی اصلاح منظور رکھی۔ اگر میں شعر سے بے زَار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بے زَار۔ میں نے تو بطریق قہر درویش بجانِ درویش لکھا تھا' جیسے اچھی جورو بُرے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا' اختیار کرتی ہے میرا تمہارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔''

اگر چہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا۔ ان کے مکان کے آگے اندھے، لنگڑے، لولے اور اپاہج مرد و عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ غدر کے بعد ان کی آمدنی کچھ اُوپر ڈیڑھ سو روپیہ ماہ وَار کی ہوگئی تھی' اور کھانے پینے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا' مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے۔ اس لئے اکثر تنگ رہتے تھے۔ غدر کے بعد ایک بار میں نے خود دیکھا کہ نواب لفٹنٹ گورنر کے دربار میں ان کو حسبِ معمول سات پارچہ کا خلعت' مع تین رقوم جواہر کے ملا تھا۔ لفٹینٹی کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے موافق انعام لینے کو آئے۔ مرزا صاحب کو پہلے ہی معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا اس لئے اُنہوں نے دربار سے آتے ہی خلعت اور رقوم جواہر بازار میں فروخت کرنے کے لئے بھیج دی تھیں۔ چپراسیوں کو الگ مکان میں بٹھا دیا اور جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی تب ان کو انعام دے کر رخصت کیا۔

وہ اپنے ان دوستوں کے ساتھ جو گردشِ روزگار سے بگڑ گئے تھے نہایت شریفانہ طور سے سلوک کرتے تھے۔ دلی کے عمائدین میں سے ایک صاحب جو مرزا کے دلی دوست تھے اور غدر کے بعد ان کی حالت سقیم ہوگئی تھی۔ ایک روز چھینٹ کا فرغل پہنے ہوئے مرزا سے ملنے کو آئے۔ مرزا نے کبھی ان کو مالیدہ یا جامہ دار وغیرہ کے چغوں کے سوا ایسا حقیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ چھینٹ کا فرغل اس کے بدن پر دیکھ کر دل بھر آیا' ان سے پوچھا کہ یہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی۔ مجھے اس کی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے' آپ مجھے بھی فرغل کے لئے یہ چھینٹ منگوا دیں۔ اُنہوں نے کہا جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسی وقت آپ سے چھین کر پہن لوں مگر جاڑا شدّت سے پڑ رہا ہے آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائیں گے؟ پھر ادھر ادھر دیکھ کر کھونٹی پر سے اپنا مالیدہ کا نیا چغہ اُتار کر انہیں پہنا دیا اور اس خوب صورتی کے ساتھ وہ چغہ ان کی نذر کیا۔

وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو وداعے میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں بقدر ہزار یک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقتِ جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں، کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھیرا، کبھی نجف جا پہونچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھو کا ننگا نظر نہ آئے۔ خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، بیمار، فقیر، نکہت میں گرفتار، میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو، وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود بھیک مانگے وہ میں ہوں۔'' جیسی مرزا کی طبیعت میں درّا کی اور ذہن میں جودت اور سرعت انتقال تھی۔ اسی طرح ان کا حافظہ بھی نہایت قوی تھا۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ان کے گھر میں کتاب کا کہیں نشان نہ تھا۔ ہمیشہ کرایے کی کتابیں منگوا لیتے تھے اور ان کو دیکھ کر واپس بھیج دیتے تھے مگر جو لطیف یا کام کی بات کتاب میں نظر پڑ جاتی تھی ان کے دل پر نقش ہو جاتی تھی۔ فارسی کلام میں وہ کوئی لفظ یا محاورہ یا ترکیب ایسی نہیں برتتے تھے جس کی سند اہلِ زبان کے کلام سے نہ دے سکتے ہوں۔ کلکتے میں جن لوگوں نے ان کے کلام پر اعتراض کیے تھے اور جن کے جواب میں مرزا نے مثنوی بادِ

مخالف لکھی تھی، ان کی مثنوی کے علاوہ ایک ایک اعتراض کے جواب میں دَس دَس بارہ بارہ سندیں اساتذہ کے کلام سے لکھ کر علاحدہ بھیجی تھیں۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنے خطوط میں ان کو مفصل بیان کیا ہے۔ برہانِ قاطع پر جو کچھ انہوں نے لکھا وہ محض اپنی یادداشت کے بھروسے پر لکھا۔ فکرِ شعر کا یہ طریقہ تھا کہ اکثر رات کو عالم سر خوشی میں فکر کیا کرتے تھے اور جب کوئی شعر سرانجام ہو جاتا تھا تو کمر بند میں ایک گرہ لگا لیتے تھے۔ اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں لگا کر سو رہتے تھے اور دوسرے دن صرف یاد پر سوچ سوچ کر تمام اشعار قلم بند کر لیتے تھے۔''

09.08　''یادگارِ غالبؔ'' کے اقتباس کا جائزہ

مندرجہ بالا اقتباس مرزا غالب کے عادات و اطوار اور مزاج و فطرت کے اہم پہلوؤں پر بخوبی روشنی ڈالتا ہے۔ حالیؔ چوں کہ خود غالبؔ کے بے حد نزدیک رہے تھے اور انہیں غالبؔ کے مزاج، ان کی فطرت، ان کے مشاغل، ان کے خیالات اور ان کے جذبۂ اخلاق کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ یہی سبب ہے کہ یادگارِ غالب میں حالیؔ نے مرزا غالب کی شخصیت اور ان کے کردار و عمل کی نہایت سچی اور فطری تصویر پیش کی ہے۔ اس اقتباس میں انہوں نے غالبؔ کے احساسِ مروّت و جذبۂ اخلاق، فراخ دلی، بلند حوصلگی اور قوّتِ حافظہ کے تعلق سے معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ حالیؔ کے مطابق غالبؔ بلا امتیاز مذہب و ملت ہر ایک سے ملتے اور اس کی غم خواری کرتے۔ ان کا اپنے دوستوں کے ساتھ سلوک ہمیشہ مہر و وفا کا رہتا تھا۔ خطوں کا جواب لکھنا وہ فرض عین سمجھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے کلام پر اصلاح بھی دیا کرتے تھے اور باوجود بیماری و ناتوانی کے اصلاح کا کام سرانجام دیتے تھے۔ ریاستِ میسور کے شہزادے نے جب ان کی روانہ کردہ کتاب کی قیمت دریافت کی تو غالبؔ کی خودداری کو ٹھیس پہنچی۔ فارسی زبان میں انہوں نے جو خط شہزادے کو لکھا اس میں یہ بھی لکھ دیا کہ وہ سخنور ہیں سوداگر نہیں اور نہ ہی وہ کتاب فروش ہیں۔ زیرِ نظر اقتباس سے غالبؔ کی فطرت کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے وہ اپنا نیا چوغا اپنے نادار دوست کو یہ کہہ کر پیش کر دیتے ہیں کہ انہیں چھینٹ کا فرغل بے حد پسند آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ غالبؔ کی نفاست طبع یہ برداشت نہیں کر سکی کہ جس کپڑا کا لباس وہ خود کبھی نہیں پہننا چاہیں گے اسے ان کا دوست محض اس لئے زیبِ تن کرے کہ بدقسمتی سے اس کا وقت بگڑ گیا ہے۔

حالیؔ نے غالبؔ کی بے پناہ قوّتِ حافظہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ غالبؔ کتابیں خریدتے نہیں کرایے پر منگاتے ہیں اور پڑھ کر واپس کر دیتے ہیں مگر کام کی بات ذہن پر نقش ہو جاتی ہے۔ اسی طرح رات کو کمر بند میں لگائی گئی گرہیں صبح کھلتی جاتی ہیں اور رات میں کہے ہوئے اشعار یاد آتے جاتے ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ کس قدر جیتا جاگتا ہوا ذہن اردو کے اس عظیم شاعر کا ہے۔ اور ساتھ ہی جذبۂ انسانیت سے پیمانۂ دل بھی لبریز ہے۔ حالیؔ نے کتاب کی ابتدا ہی میں کہیں تحریر کیا تھا کہ وہ محض غالبؔ کے ملکۂ شاعری کو ہی سوانح کا موضوع بنانا چاہتے ہیں اور شخصیت کا تعارف محض اتنا ہی کرائیں گے جس قدر ان کے شاعرانہ مقام و مرتبے کو سمجھنے میں یہ تعارف معاون ہوگا۔ انہوں نے اس کا التزام بھی رکھا اور یہ کوشش کی کہ غالبؔ کی ذہانت و لطافت اور اس کے ساتھ ان کا جذبۂ انسانی بھی سامنے آئے تاکہ ان کی شاعری میں جو انسان دوستی کی فضا ہے اور مسائل حیات و کائنات کے تعلق سے جو سوالات ان کی شاعری قائم کرتی ہے اس کے پسِ پشت ایک دردمند دل اور جاگتے ہوئے ذہن کی نشان دہی کی جا سکے۔

اقتباس بالا غالبؔ کی زبان دانی اور فنِ شعر گوئی پر ان کی گرفت سے بھی ہمیں واقف کراتا ہے۔ غالب فارسی کے زبردست عالم تھے اور انہیں امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ کسی دوسرے ہندوستانی کو فارسی زبان کا عالم تسلیم کرنے میں سخت تردد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ کلکتہ نے جب ان کی شاعری پر اعتراضات کیے اور مرزا قتیل نام کے ایک نومسلم کھتری کے کلام سے سند پیش کی تو غالبؔ نے اپنے خیالات کا بے جھجک اظہار کیا اور خسرو کے علاوہ کسی اور کو فارسی کا استاد تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ اقتباس ان تمام معاملات سے متعلق معلومات بھی بہم پہنچاتا ہے کہ کس طرح غالبؔ نے اساتذہ کے کلام سے دس دس بارہ بارہ سندیں اپنے موقف کی تائید میں پیش کیں۔ اس طرح حالیؔ نے محض چند صفحات میں غالبؔ کے مزاج اور ان کی فطرت نیز عادات واطوار کے ساتھ ان کی زبان دانی اور فنِ شاعری پر ان کی غیر معمولی گرفت سے ہمیں بخوبی واقف کرادیا ہے۔

09.09 خلاصہ

سوانح نگاری کی روایت کے ابتدائی نقوش ہمیں اہرامِ مصر کی اندرونی دیواروں پر ملتے ہیں۔ جن پر فراعنہ کے حالاتِ زندگی کندہ ہیں۔ اہلِ روم بھی سوانح نگاری کے فن سے واقف تھے۔ اہلِ یونان بھی اس سے بے خبر نہ تھے۔ سقراط کے شاگرد زنوفن نے ۳۹۰ سال قبل مسیح سقراط کی سوانح تحریر کی تھی۔ انگریزی ادب میں باسویل اور اسٹریچی کی تصنیف کردہ سوانح ادبی مقام ومرتبہ کی حامل ہیں۔ اردو میں بھی ابتدائی دَور میں بزرگانِ دین کے حالات وواقعات اور ملفوظات ملتے ہیں۔ ساتھ ہی بادشاہوں کے بھی حالاتِ زندگی اور کارنامے محفوظ کیے گئے ہیں لیکن جدید طرز کی سوانح کے معیار پر اگر اردو کی کوئی سوانح پوری اُترتی ہے تو وہ حالیؔ کی تصنیف کردہ ''یادگارِ غالب'' ہے جو اردو کے عظیم شاعر اسداللہ خاں غالبؔ کے حالات زندگی اور ان کے بحیثیت شاعر مقام ومرتبے کے تنقیدی جائزے پر مشتمل ہے۔

حالیؔ ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان ہرات سے ہندوستان آیا تھا اور وہ صحابیِ رسول حضرت ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں سے تھے۔ حالیؔ کے والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا جن کا انتقال حالیؔ کی کم عمری میں ہی ہوگیا تھا۔ والدہ بھی بیمار رہتی تھیں اور وہ بھی جلد ہی انتقال کر گئیں۔ حالیؔ کے بڑے بھائی اور بڑی بہن نے ان کی پرورش کی۔ حصولِ علوم کا شوق انہیں دلی لے گیا اور یہیں ان کی ملاقات غالبؔ سے ہوئی۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ غالبؔ کے دوستوں میں تھے۔ حالیؔ کو انہوں نے اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کر دیا اور اس طرح ان کی ملازمت کا بندوبست ہوگیا۔ بعد میں حالیؔ نے لاہور میں گورنمنٹ پنجاب کے بک ڈپو میں بھی ملازمت کی۔ حالیؔ نے پہلی ملازمت دلی آنے سے قبل حصار میں اختیار کی تھی۔ لاہور کی ملازمت میں حالیؔ کا کام انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی عبارت درست کرنا تھا۔ اس سے حالیؔ کو انگریزی زبان کی کتابوں کے مواد سے بھی واقفیت ہوگئی اور یہی ان کے جدید نظریات اختیار کرنے کی وجہ بھی بنی۔ سرسید سے حالیؔ کی ملاقات دہلی میں ہوئی اور وہ دل وجان سے سرسید تحریک کے ہم نوا ہوگئے۔ سرسید کے کہنے پر حالیؔ نے مسدّس مدوجزر اسلام لکھا جو بے حد مشہور ہوا۔ ریاستِ حیدرآباد سے وظیفہ بھی ملا اور حالیؔ نے لاہور کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور پانی پت میں آکر تصنیف وتالیف میں مصروف ہوگئے۔ یہیں رہ کر حالیؔ نے حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید جیسی سوانح تحریر کیں۔ ایک بھرپور ادبی وعلمی زندگی گزارنے کے بعد جو ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو حالیؔ کا انتقال ہوا۔

حالؔی کی شخصیت ہمہ جہت تھی وہ بیک وقت شاعر، ادیب، ناقد، سوانح نگار اور مترجم سبھی کچھ تھے۔ اگر ایک طرف انہوں نے حیاتِ سعدی اور یادگارِ غالب جیسی سوانح لکھی ہیں تو دوسری طرف مسدّس مدوجزر اسلام جیسی نظم بھی لکھی اور ساتھ ہی مقدمہ شعروشاعری بھی جسے ہم آج بھی اردو تنقید کی پہلی باقاعدہ کتاب تسلیم کرتے ہیں۔ حالؔی کی شاعری ابتدا میں روایتی طرز کی رہی ہے لیکن بعد میں انہوں نے سرسید کے زیر اثر اصلاحی نقطۂ نظر بھی اپنا لیا۔ حالؔی کی ابتدائی شاعری بھی اپنی ایک الگ شناخت رکھتی ہے اور اگر وہ قدیم روش پر قائم رہتے تو غالبؔ کے بعد اردو غزل کے دوسرے بڑے شاعر ہوتے۔ بحیثیت ناقد بھی حالؔی کا مقام انتہائی بلند ہے۔ مقدمہ شعروشاعری لکھ کر انہوں نے باقاعدہ اردو تنقید کی بنیاد ڈالی ہے۔ حالؔی سے قبل تنقیدی شعور ضرور موجود تھا لیکن اُصول انتقادیات واضح نہیں تھے۔ حالؔی کی شہرت بحیثیت سوانح نگار بھی ہے۔ اردو میں سوانح نگاری کی روایت کا آغاز حالؔی سے ہی ہوتا ہے۔ حیاتِ سعدی اور حیاتِ جاوید کے ساتھ ہی انہوں نے یادگارِ غالب جیسی سوانح لکھی اور غالبؔ کو جیتا جاگتا ہمارے سامنے لا کھڑا کیا۔

''یادگارِ غالب'' سوانح نگاری کے اُصولوں پر پوری طرح قائم ہے۔ حالؔی نے صاحبِ سوانح کے محاسن ومعائب دونوں بیان کیے ہیں اور ان تمام واقعات وحالات پر روشنی ڈالی ہے جن سے غالبؔ کی شخصیت کا خاکہ مکمل ہوتا ہے۔ ہم حالؔی کی اس تصنیف کو اردو کی سب سے مکمل اور بہتر سوانح قرار دے سکتے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۰﴾ ریاستِ میسور کے شہزادے کو غالبؔ نے کیا جواب دیا؟

﴿۱۱﴾ حالؔی کا انتقال کب ہوا؟

﴿۱۲﴾ غالبؔ کس واحد ہندوستانی شاعر کو زبان فارسی کا عالم تسلیم کرتے تھے؟

09.10 فرہنگ

اتالیق	: تربیت دینے والا	گراں مایہ	: قیمتی
استفادہ	: فائدہ حاصل کرنا	گنجلک	: اُلجھا ہوا
بصیرت	: دیکھنے کی صلاحیت، دانائی، آگاہی	قدما	: قدیم لوگ، پرانے لوگ
تقدیم	: فوقیت، برتری، پیش قدمی	محاسن	: خوبیاں، اچھائیاں
خانگی	: گھریلو، گھر سے متعلق	مدوجزر	: اتار چڑھاؤ
درایت	: کسی بات کی تحقیق کرنا	مساعی جمیلہ	: اچھی کوششیں کرنا
روایت	: کسی بات کی نقل یا پیروی	معائب	: برائیاں، عیوب، خامیاں
روش	: راستہ		

09.11 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : حیاتِ جاوید کی خصوصیات پر تبصرہ کیجیے۔

سوال نمبر۲ : یادگار غالب کے اُسلوب وطرزِ ادا پر مضمون لکھیے۔

سوال نمبر۳ : سوانح نگاری کے فن پر حالؔی کی تحریر کردہ سوانح کے حوالے سے بحث کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : ''یادگارِ غالب'' پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۲ : حالؔی کی زندگی کے اہم واقعات تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۳ : ''یادگارِ غالب'' میں تاریخی تسلسل پر نوٹ لکھیے۔

09.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ حالؔی	از	مالک رام
۲۔ کلیات نثر حالؔی	از	محمد اسمٰعیل پانی پتی
۳۔ نقشِ حالؔی	از	نورالحسن ہاشمی واحتشام حسین
۴۔ یادگار حالؔی	از	صالحہ عابد حسین
۵۔ یادگار غالبؔ	از	الطاف حسین حالؔی

09.13 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ خواجہ ایزد بخش

﴿۲﴾ خستہؔ

﴿۳﴾ سرسید کی فرمائش پر

﴿۴﴾ سرسید کی تحریک پر

﴿۵﴾ مسلمانوں کا دَورِ عروج اور ان کا زوال

﴿۶﴾ سادگی، اصلیت اور جوش

﴿۷﴾ ڈاکٹر سید شاہ علی نے

﴿۸﴾ صاحب سوانح کے محاسن ومعائب دونوں بیان کر دیے جائیں۔

﴿۹﴾ سادہ، سلیس اور شستہ

﴿۱۰﴾ مرزا غالبؔ نے جواب دیا کہ وہ سخن وَر ہیں، سوداگر نہیں اور نہ ہی وہ کتاب فروش ہیں۔

﴿۱۱﴾ اَمیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ

﴿۱۲﴾ ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء

اکائی 10 : یادگارِ غالب کی سوانحی خصوصیات

ساخت

10.01 : اغراض ومقاصد

10.02 : تمہید

10.03 : یادگارِ غالب: شخصیت کا انتخاب

10.04 : یادگارِ غالب: شخصیت کا ارتقا

10.05 : یادگارِ غالب: واقعات کا انتخاب

10.06 : خلاصہ

10.07 : فرہنگ

10.08 : نمونہ امتحانی سوالات

10.09 : حوالہ جاتی کتب

10.10 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

10.01 اغراض ومقاصد

سوانح تاریخ کی ایک اہم شاخ ہے لیکن بعض خصوصیات کی بنا پر اِس صنف کا شمار ادب میں بھی کیا جاتا ہے۔ اب سوانح میں محض انسان کی پیدائش، خاندان، تعلیم اور موت وغیرہ ہی کے حالات نہیں ہوتے بلکہ سوانح اب انسان کی شخصیت کے ظاہر و باطن، عادات واطوار، اخلاق وآداب، زندگی کے سرد وگرم حالات اور ذہنی ونفسیاتی کیفیات وغیرہ کی ایک دل چسپ داستان بن گئی ہے۔

سوانح نگاری اردو ادب کی دیگر ادبی اصناف کی طرح ہی ایک اہم صنف تسلیم کی جاتی ہے۔ سوانح نگاری میں کسی شخصیت کی تمام جہات مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اردو ادب میں بہت ساری گراں قدر سوانح عمریاں لکھی گئیں ہیں۔ سوانحِ عمری کو اردو ادب کے غیر افسانوی ادب کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس اکائی میں آپ ''یادگارِ غالبؔ'' کی ادبی وفنی خصوصیات سے واقفیت حاصل کریں گے۔ اکائی کے آخر میں اکائی کا خلاصہ، مشکل الفاظ کے معانی، نمونۂ امتحانی سوالات اور حوالہ جاتی کتب کی فہرست کے ساتھ ساتھ ''اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے'' کے تحت کچھ سوالات بھی دیے گئے ہیں جن سے آپ اپنے مطالعے کی جانچ کر سکتے ہیں۔ آپ کی مزید آسانی اور سہولت کے پیشِ نظر آخر میں اُن سوالات کے جوابات بھی دیے گئے ہیں۔

10.02 تمہید

سوانحِ عمری کسی انسان کی پیدائش سے موت تک کے نظریات، افکار، اعمال اور عادت واطوار وغیرہ کے بیان کا نام ہے۔ انگریزی کی مستند آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق سوانح نگاری بطور ادبی صنف ''اَفراد کی زندگی کی تاریخ ہے۔'' اردو ادب میں سوانح نگاری کے اولین نقوش ہمیں اپنے اَسلاف کی تاریخ وسیرت کی گراں قدر کتب اور تذکروں میں منتشر نظر آتے ہیں۔ عمومی طور پر یہ تصنیفات ہمارے اسلاف کے حالات وملفوظات پر مشتمل ہیں۔ ''یادگار غالبؔ'' سے پہلے مرزا غالبؔ کا تذکرہ سرسیّد احمد خان کی تاریخی کتاب ''آثار الصنادید'' اور مولانا محمد حسین آزادؔ کے تذکرے ''آبِ حیات میں'' اجمالی طور پر ملتا ہے۔ میر تقی میرؔ نے ''نکات الشعرا'' میں، قائم چاند پوری نے ''مخزنِ نکات'' میں اور سید فتح علی حُسینی گردیزی نے ''تذکرہ ریختہ گویاں'' میں اپنے وقت کے اہم شاعروں کے حالات ونظریات کا مختصر ذکر کیا ہے۔

سوانح نگاری ہمارے اُن ذی مرتبت بزرگوں کی لازوال یادگار ہے جنھوں نے اپنی نمایاں کوششوں سے دنیا میں کمالات اور نیکیاں پھیلائی ہیں اور انسان کی آئندہ نسلوں کے لئے اپنی مساعیِ جمیلہ کے عمدہ نمونے چھوڑے ہیں۔ الطاف حسین حالیؔ نے جدید سوانح نگاری کی بنیاد رکھی۔ بقولِ آلِ احمد سرور:

''اُنھوں نے سب سے پہلے جدید اُردو سوانح نگاری کو تذکرہ کی رَوِش سے آزاد کیا۔''

اِس طرح مولانا حالیؔ کا شمار جدید سوانح نگاری کے بنیادگزاروں میں کیا جاتا ہے۔

مولانا محمد حسین آزادؔ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''آبِ حیات'' لکھ کر سوانح نگاری کے لئے بعد میں آنے والے سوانح نگاروں کی راہ نمائی کا فریضہ بہ حُسن وخوبی انجام دِیا ہے۔ آبِ حیات میں اگر چہ محمد حسین آزادؔ نے شعرا کی ہمہ جہات شخصیات کے خاکے پیش نہیں کیے ہیں لیکن متقدمین شعرا سے واقفیت اُسی شاہ کار کتاب کی مرہونِ منت ہے۔ آبِ حیات میں مرزا غالبؔ کا ذکر اگر چہ قدرے تفصیل سے ہے لیکن وہ سوانح کے حوالے سے نشنہ ہے۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ کی تصنیف یادگارِ غالبؔ، مرزا غالبؔ کی زندگی پر مشتمل پہلی سوانح ہے جس میں مرزا غالبؔ کی زندگی کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ مرزا کی نثر نگاری اور شاعری کا تجزیہ ومحاکمہ بھی کیا گیا ہے۔ حالاں کہ اس میں سوانحی مواد زِیادہ نہیں ہے بلکہ اس کا اکثر حصّہ کلامِ غالبؔ اور ادبی کارناموں پر مشتمل ہے۔ مرزا کی ادبی میراث کی افہام وتفہیم کا سلسلہ یادگار غالبؔ سے شروع ہوتا ہے۔

10.03 یادگارِ غالب: شخصیت کا انتخاب

شخصیت کا انتخاب سوانح نگاری میں ایک اہم اور لازمی جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔ سوانح نگاری میں کسی خاص میدان سے تعلّق رکھنے والی معروف ومشہور شخصیت کی زندگی کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اس ضمن میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ جس کی سوانح لکھی جاتی ہے، اُس کی زندگی پر وافر مواد دَست یاب ہونا چاہیے کیوں کہ مستند مواد کی کم یابی عمدہ اَور معیاری سوانح کی راہ میں رُکاوٹ پیدا کرتی ہے، اِسی لئے مواد کی فراہمی ایک مشکل ترین عمل تصور کیا جاتا ہے۔

انسان کی زندگی مختلف قسم کے حالات کا مرقع ہے جس میں ہر ایک واقعہ سوانح کے لحاظ سے اہم نہیں ہوتا ہے۔ سوانح نگار کی ذمے داری یہ ہے کہ وہ اُنھی واقعات کا انتخاب کرے جن سے شخصیت کی ذات پر روشنی پڑتی ہو۔ سوانح میں غیر اہم واقعات سے گریز کیا جانا

چاہیے۔سوانح لکھتے وقت واقعات کی ترتیب کا خیال رکھنا ایک ضروری اَمر ہے۔شخصیت کی زندگی کے نشیب وفراز، پیچ وخم،خوشی وغمی حتی کہ پیدائش سے لے کر وفات تک کے تمام حالات کو ترتیب کے ساتھ پیش کیا جانا چاہیے کیوں کہ واقعات کی ترتیب وتسلسل سوانح کا معیار طَے کرتے ہیں۔سوانح میں اس دور کے تاریخی،سیاسی،معاشی اور معاشرتی حالات کا ذکر کیا جاتا ہے کیوں کہ جس ماحول میں ہماری پرورش و پرداخت ہوتی ہے وہ ماحول ہماری زندگی پر ضرور اثر انداز ہوتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ آبِ حیات کس کی کتاب کا نام ہے؟

﴿۲﴾ سوانح نگاری کی آسان تعریف کیجیے۔

﴿۳﴾ آثارالصنادید کا مصنف کون ہے؟

۱۸۶۹ میں جب مرزا غالبؔ کا انتقال ہوا،اس وقت مولانا الطاف حسین حالؔی دلی میں ہی موجود تھے۔حالی کو مرزا سے ایک خاص قسم کی عقیدت واُنسیت تھی۔مولانا نے مرزا غالب کے حالاتِ زندگی اوران کی سیرت پر یادگار غالب کی شکل میں ایک ایسی شاہ کار کتاب تصنیف کی جسے مرزا غالب کے ادبی وعلمی کمالات سے روشناس ہونے کے لئے بنیادی ماخذ کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔

یادگار غالب کی یہ خوبی ہے کہ اس میں مرزا کے مستند حالاتِ زندگی قلم بند کیے ہیں اوراس میں ان کے کلام پر محققانہ وناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔مولانا الطاف حسین حالی کو مرزا کی خاص قربت حاصل تھی اور اسی خاص قربت کی بدولت حالی نے مرزا کی عادات واطوار کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔نتیجتاً مرزا کی شخصیت اوران کے تہذیبی وادبی افکار ونظریات کو انتہائی مستند طریقے سے پیش کیا ہے۔حالی کو مرزا کی صحبت سے استفادہ کرنے کے لئے کافی عرصہ میسر ہوا۔حالی نے مرزا کے ادبی کمالات کو سمجھنے اور گیرائی سے تجزیہ کرنے کے کام یاب سعی کی ہے۔

یادگار غالب کا دو تہائی حصہ مرزا کی نظم ونثر پر تبصرے سے متعلق ہے اور ایک تہائی حصے میں ولادت ،خاندان ،تعلیم،مسکن،سفر، تصانیف،قلعہ سے متعلق استعداد،اخلاق،عادات،خورد ونوش،استاد وشاگرد،دوست واحباب اور بیماری ووَفات کا ذکر کیا گیا ہے۔دوسرے حصے میں اردو،فارسی نظم ونثر پر رِیویو(Review) اور دوسرے شعرا سے مقابلہ وموازنہ کر کے فنی مرتبہ متعین کیا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی نے غالب کی زندگی سے متعلق اہم گوشوں پر روشنی ڈالی ہے لیکن یہ ضمنی وسرسری طور پر بیان کیا ہے۔حالی نے مرزا کی شخصیت سے زیادہ ان کے کلام وفن پر زور دیا ہے۔مولانا حالی اس کے متعلق خود رقم طراز ہیں:

> ''اصل مقصود اس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اس عجیب وغریب ملکہ کا لوگوں پر ظاہر کرنا ہے جو خدائے تعالیٰ نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا۔''

اس کے متعلق مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مرزا کی تمام لائف میں کوئی بڑا کام ان کی شاعری اور انشا پردازی کے سوا نظر نہیں آتا مگر صرف اسی ایک کام نے ان کی لائف کو دارالخلافے کے اخیر دَور کا ایک مہتم بالشان واقعہ بنا دیا اور میرا خیال ہے کہ اس ملک میں فارسی نظم ونثر کا خاتمہ ہو گیا۔''

یادگارِ غالب مطالعہ غالب کے نظریے سے ایک بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔ مرزا غالب کی حیات اَور ادبی خدمات کے حوالے سے متاخرین نے جتنی کتابیں لکھی ہیں سب نے مولانا حالی کی ''یادگار غالبؔ'' سے ہی اکتسابِ فیض کیا ہے۔

یادگار غالب سے پہلے مرزا غالب کی زندگی سے متعلق معلومات مختصر طور پر سرسید احمد خان کی آثار الصنادید اور شیفتہ کی ''گلشنِ بے خار'' وغیرہ میں بیان کی گئی ہے لیکن ان کی حیثیت محض ضمنی ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے مرزا غالب کی حیات میں قریباً ایک دہائی تک اُن کی صحبت میں رہ کر ان کی زندگی کا انتہائی باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کیا تھا۔ حالی نے غالب کے حالاتِ زندگی کے سلسلے میں مرزا کے خطوط سے بھی بہت استفادہ کیا ہے۔

سوانح نگار کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جس کی سوانح لکھی جائے، اُس کی زندگی کے اہم واقعات کے بیان میں تاریخی تسلسل قائم رہے۔ حالی نے یادگارِ غالب میں مرزا کی شخصیت کے تدریجی اِرتقا کا خاصا خیال رکھا ہے اور غالبؔ کی حیات سے متعلق اہم باتوں کو اس پیرائے میں بیان کیا ہے کہ مرزا کی شخصیت کا تدریجی خاکہ ابھر کر قاری کے سامنے آجاتا ہے۔

یادگارِ غالبؔ میں غالبؔ کی تاریخِ ولادت، ان کے خاندان، تعلیم و تربیت، شکل وصورت، مولد و مَسکن، جذبۂ کتب بینی، کلکتے کے سفر، قید و بند کے واقعے، اولاد، دستنبو کی تصنیف، اخلاق و آداب، فراخ حوصلگی، مروت، سخن سنجی اور ملکۂ ظرافت وغیرہ کے عنوانات قائم کرتے ہوئے تاریخی تسلسل کو برقرار رکھا گیا ہے۔ تاریخی تسلسل کا مطلب یہ ہے کہ جس کی سوانح لکھی جائے، اس کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات جو پہلے ہوئے ہیں، اُنہیں پہلے اور جو بعد میں ہوئے ہیں، اُن کا ذکر بعد میں کیا جائے۔

سوانح نگاری کا ایک بنیادی اُصول یہ بھی ہے کہ بنیادی ماخذ سے اِستفادہ کیا جائے۔ حالؔی نے خود مرزا غالبؔ کی قربت حاصل کی تھی۔ اس وجہ سے مولانا نے غالب کی زندگی کے نشیب و فراز بذات خود دیکھے تھے پھر بھی بنیادی ماخذ سے استفادہ کیا ہے۔۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''میں نے مرزا کی تصانیف کو دوسروں سے مُستعار لے کر جمع کیا اور جس قدر ان میں ان کے حالات اور اخلاق و عادات کا سراغ ملا، قلم بند کیا۔ جو باتیں اپنے ذہن میں محفوظ تھیں یا دوستوں سے زبانی معلوم ہوئیں، ان کو بھی ضَبطِ تحریر میں لایا۔''
>
> (یادگارِ غالب، ص ۳)

یادگارِ غالب کا دوسرا حصہ مرزا غالب کے کلام کے رِیویو پر مشتمل ہے۔ حالی نے کتاب کے دیباچے میں ہی اس امر کی صراحت کر دی تھی اور اس حصے کا نام بھی ''دوسرا حصہ مرزا کے کلام پر ریویو اور اس کا انتخاب'' رکھا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یادگار غالب کا اصل مقصد ان کے فن پر گفتگو کرنا ہے۔ اس طرح سے یادگار غالب کی حیثیت سوانح کی کم اور مرزا کی شاعری پر تبصرے کی زیادہ ہوگئی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۴﴾ مرزا غالب کے انتقال کے وقت مولانا الطاف حسین حالؔی کہاں موجود تھے؟

﴿۵﴾ تاریخی تسلسل کا کیا معنی ہے؟

﴿۶﴾ یادگارِ غالب کب لکھی گئی؟

ایک کام یاب سوانح نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ شخصیت کا انتخاب کرتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھے اس کی سوانح اس میدان سے متعلق افراد کے لئے کارگر ثابت ہو۔اس کی سوانح کا ہیرو ادبی،سماجی،ثقافتی وسیاسی لحاظ سے اہم ہو۔حالؔی نے مرزا کی شخصیت کا انتخاب کر کے سوانح کی افادیت واہمیت کو اور زیادہ بڑھا دیا ہے۔مرزا کی زندگی سے متعلق معلومات دیگر کتابوں میں اگر چہ پہلے بھی موجود تھیں لیکن ان کی نوعیت محض ضمنی تھی۔

الطاف حسین حالؔی نے تین شخصیات کی سوانح عمریاں قلم بند کی ہیں اور جہاں تک انتخاب شخصیات کا تعلق ہے حالی نے اپنے اس فن سے متعلق اہم اور لازوال شخصیات کا انتخاب کیا ہے۔حالی نے ان سوانح عمریوں کے ذریعے قدیم اردو کو مستقل اور باقاعدہ سوانح عمریوں سے روشناس کیا ہے۔مولانا نے شیخ سعدی جیسے فارسی کے عظیم شاعر ومفکر کی سوانح عمری ''حیات سعدی'' کے نام سے لکھی۔اردو میں یہ پہلی سوانح عمری ہے جسے طرز جدید کی سائنٹفک بایوگرافی کا بہترین نمونہ کہا جاسکتا ہے۔

حالؔی نے علی گڑھ تحریک کو بہت قریب سے دیکھا تھا جس کے روحِ رواں سرسید احمد خان تھے۔سرسید اپنے خیالات ونظریات سے اُردو ادب کو مقصدیت وافادیت کی طرف مائل کرنا چاہتے تھے۔سرسید کے دیگر رفقا کے ساتھ ساتھ حالؔی نے اس مقصد کی حصول یابی کے لئے ''حیات سعدی'' لکھ کر نمایاں کام انجام دیا۔حالؔی سے قبل اردو سوانح نگاری پر کوئی خاطر خواہ کام نہیں ہوا تھا جس کا احساس حالی کو بہت پہلے سے تھا اس کے متعلق ''حیات سعدی'' میں تحریر کرتے ہیں:

> ''ہمارے ملک میں بیوگرافی کی طرف اب تک کچھ خاص توجہ نہیں ہوئی۔ملک کی عام زبان یعنی اردو میں اب تک یا تو یورپ کے بعض مشہور لوگوں کے حالات انگریزی سے ترجمہ ہوئے ہیں یا ایسے لوگوں کے سوانح لکھے گئے ہیں جن کے حالات پڑھ کر کوئی عمدہ تحریک دل میں پیدا نہیں ہوتی۔''

عمدہ ومعیاری سوانح کی خاصیت یہ ہے کہ شخصیت کا انتخاب کرتے وقت اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس کے حالات زندگی پڑھ کر قاری یا طالب علم کی معلومات میں اضافے کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی میں بھی کچھ نہ کچھ عملی تبدیلیاں ضرور پیدا ہوں۔حالؔی کو اس بات کا خاصا علم تھا کہ مرزا کی سوانح عوام الناس کے ساتھ ساتھ ادبی حلقے میں بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔حیات سعدی کے دیباچے میں اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اگر چہ اسلام کے قدیم مصنفوں میں بے شمار لوگ ایسے گزرے ہیں جن کی عظمت اور جلالت کے سامنے شیخ (سعدی) کا کچھ رتبہ نہیں ہے مگر ہم نے سب سے اول شیخ کا حال اس لئے لکھا ہے کہ ہندوستان میں ان سے زیادہ کوئی مصنف مقبول اور مشہور نہیں۔''

جس طرح قدما میں شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے فارسی شاعری میں لاثانی کام کیا ہے اسی طرح اردو ادب میں مرزا کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔مولانا حالؔی نے مرزا کی زندگی کے اہم واقعات کے ذریعے ان کی شخصیت کو اردو ادب سے روشناس کرانے کی کام یاب سعی کی ہے۔

10.04 یادگارِ غالب: شخصیت کا ارتقا

سوانح میں شخصیت کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے اہم حالات و واقعات کا ذکر تدریجی اعتبار سے ہونا بے حد اہم ہے یعنی جو واقعات پہلے رونما ہوئے ہیں ان کا ذکر سب سے پہلے اور جو بعد میں ہوئے ہیں ان کا ذکر بعد میں کیا جائے۔ سوانح میں اس بات کا خیال نہ رکھا جائے تو شخصیت کو کما حقہ سمجھنے میں انتہائی دشواری پیش آتی ہے۔

الطاف حسین حالؔی نے اس سوانح میں مرزا کی زندگی کے اہم وضروری واقعات تحریر کرتے وقت زمانی ترتیب کا خاصا خیال رکھا ہے۔ یادگارِ غالبؔ کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات آشکار ہو جاتی ہے کہ حالی سوانح نگاری کے رموزِ اوقاف سے مکمل طور پر واقفیت رکھتے تھے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم اس پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حالؔی کو واقعات سمیٹ کر نتیجہ نکالنے کا سلیقہ اور پھر انہیں اعتدال و خلوص کے ساتھ پیش کرنے کا جو ملکہ ہے اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔''
>
> (حالی کی اردو نثر نگاری)

حالؔی کی سوانح نگاری کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے مرزا کی زندگی کی زندہ و دل کش تصویر پیش کی ہے۔ حسن و قبح کا اتنا متوازن امتزاج کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتا ہے۔ حالؔی نے مرزا کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کی برائیوں کا ذکر بھی بہت ایمان داری و غیر جانب داری سے کیا ہے۔ غالب کے کردار سے متعلق کمزوریوں کا ذکر بھی اسی نہج و انداز میں کیا ہے جس طرح ان کے فضائل و مناقب کا ذکر کیا ہے۔

عشق و معاشقے، شراب نوشی و بادہ خواری، قمار بازی، قرض بازی جیسی بری و مذموم خصلتوں کی وجہ سے غالبؔ کو بار بار قید خانے کی سیر کرنی پڑی تھی جس کا ذکر یادگار غالب میں تفصیل سے کیا گیا ہے۔ مرزا غالب کی زندگی کے تاریک و روشن پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے خطوط غالب کو بنیادی ماخذ کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ مرزا غالب کی جتنی جان دار و شان دار تصویر کشی حالی نے پیش کی ہے تا ہنوز کسی سے نہیں ہو سکی۔ حالی نے مرزا کی تصنیفات سے اقتباسات نقل کر کے اُن کی تشریح سے ان کے کردار کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

غالب کی زندگی کے تمام تر حالات کا ارتقا بتدریج عمل میں آیا ہے۔ غالب کا خاندان، ان کی ولادت، تعلیم، ازدواجی زندگی، شکل و صورت، بود و باش کا طریقہ، کلکتہ و لکھنؤ کا سفر، دوران تعلیم ادبی و علمی معرکے، سرکاری ملازمت سے انکار، قمار بازی میں قید و بند کی مصیبت، بادشاہ کا استاد ہونے کا اعزاز، مغلیہ خاندان کی تاریخ لکھنے کی ذمے داری، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی جامع تفصیل پیش کرنے کی غرض سے ''دستنبو'' کی تصنیف، نوابین رام پور سے روابط و مراسم اور دربار رام پور سے وظائف کا حصول، عادات و اطوار، انداز شعر خوانی، شعر دانی و شعر فہمی، مے خواری کی حالت، داد سخن، بیماری و موت کی آرزو، تاریخ وفات جیسے موضوعات پر مختصر لیکن علم افزا معلومات و تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔

حالی نے مرزا کی تصنیفات سے اقتباسات کے علاوہ ان کے کلام کے انتخابات اور ان کی تشریح سے ان کے کردار کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر سید شاہ علی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ادیبوں کی حیات کی خوبی یہ ہے کہ ان کا خودنوشتہ مواد بھی ادبی حیثیت رکھتا ہے اور سوانح نگار سے عموماً صرف انتخاب وترتیب کی صلاحیت چاہتا ہے۔ اولیت کی وجہ سے اس میں مختصراً ہی سہی وہ تمام سوانحی مواد آ گیا ہے جو ان کی خودنوشتہ تحریوں اور گفتگو سے اخذ کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ غالب سے متعلق ہر نئی تصنیف کو اسی مناسبت سے مقبولیت حاصل ہوگی جس مناسبت سے اس میں غالب کی رنگارنگ شخصیت کے بارے میں نئے مواد یا معلومات کو پیش کیا جائے گا۔''

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۷﴾ حالی نے سرسید احمد خان کی حیات وخدمات پر کون سی کتاب لکھی؟

﴿۸﴾ کتاب ''حالی کی اردو نثر'' کے مصنف کا نام کیا ہے؟

﴿۹﴾ حالی نے سرسید احمد خان کی کون سی تحریک کو بہت قریب سے دیکھا تھا؟

10.05 یادگارِ غالب: واقعات کا انتخاب

حالی نے یادگار غالب کے پہلے حصے میں مرزا کے حالات زندگی لکھنے کے بعد حصۂ دوم میں ان کے کلام کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ پہلے حصے میں غالب کی زندگی کے اہم ترین واقعات کا انتخاب کرتے وقت حالی نے اپنی سوانحی لیاقت کا استعمال کیا ہے۔ حالاں کہ حالؔی نے بہت سے اہم واقعات کو سلیقے سے پیش کیا ہے لیکن ان میں وہ گہرائی نہیں ہے جس کی امید حالی جیسے سوانح نگار سے کی جا سکتی تھی۔ اس نکتے کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چنانچہ حالی نے غالب کے سرسری واقعات نقل کر دیے ہیں جس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ انہوں نے اقامت کے موقعوں سے فائدہ نہیں اٹھایا ورنہ کم سے کم ان کو غالب کی حیات کے بدیہی پہلوؤں پر ضرور روشنی ڈالنی چاہیے تھی۔ فن سوانح نگاری کے اہم خدوخال میں شخصیت کے محاسن اور معائب کا تذکرہ ضروری ہے۔ مولانا حالی نے مرزا کے محاسن کے ساتھ معائب کا ذکر کیا مگر معائب بیان کرتے وقت بہت احتیاط سے کام لیا گیا۔''

مرزا غالب میں بذلہ سنجی، حاضر جوابی وظرافت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ سنجیدہ موضوعات میں بھی مزاح پیدا کر دیا کرتے تھے۔ اس کے متعلق حالی لکھتے ہیں:

''ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر ان کو بجائے حیوان ناطق کے حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔ حسن بیان، حاضر جوابی اور بات میں بات پیدا کرنا ان کی خصوصیات میں سے تھا۔ الغرض مرزا کی کوئی بات بھی لطف وظرافت سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ اگر کوئی ان کے تمام ملفوظات جمع کرتا تو ایک ضخیم کتاب لطائف کی تیار ہو جاتی۔''

(یادگار غالبؔ ص ۸۱)

حالؔی نے مرزا کے اس حسن کو اس انداز میں پیش نہیں کیا جس کی توقع ان سے کی جاسکتی تھی۔انہوں نے اس کو بیان کرنے میں ایک طرح سے کنجوسی اور سستی سے کام لیا ہے۔ایسا بھی نہیں کہ حالی کو اس بات کا احساس نہیں تھا کہ وہ اس موضوع پر مزید معلومات عام لوگوں کے سامنے لا سکتے تھے اور عمداً اس سے گریز کیا ہے۔دراصل حالی اس تعلق سے ایک رسالہ تصنیف کرنا چاہتے تھے۔اس کے متعلق ڈاکٹر سید شاہ علی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حالی نے غالب کی ظرافت اور بذلہ سنجی کے معاملے میں کنجوسی سے کام لیا ہے اور اس عذر پر کہ ان کے لطائف وظرائف کے لئے ایک مستقل رسالہ چاہیے ان کو ان کی یادگار میں درج کرنے سے احتراز کیا ہے اور اردو کو ان کی شخصیت کے مزید تجزیہ کے مواقع سے محروم کر دیا ہے۔''

یادگار غالبؔ کی بہت سی خوبیوں کے باوجود اس میں بہت سی خامیاں موجود ہیں۔حالؔی نے ان بیانات کو سرسری طور پر بیان کر دیا ہے۔دراصل حالی کا مقصد یہ تھا کہ مرزا کی شاعرانہ عظمت سے اردو دنیا کو صحیح معنوں میں متعارف کرایا جائے۔یہی وجہ ہے کہ یادگار غالب کے واقعات کی ترتیب اور ان کی چھان پھٹک میں تحقیق وجستجو کا عمل دخل کم ہے۔

ایک کامیاب سوانح نگار پر لازم ہے کہ وہ جس کی سوانح تحریر کر رہا ہے اس کی زندگی کے واقعات کو بیان کرتے وقت مکمل تلاش وجستجو کرے۔حالؔی نے مرزا غالبؔ کے سفر کلکتہ کے دوران لکھنؤ میں قیام کا ذکر کرتے ہوئے تحقیق سے کام نہیں لیا۔اس کے متعلق ڈاکٹر عبدالقیوم مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خواجہ صاحب کے نزدیک مرزا کی عمر کلکتہ پہنچتے وقت چالیس برس کی تھی، یہ صحیح نہیں۔مرزا کی پیدائش ۱۷۹۷ء میں ہوئی اور لکھنؤ میں ۱۸۲۷ء میں قیام کر کے وہ کلکتہ کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔اس طرح ان کی عمر تیس سال کے لگ بھگ قرار پاتی ہے۔''

غالبؔ کے والیانِ ریاستِ رام پور سے بھی بہت اچھے تعلقات ومراسم تھے۔مرزا کی حالت تنگی میں مختلف عہد یدارانِ سلطنت و حکومت نے وظائف کی صورت میں مالی امداد فراہم کی تھیں۔بہادر شاہ ظفرؔ سمیت مختلف ذرائع سے ملنے والے وظائف میں نواب رام پور کی طرف سے سب سے زیادہ وظیفہ دیا جاتا تھا لیکن حالؔی نے نواب صاحب کی ان نوازشات کا انتہائی سرسری طور پر بیان کیا ہے۔

حالی نے نوابین حیدرآباد کے ذکر کو سرے سے نظر انداز کر دیا ہے جب کہ مرزا نے والیانِ حیدرآباد کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لئے چند قصائد بھی لکھے تھے۔مرزا نے اس دربار سے بھی روابط پیدا کرنے کی کوشش کی اور نواب شمس الامرا اور سر سالار جنگ کی مدح میں قصائد بھی لکھے۔اس کا اعتراف خود مرزا نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''ان لوگوں نے کچھ قدردانی نہ فرمائی۔''

یادگار غالب سے مرزا کے عہد طفولیت کے متعلق تفصیلی جان کاری نہیں ملتی ہے۔مرزا کی زندگی کے ابتدائی حالات کے بارے میں کئی پہلو ایسے ہیں جن کے متعلق کوئی تشفی بخش معلومات وجوابات پیش نہیں کیے گئے ہیں۔مرزا کے بارے میں ایسے بہت سارے قابل ذکر واقعات ہیں جن کے متعلق حالی سے مزید معلومات وتحقیقات کی توقعات کی جاسکتی تھیں مثلاً غالب کے اساتذہ اور ان کے شاگردوں کے بارے میں کچھ زیادہ تفصیلات پیش نہیں کی ہیں۔

بقول ڈاکٹر عبدالقیوم:

''برہان قاطع اور قاطع برہان کے سلسلے میں جو ہنگامہ برپا ہوا اس پر مولانا نے سیر حاصل بحث نہیں کی ہے بلکہ واقعات کا رخ موڑ کر اسے محض علمی مباحث تک محدود رکھا ہے اور تذکرہ مخالفت کا حال لکھ دیا ہے۔ اس مخالفت کے اسباب اور پس منظر سے کوئی بحث نہیں کی ہے۔ مرزا نے جس طرح ہندی نژاد فارسی لغت نویسوں کا مذاق اڑایا ہے اور سلف پر نکتہ چینی کی ہے۔''

مولانا حالی اور شیخ اکرام نے مرزا کی تحقیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے ذریعے ایجاد اور وضع کردہ اصولوں کو لغت سازی و لغت فہمی میں بہت مفید بتایا ہے جب کہ قاضی عبدالودود نے اپنے مضمون ''غالب بحیثیت محقق'' (صفحہ نمبر ۱۸۳) پر مرزا کی تحقیقی خامیوں کی وضاحت کی ہے اور فن لغت اور اس کے طریق کار سے انہیں ناواقف بتایا ہے۔ اسی طرح کے خیالات پروفیسر شیرانی نے بھی پیش کیے ہیں۔

ایک عمدہ سوانح نگار کا اولین فریضہ ہے کہ وہ واقعات میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کا ازالہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان اہم واقعات کے متعلق اپنی تحقیقی رائے بھی پیش کرے۔ حالی نے مرزا کے کچھ پہلوؤں پر امید کے برعکس کم توجہ دی ہے۔ مرزا غالب کے اندر مروت، مصلحت، حق پرستی وحق گوئی، انصاف پسندی وغیرہ جیسی سبھی خصوصیات موجود تھیں جن کا ذکر خواجہ حالی نے یادگار غالب میں انتہائی سرسری طور پر کیا ہے۔ حالی نے ان خصوصیات پر توجہ نہ دے کر پوراز ور ظرافت و بذلہ سنجی پر صرف کر دیا ہے۔ حالی نے مرزا کی ان عادات کو جن سے ان کی شخصیت کی منفی تصویر ابھر کر سامنے آسکتی تھی، انتہائی خوب صورتی سے نظر انداز کر دیا ہے۔

مولانا حالی کو اس بات کا احساس تھا کہ کچھ باتوں میں جان بوجھ کر اختصار سے کام لیا ہے اور مرزا کی سوانح میں ناخوش گوار واقعات میں صرف نظر سے کام لیا ہے۔ بقول حالیؔ:

''مرزا کی لغزشیں خلقت کو دکھانی مقصود نہیں بلکہ انصاف اور حق پسندی کی شریف خصلت، جس کے بغیر انسان کبھی ترقی نہیں کرسکتا، مرزا کی ذات میں دکھانا مقصود ہے۔''

اچھی اور معیاری سوانح کا یہ اصول ہے کہ اس میں مناقب ونقائص میں توازن ہونا چاہیے۔ اگر سوانح میں صرف خصوصیات بیان کی جائیں تو وہ ایک عقیدت مند کا قصیدہ بن کر رہ جائے گا۔

الطاف حسین حالی کی سرسید کی حیات وخدمات پر لکھی کتاب ''حیاتِ جاوید'' کے متعلق حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام لکھے گئے خط میں شبلی نے ''حیاتِ جاوید'' کو سید صاحب کی یک رخی تصویر اور مدلل مداحی قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

''حیات جاوید کو میں لائف نہیں، کتاب المناقب سمجھتا ہوں اور وہ بھی غیر مکمل.....''

اس میں شک نہیں کہ حالی نے بہت سارے مقامات پر بے باکی سے کام لیا ہے لیکن بعض مواقع پر خاموشی اختیار کی ہے۔ حالی کی اسی کمزوری کی طرف پروفیسر آل احمد سرور نے بھی اشارہ کیا ہے:

''وہ وہاں بھی خاموش رہتے ہیں جہاں خاموشی گناہ ہے''۔

مولانا حالی نے ''سبد چین'' کو قلمی کتاب بتایا ہے لیکن بقول غلام رسول مہر سبد چین مرزا کی زندگی میں چھپ گئی تھی۔معلوم نہیں خواجہ مرحوم نے اسے قلمی کس بنا پر فرمایا ہے۔اسی طرح مرزا کی چند ایک تصانیف کا ذکر سہوا چھوٹ گیا ہے مثلاً حالی نے قادر نامہ کا ذکر چھوڑ دیا ہے۔ حالاں کہ غلام رسول مہر نے اس کا ایک نسخہ دریافت کیا لیکن مہر صاحب نے اس کو معتبر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

مرزا غالب کو زمانۂ طفولیت سے ہی چوسر اور شطرنج کھیلنے کی عادت پڑ گئی تھی بالفاظ دیگر ایک طرح کی لت پڑ گئی تھی۔کبھی کبھار مرزا کے دروازے پر ہی ان کے دوست احباب جمع ہو جاتے اور پوری ٹولی کھیل تماشے میں مشغول رہتی تھی۔پورے پورے دن ہنسی مذاق کی گرم بازاری رہا کرتی تھی۔اسی اثنا میں ایک کوتوال نے مرزا کو قمار بازی کے جرم میں گرفتار کر لیا اور چار ماہ کی قید یا اس کے عوض میں سو روپے جرمانہ ادا کرنے کے لئے کہا۔مرزا نے جرمانہ ادا کر کے اپنی جان وعزت دونوں بچائی۔مرزا کے آبا و اجداد سبھی ذی مرتبت اشخاص گزرے ہیں اس لئے مرزا کا اس میں گرفتار ہونا باعث ننگ و عار تھا۔

مولانا حالی نے مرزا کے ایک خط کا سہارا لے کر بہت صفائی سے واقعات اسیری وقید و بند کو مختصر بیان کر کے درگزر کر دیا ہے۔یادگار غالب میں اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''کوتوال شہر ان کا دشمن تھا اس لئے اس نے انہیں قمار بازی کے جرم میں گرفتار کر لیا۔''

کچھ اسی طرح کی رائے خواجہ حسن نظامی نے بھی پیش کی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کہتے ہیں کہ چوں کہ مرزا، حالی کے استاد اور ممدوح تھے اس لئے انہوں نے تفصیل نہیں لکھی، حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ ان دنوں مرزا کا مکان باقاعدہ قمار خانہ بن گیا تھا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:-

﴿۱۰﴾ حیات جاوید کو یک رخی تصویر اور مدلل مداحی کس ادیب نے قرار دیا ہے؟

﴿۱۱﴾ مرزا غالب کو کس جرم میں سو روپے جرمانہ ادا کرنا پڑا تھا؟

﴿۱۲﴾ مرزا غالب کو کس کھیل کی عادت پڑ گئی تھی؟

10.06 خلاصہ

ماہرین ادب نے سوانح کی مختلف تعریفات کی ہیں۔آسان الفاظ میں سوانح نگاری کسی انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک کے افکار ونظریات اور افعال کا بیان ہے۔ایک طرح سے سوانح کو انسان کی شخصیت کی عمدہ وخوب صورت تصویر کہا جا سکتا ہے۔انگریزی کی مستند آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق سوانح نگاری بطور ادبی صنف ''افراد کی زندگی کی تاریخ ہے''۔اردو ادب میں سوانح نگاری کے اولین نقوش ہمیں اسلاف کے گراں قدر تاریخی کتب، سیرت کی کتابوں اور تذکروں میں منتشر نظر آتے ہیں۔عمومی طور پر یہ تصنیفات ہمارے اسلاف کے حالات وملفوظات پر مشتمل ہیں۔

سوانح نگاری اردو ادب کی دیگر ادبی اصناف کی طرح ہی ایک اہم صنف تسلیم کی جاتی ہے۔سوانح نگاری میں ہم کسی شخصیت کی تمام جہات کا مطالعہ کرتے ہیں۔سوانح نگاری کا ایک اصول ہے کہ اس میں شخصیت کے محاسن ومعائب کو یکساں طور پر بیان کیا جاتا ہے۔حالی نے

اس بنیادی اصول کی حتی المقدور پابندی کرنے کی کوشش کی ہے۔حالی نے واقعات وحالات کے تدریجی ارتقا کا بھی خیال رکھا ہے۔واقعات میں تقدیم وتاخیر بے حد ضروری ہے۔

حالی کی سوانح نگاری کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے مرزا کی زندگی کی زندہ ودل کش تصویر پیش کی ہے۔حسن وقبح کا اتنا متوازن امتزاج کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتا ہے۔حالؔی نے مرزا کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کی برائیوں کا ذکر بھی بہت ایمان داری وغیر جانب داری سے کیا ہے۔غالب کے کردار سے متعلق کمزوریوں کا ذکر بھی اسی نہج وانداز میں کیا ہے جس طرح ان کے فضائل ومناقب کا ذکر کیا ہے۔

یادگار غالب کے بعد غالب کی زندگی کے متعلق بہت ساری کتابیں لکھی گئی ہیں۔حالاں کہ یہ کتابیں بہت تحقیق وجستجو کے بعد لکھی گئی ہیں لیکن جتنا مواد حالی نے اپنی یادگار میں جمع کر دیا تھا اس میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوا ہے البتہ ان کی تشریحات ضرور ہوگئی ہیں۔حالی نے مرزا کی زندگی پر امید سے زیادہ (حالاں کہ قدرے تشنگی محسوس ہوتی ہے) مواد جمع کر دیا ہے۔حالی نے مرزا کے کلام سے بعض ایسے نکات بیان کیے ہیں جن کی توضیح وتشریح تاہنوز کی جارہی ہے۔

اردو ادب کے جتنے بھی ادیبوں نے مضامین وکتب تصنیف کرکے غالب کی زندگی یا ان کے کلام کا محاکمہ کیا ہے سب کا سرچشمہ حالی کی یادگار غالب ہے۔اردو ادب میں مختلف شخصیات پر سوانح لکھی گئی ہیں لیکن کسی بھی سوانح نگار نے حالی کی طرح اس موضوع کو انتہائی دل چسپ انداز میں پیش نہیں کیا ہے۔

10.07 فرہنگ

اِرتقا	: درجہ بدرجہ ترقی	روشناس	: جان پہچان والا، واقف
اَطوار	: طور کی جمع، طریقے	سعی	: کوشش
اعتدال	: توازن	شہرۂ آفاق	: دنیا میں مشہور
افکار	: فکر کی جمع، نظریات	صنادِید	: صندِید کی جمع، بڑے یا ذی اثر لوگ
افہام	: فہم کی جمع، سمجھنا	صِنف	: قسم
اقتباسات	: اقتباس کی جمع، ٹکڑے	فریضہ	: ذمہ داری، وہ اہم کام جس کا بجالانا ضروری ہو
اکتسابِ فیض	: فائدہ اُٹھانا	کیفیات	: کیفیت کی جمع، حالات
اُنسیت	: محبت، چاہت	گراں قدر	: اہم قیمتی، بیش قیمت
پرداخت	: تربیت، ہدایت	ماخذ	: بنیاد، سرچشمہ
پیچ وخم	: نشیب وفراز، اُونچ نیچ	مرہونِ مِنت	: احسان مند ہونا، شکر گزار ہونا
تجزیہ	: کسی چیز کا باریکی سے جائزہ لینا	مذموم	: جس کی برائی کی گئی ہو

تسلسل	:	سلسلہ وار، روانی کے ساتھ	مسکن	:	سکونت کی جگہ، رہنے کی جگہ
تشریحات	:	تشریح کی جمع، وضاحتیں	معاشی	:	معاشیاتی، کسی معیشت کے یا تجارتی تنظیم کے نظام یا اس کی عمل کاری سے متعلق
ثقافتی	:	ثقافت سے متعلق			
حسن وقبح	:	اچھائی، برائی	مُنتشِر	:	بکھرا ہوا
خلوص	:	حقیقی محبت، سچا لگاؤ، دلی تعلق، اخلاص، صداقت، پاکیزگی	موازنہ	:	مقابلہ، تقابل
			نشیب وفراز	:	اُتار چڑھاؤ
خودنوشتہ	:	خود کا لکھا ہوا	نُقُوش	:	نقش کی جمع، علامتیں
خوردونوش	:	کھان پان	نِکات	:	نکتہ کی جمع، اہم بات یا پہلو
راہ نمائی	:	راہ دکھانا	ودیعت	:	سپردگی
رموز ونکات	:	اہم باتیں	ہمہ جہت	:	پوری، مکمل

10.08 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : سوانح نگاری کی تعریف کیجیے۔

سوال نمبر۲ : واقعات کے انتخاب سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

سوال نمبر۳ : مولانا شبلی نے حیاتِ جاوید کے متعلق کیا کہا ہے؟

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : ''یادگارِ غالبؔ'' کی خصوصیات کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

سوال نمبر۲ : یادگارِ غالبؔ'' کے محاسن ومعائب پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

سوال نمبر۳ : یادگار غالب کی روشنی میں حالی کی سوانحی صلاحیت کا جائزہ پیش کیجیے۔

10.09 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اُردو میں سوانحی ادب: فن اور روایت — از — عمر رضا

۲۔ اُردو ادب میں سوانح نگاری — از — الطاف فاطمہ

۳۔ اُردو میں سوانح نگاری — از — سیّد شاہ علی

۴۔ ذکر غالب — از — مالک رام

۵۔ حالی کی اردو نثر نگاری — از — ڈاکٹر عبدالقیوم

۶۔ یادگار غالب — از — الطاف حسین حالؔی

10.10 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ مولانا محمد حسین آزاد

﴿۲﴾ افراد کی زندگی کی تاریخ ہے

﴿۳﴾ سرسید احمد خان

﴿۴﴾ دلی میں

﴿۵﴾ تاریخی لحاظ سے واقعات کی ترتیب

﴿۶﴾ ۱۸۹۶ء

﴿۷﴾ حیات جاوید

﴿۸﴾ ڈاکٹر عبدالقیوم

﴿۹﴾ علی گڑھ تحریک

﴿۱۰﴾ مولانا شبلی نعمانی

﴿۱۱﴾ قمار بازی

﴿۱۲﴾ چوسر و شطرنج

اکائی 11 : صالحہ عابد حُسین : یادگارِ حالی

ساخت

11.01 : اغراض ومقاصد

11.02 : تمہید

11.03 : سوانح نگاری کی تعریف

11.04 : صالحہ عابد حسین کے حالاتِ زندگی

11.05 : سوانح عمری ''یادگارِ حالی'' کا عمومی جائزہ

11.06 : سوانح عمری ''یادگار حالی'' کا منتخب متن

11.07 : سوانح عمری ''یادگار حالی'' کے منتخب متن کا خلاصہ

11.08 : خلاصہ

11.09 : فرہنگ

11.10 : نمونہ امتحانی سوالات

11.11 : حوالہ جاتی کتب

11.12 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

11.01 اغراض ومقاصد

سوانح نگاری ایک اہم ترین صنفِ ادب ہے جس کے مطالعے سے ہم کسی شخص کی زندگی کے مکمل حالات سے بخوبی واقف ہو جاتے ہیں۔ اردو میں بہت ساری سوانح عمریاں لکھی گئیں ہیں۔ عام طور پر سوانح میں کلیدی کردار ایک ہی فرد کا ہوتا ہے جس کی زندگی کا ہر ہر پہلو ہمارے سامنے روشن ہوتا نظر آتا ہے۔ اس کا تعلق غیر افسانوی ادب سے ہے۔

انگریزی ادب میں سوانح نگاری کے فن کو بڑا فروغ ملا ہے۔ اردو میں بھی قدیم وجدید طرز کی سوانح نگاری کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہے۔ اس اکائی میں آپ کو سوانح نگاری کے فن سے واقف کرانے کے ساتھ اردو کی ایک اہم سوانح ''یادگارِ حالی'' سے بھی متعارف کرایا جائے گا۔ اس سوانح کا ایک حصہ آپ کی اکائی میں اس لئے شامل کیا گیا ہے تا کہ آپ کو صالحہ عابد حسین کی تحریر کردہ سوانح ''یادگارِ حالی'' کے مطالعے سے اردو کے نامور شاعر وادیب خواجہ الطاف حسین حالی کی زندگی کے نشیب وفراز کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

11.02 تمہید

عزیز طالب علم! آپ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ہمارے اردو کے غیر افسانوی ادب میں سوانح نگاری کو ایک ممتاز اہمیت حاصل ہے اور ابتدا سے حال تک سوانح لکھنے والوں کا ایک بڑا کارواں ہمیں ملتا ہے۔ اردو میں سوانح نگاری کی روایت ایک اندازے کے مطابق سوا سو سال پرانی ہے۔ سوانح نگاری کے ابتدائی نقوش ہمیں اردو تذکروں میں بھی ملتے ہیں۔ اردو میں سوانح نگاری کی دو روایتیں ملتی ہیں۔ ایک کا تعلق تخلیق سے ہے اور دوسرے کا رشتہ تنقید سے ہے۔ ''یادگارِ غالب'' سے مشتاق احمد یوسفی کی ''سرگذشت'' تک سوانح نگاری کی ایک صحت مند روایت اردو ادب میں موجود ہے۔

11.03 سوانح نگاری کی تعریف

کسی شخص کے حالاتِ زندگی سے واقف ہونا اس کی زندگی کی جدوجہد، کامیابی اور ناکامیوں کی داستان سننا، انسان کی فطری عادت ہے۔ جب ہم اس صنف کے حوالے سے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ابتدا سے ہی بنی نوعِ انسان اپنے بزرگوں اور اسلاف کے کارناموں کو یادگار اور زندہ جاوید بنانے میں دل چسپی لیتا آیا ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سوانح نگاری دنیا کا ایک بہت پرانا طرزِ اظہار ہے اور اس کا وجود اس وقت عمل میں آچکا تھا جب انسان لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا اور نہ ہی طریقۂ تحریر وجود میں آیا تھا۔ لوگ اپنے بزرگوں اور دیگر لوگوں کے کارنامے سینہ بہ سینہ ایک دوسرے میں منتقل کرتے رہے تھے۔ دنیا کی مختلف زبانوں کے ادب میں اس کی مثالیں نظر آتی ہیں۔

ہمارے محققین و ناقدین نے سوانح نگاری کی تعریف اپنے اپنے طور پر کی ہے۔

''سوانح نگاری کسی فرد یا شخص کے اعمال و افکار، تجربات و مشاہدات کے سچے اور ادبی اظہار کا نام ہے۔''

(بحوالہ ڈاکٹر عبدالواسع ''فنِ سوانح نگاری''، ص ۱۴)

اردو کے عہد ساز ادیب گیان چند جین کا کہنا ہے:

''اس میں کسی شخص کے حالاتِ زندگی اور شخصیت کے بارے میں لکھا جاتا ہے۔ یہ ایک مختصر مضمون بھی ہوسکتا ہے..... پوری کتاب بھی۔''

(''ادبی اصناف''، ص ۱۳۷)

سوانح نگاری کے فن سے ڈاکٹر عبدالواسع یہ تقاضہ کرتے ہیں:

''سوانح عمریوں میں صاحبِ سوانح کی مکمل شخصیت کو سامنے لانا چاہیے۔ موضوع کو عام روش کے مطابق ایک انجمن اور ایک محفل بنا کر پیش کرنے سے بہتر ہے کہ اس کی اندرونی شخصیت کی کھوج کی جائے۔ ظاہری انسان کے برے باطن کے انسان کی تلاش کی جائے۔''

(بحوالہ ''فنِ سوانح نگاری'' ڈاکٹر عبدالواسع ص ۳۷)

ان تمام اہلِ فن کی آراء کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ سوانح عمری تاریخ کا ایک حصہ ہے جس میں پوری ایمان داری اور سچائی کے ساتھ کسی فردِ واحد کی زندگی اور اس کی زندگی سے جڑے تمام واقعات کا تفصیل سے بیان ہوتا ہے۔ سوانح نگاری کے مطالعے سے صاحبِ سوانح کی شخصیت کے تمام پہلو ہمارے سامنے کھل کر آ جاتے ہیں اور بعض دفعہ یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ تم صاحبِ سوانح کے ساتھ اس کے عہد میں میں سفر کر رہے ہیں۔

الغرض سوانح نگاری اردو کے غیر افسانوی ادب کی وہ اہم صنف ہے جس میں کسی شخص کی زندگی کا سچا منظر نامہ کچھ اس طرح سے پیش کیا جائے کہ قاری کی توجہ اپنی جانب کھینچ لے۔ اس میں کسی شخص کی حیات و کارنامے اور اس کے افکار و اقوال کا تہذیبی و معاشرتی ماحول کے پس منظر میں حقیقی، تاریخی اور ادبی و فنی سطحوں پر بیان ہوتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ سوانح نگاری کے مطالعے سے ہمیں کیا واقفیت حاصل ہوتی ہے؟

﴿۲﴾ سوانح نگاری کی تعریف پیش کیجیے۔

﴿۳﴾ قدیم زمانے میں سوانح نگاری کا طرزِ اظہار کیسا تھا؟

11.04 صالحہ عابد حسین کے حالاتِ زندگی

اردو کی نام وَر ادیبہ صالحہ عابد حسین کی پیدائش ۱۸/اگست ۱۹۱۳ء میں پانی پت کے ایک معزز، اعلیٰ اور علمی خانوادے میں ہوئی۔ آپ کے والد منصف کے عہدے پر فائز تھے اور گلبرگہ میں رہتے تھے۔ آپ کا تاریخی نام مصداق فاطمہ تھا۔ ڈاکٹر عابد حسین سے ازدواجی رشتے میں منسلک ہونے کے بعد ادبی دنیا میں صالحہ عابد حسین کے نام سے متعارف ہوئیں۔ صالحہ عابد حسین کی سرپرستی ان کے بڑے بھائی غلام الثقلین نے کی۔ موصوفہ کا ننہالی سلسلہ خواجہ الطاف حسین حالؔی سے ملتا ہے۔ صالحہ عابد حسین کے ادبی سفر کا آغاز اس وقت ہوا جب وہ صرف ۵/سال کی تھیں۔ ان کی ابتدائی تحریریں ''پھول'' اور تہذیب نسواں'' جیسے معیاری پرچوں میں شائع ہوئیں۔ اُنہوں نے اپنی کہانیوں میں زندگی اور اخلاقی قدروں کا خاص خیال رکھا ہے۔ ان کی کہانیوں میں نہ صرف مسلم معاشرے کے مسائل کی عکاسی ملتی ہے بلکہ اس عہد کی تہذیبی و سماجی فضا بھی نظر آتی ہے۔ ان کی تحریروں میں اپنے عہد کے مسائل کے ساتھ ساتھ خود ان کی نجی زندگی کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔

مذکورہ حوالے سے ان کا کہنا ہے:

> ''ہر فن کار کے فن پر اس کے ذاتی رنج و غم کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ کیا کہوں اور کیا نہ کہوں؟ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ میں دو سال کی عمر سے باسٹھ سال کی عمر تک غموں کی بھٹی میں جلتی رہی ہوں۔ اب جب غم کی چوٹ دل پر پڑتی ہے تو سارے شعوری اور غیر شعوری غم جاگ پڑتے ہیں۔''
>
> (بحوالہ ''شاعر'' بمبئی جون، جولائی ۱۹۷۶ء ص ۱۲)

صالحہ عابد حسین کی ناول نگاری اور افسانہ نگاری کا بے حد شغف تھا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''نقشِ اول'' کے نام سے ۱۹۳۹ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ان کے ناولوں میں ''اپنی اپنی صلیب''، ''درد و درماں''، ''راہِ عمل''، ''زندگی کے کھیل''، ''اُلجھی ڈور''، ''قطرے سے گہر

ہونے تک'' اور'' آتشِ خاموش'' کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کی تحریروں کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں اور ناولوں میں سادگی، خلوص، دردمندی اور انسان دوستی کی تبلیغ کرتی پھرتی ہیں۔ ان کے یہاں عام انسان اور اس کے دکھ درد کا برملا اظہار ملتا ہے۔ اُنہوں نے اپنے اردگرد جیسا ماحول دیکھا، طبقۂ نسواں کے جو مسائل محسوس کیے اسی کو حقیقی انداز میں پیش کر دیا اور خود کو کسی مکتبۂ فکر کا مبلغ بننے نہیں دیا۔

افسانے اور ناول کے علاوہ سوانحی کتابیں اور خاکے بھی اُنہوں نے لکھے۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ'' جانے والوں کی یاد آتی ہے'' کے عنوان سے شائع ہوا جسے اپنے منفرد اُسلوب اور سادگیِ اظہار کی بناء پر ہر خاص و عام نے بہ نظرِ تحسین دیکھا۔ سوانح نگاری کے میدان میں ان کی گراں قدر تخلیق'' یادگارِ حالی'' ہے جس میں اُنہوں نے حالؔی کی مکمل اور جامع سوانح لکھ کر حالی کی زندگی کو انتہائی دل چسپ اور پُر اثر انداز میں پیش کیا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۴﴾ صالحہ عابد حسین کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

﴿۵﴾ ان کے افسانوں کا اوّلین مجموعہ کب اور کس عنوان سے شائع ہوا؟

﴿۶﴾ صالحہ عابد حسین کے دو ناولوں کے نام لکھیے۔

11.05 سوانح عمری'' یادگارِ حالی'' کا عمومی جائزہ

یادگارِ حالی: صالحہ عابد حسین کی لکھی ہوئی سوانح عمری ہے جسے مصنّفہ نے ۱۹۵۰ء میں لکھا۔ اس سوانح کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ نشو ونما ہے۔ دوسرا حصہ آب و رنگ اور تیسرا حصہ برگ و بار سے تعلق رکھتا ہے۔ صالحہ عابد حسین نے اس سوانح میں اردو کے پہلے سوانح نگار الطاف حسین حالؔی کی مکمل تصویر پیش کی ہے۔

﴿۱﴾ نشو ونما

'' یادگارِ حالی'' خواجہ الطاف حسین حالؔی کی سوانح حیات ہے جسے ان کی نواسی اور معروف ادیبہ بیگم صالحہ عابد حسین نے لکھا ہے۔ یہ کتاب حالی کی سوانح عمری نہیں لیکن اس میں ان کی زندگی کے تمام واقعات، حالات اور سانحات کو موصوفہ نے نہایت مستند حوالوں سے یک جا کر دیا ہے۔ اسی بنا پر اہلِ علم اس کتاب کو حالؔی کے حیات و کارناموں کا ایک مستند حوالہ مانتے ہیں۔

حالی کا پورا نام خواجہ الطاف حسین حالؔی تھا آپ پانی پت کے محلّہ انصار میں ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام خواجہ ایزد بخش انصاری تھا۔ حالؔی کے ایک بڑے بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ ان کے آبا و اجداد ۸۰۰/سال قبل پانی پت میں آ کر بس گئے تھے۔ حالی جب نو سال کے تھے تو ان کے والد گذر گئے۔ والدہ کا ذہنی توازن بھی ٹھیک نہیں تھا لہٰذا ان کی پرورش بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے کی۔ ساڑھے چار سال کی عمر میں حالی کی بسم اللہ ہوئی۔ پانی پت کے جید قاری حافظ ممتاز حسین سے قرآن شریف پڑھا۔ حالی کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ جب وہ قرأت کے ساتھ قرآن شریف کی تلاوت کرتے تو بڑے بڑے عالم ان کی تعریف کرتے۔ حالی نے سیّد جعفر علی سے فارسی کی تعلیم حاصل کی اور حاجی ابراہیم حسین سے عربی صرف و نحو کا درس لیا۔ ان حضرات کی صحبت سے حالی میں شاعری کا شوق بیدار ہوا۔ انہیں حصولِ علم کا بڑا شوق تھا لیکن صرف ۱۷/سال کی عمر میں ان کی شادی ماموں زاد بہن اسلام النساء سے کر دی گئی۔ حالی بڑے بھائی کا بہت احترام کرتے تھے لہٰذا شادی

سے انکار نہ کر سکے۔ایک دن کسی کو کچھ بتائے بغیر دلی چلے آئے جو اس وقت علوم وفنون کا ایک اہم مرکز تھی۔ یہاں جامع مسجد کے قریب حسین بخش کے مدرسے میں واعظ مولوی نوازش علی سے تعلیم حاصل کی۔ ہر چند کہ اس وقت انگریزی کا غلغلہ تھا لیکن حالی اس طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ البتہ بعد میں انگریزی ترجمے پڑھ کر اُنہوں نے انگریزی سیکھ لی۔

دلّی کے مشاعروں میں شرکت کے دَوران ان کی ملاقات غالبؔ سے ہوئی۔اُنہوں نے اپنی فارسی غزل غالب کو دکھائی۔غالب کو حالؔی کا کلام بہت پسند آیا اور اُنہوں نے کہا ''اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔'' حالی نے تعلیم کے ساتھ ساتھ شعر گوئی کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔لیکن جب ان کے بھائی کو یہ خبر ملی کہ وہ دلی میں ہیں تو وہ انہیں ۱۸۵۵ء میں واپس پانی پت لے آئے۔ پانی پت میں ان کا عرصۂ قیام ڈیڑھ سال تک رہا۔اسی زمانے میں ان کے یہاں ایک بیٹا بھی پیدا ہوا۔خانگی ذمہ داریاں بڑھیں تو ۱۸۵۶ء میں بہت قلیل تنخواہ کے عوض ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ملازمت کر لی لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر میں کسی طرح جان بچا کر پانی پت واپس آئے۔ دلّی سے لوگ ہجرت کر کے پانی پت آ رہے تھے۔حالی ان خانماں بربادوں کی بازآبادکاری کے کام میں جٹ گئے۔ان آنے والوں میں ایک بی مٹریا بھی تھیں جنہیں حالی نے اپنے گھر میں پناہ دی اور وہ آخر دَم تک اسی خاندان کا ایک حصہ بنی رہیں۔

پانی پت میں حالی نے حصولِ علم کا سلسلہ جاری رکھا۔حالی کے بھائی لاولد تھے اس لئے اُنہوں نے اپنا بڑا بیٹا بھائی کو دے دیا۔حالی کے یہاں کئی اور بچے پیدا ہوئے۔ان میں سے ایک بیٹی عنایت فاطمہ اور ایک بیٹا خواجہ سجاد حسین سلامت رہے اور باقی دارِفانی سے کوچ کر گئے۔حالی تلاشِ معاش میں دوبارہ دلی آئے۔ یہاں ان کی ملاقات نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ سے ہوئی۔حالی جہاں گیر آباد میں ان کے بچوں کے اتالیق مقرر ہوئے لیکن وہ اکثر دلی آتے اور غالب سے ملاقات کرتے۔

۱۸۶۹ء میں شیفتہؔ کے انتقال کے بعد حالؔی لاہور آ گئے اور پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں انہیں ملازمت ملی جہاں انگریزی سے ترجمہ کی گئی اردو کتابوں پر نظرِ ثانی اور عبارت درست کرنے کا کام انہیں دیا گیا۔یہیں سے حالؔی کو مغربی ادب کے مطالعے کا شوق ہوا۔حالؔی کے قیامِ لاہور کے دوران سرسید احمد خان نے اردو شاعری کی اصلاح کے لئے ۱۸۷۴ء میں انجمنِ پنجاب کے مشاعروں کی بنیاد ڈالی جس میں موضوعاتی نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔حالؔی نے اس موقعے کو غنیمت جانا اور مشاعرہ میں چار نظمیں سنائیں جو اپنی مثال آپ ہیں۔لاہور میں اُنہوں نے نثر میں کئی کتابیں لکھیں جن میں ''تریاقِ مسموم''، ''مجالس النسا'' اور جیولوجی کی کتاب کا عربی سے ترجمہ شامل ہیں۔

لاہور میں چار سال کا عرصہ گذارنے کے بعد حالی دلّی آ گئے جو ان کا وطن ثانی تھا اور اینگلو عربک اسکول میں مدرس کی ملازمت اختیار کی۔ان کی بے چین طبیعت کو یہاں بھی سکون نہ ملا۔اپنا شعری سرمایہ انہیں بے کار لگتا تھا۔وہ شعر وادب کے ذریعہ اصلاح کا کام لینا چاہتے تھے۔سرسید کی تحریک نے انہیں راستہ دکھایا جس سے متاثر ہو کے اُنہوں نے ''مسدّسِ حالی'' جیسی شاہ کار تصنیف پیش کی اور جب اسے سرسید کے پاس بھیجا تو اُنہوں نے اس کی تعریف میں کہا ''ایک دردمند شاعر کے دل کو ایک درد آشنا انسان نے سمجھا اور دل نشیں انداز میں داد دی۔'' نظم مسدّسِ حالی پہلے سرسید کے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' میں قسط وار شائع ہوئی اس کے بعد کتابی صورت میں منظرِ عام پر آئی۔سرسید کے علی گڑھ کالج کے قیام میں حالی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ساتھ ہی تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔''حیاتِ سعدی'' اسی زمانے کی تصنیف ہے۔

سرسید نے ۱۸۸۷ء میں ان کی ملاقات ریاستِ حیدرآباد کے وزیراعظم سے کرائی جنہوں نے ان کا ۷۵/روپئے وظیفہ مقرر کیا۔ ۱۸۹۱ء میں حالی سرسید کے ساتھ حیدرآباد گئے۔اب ان کا وظیفہ بڑھا کر ۱۰۰/روپئے کر دیا گیا۔''مقدمۂ شعروشاعری''،''یادگارِ غالب''اور حیاتِ جاوید''ان کی لازوال تحریریں ہیں۔۱۹۰۰ء میں حالی کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا جس کا گہرا صدمہ ان پر ہوا۔۱۹۰۴ء میں حالی کی خدمات کے اعتراف میں حکومت نے انہیں''شمس العلما''کے خطاب سے نوازا۔اس خطاب کے ملنے پر علامہ شبلی نعمانی نے حالی کے تئیں اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کیا''مولانا آپ کو تو نہیں لیکن خطاب شمس العلمای کو مبارک باد دیتا ہوں۔اب جا کر اس خطاب کو عزت حاصل ہوئی۔''

۱۹۰۵ء میں نظام حیدرآباد کی چہل سال گرہ کے موقعے پر حالی حیدرآباد گئے اور چھ ماہ وہاں قیام کیا۔حالی کی ادبی شخصیت اور اعلیٰ کردار نے اہالیانِ حیدرآباد کو بہت متاثر کیا۔اسی سال حالی نے عوامی چندہ وصول کر کے پانی پت میں ایک کتب خانہ قائم کیا جہاں نادر کتابوں کا ذخیرہ جمع کیا۔یہ کتب خانہ ۱۹۴۷ء تک قائم رہا۔بعد میں حالی نے لڑکوں کا ایک چھوٹا اسکول بھی قائم کیا جو حالی مسلم ہائی اسکول کے نام سے مشہور ہوا لیکن تقسیمِ وطن کی لہر اسے اپنے ساتھ بہا کر لے گئی۔

۱۹۰۷ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ کراچی میں منعقد ہوا جس میں انہیں صدر منتخب کیا گیا۔اپنے صدراتی خطبے میں اُنہوں نے قوم کو تعلیم کی طرف رجوع ہونے کی نصیحت کی اور کہا کہ اگر آپ اپنے ہم وطنوں کی طرح علم حاصل نہیں کریں گے تو زندگی کی دَوڑ میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔حالی زندگی کے آخری ایام تک اردو ادب کی خدمت کرتے رہے۔۳۱/دسمبر ۱۹۱۴ء کو حالی کا انتقال ہوا۔پانی پت میں درگاہ قلندر صاحب کے صحن مسجد کے حوض کے کنارے ان کی آخری آرام گاہ ہے۔یہ جگہ شعروادب کے قدر دانوں کے لئے ہمیشہ آستانۂ نیاز بنی رہے گی۔

﴿۲﴾ آب ورنگ

حالی کو بچپن سے ہی حصولِ علم کا بڑا شوق تھا لیکن کبھی بھی یک سوئی کے ساتھ انہیں تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا مگر تمام دشواریوں کے باوجود عربی، فارسی اور اردو ادب میں اُنہوں نے مہارت حاصل کی نیز قرآن پاک اور تفسیر کے عالم بنے۔اس کے علاوہ انہیں جہاں حدیث، فقہ، منطق وغیرہ پر عبور حاصل تھا وہیں شاعری اور اِنشا پردازی میں بھی دَست رَس حاصل تھی۔کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کی جستجو انہیں ہمیشہ رہتی تھی۔حالی بے حد محنتی تھے اور زندگی کے آخری ایام تک خود کو کام میں مشغول رکھا۔انہیں اپنے فرض کی ادائیگی کا بھی خوب احساس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خاندان کی کفالت کی خاطر کئی جگہوں پر ملازمت کی اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔

حالی بے حد سلیقہ مند، نفاست پسند، خوش ذوق اور منتظم انسان تھے۔لباس میں عام طور پر کرتا پاجامہ اور اچکن پہنتے تھے۔سردی کے موسم میں اچکن پر چونما یا روئی کا دگلہ ہوتا تھا۔مفلر اور گول ٹوپی بھی پہنتے تھے۔انہیں چائے بہت پسند تھی۔دن میں کئی بار چائے پیتے۔ان کے کمرے میں چائے ناشتے کا سامان قرینے سے سجا رہتا تھا۔ہر طرح کے پھل اور سبزیاں کھاتے اور خود کھانے سے زیادہ دوسروں کو کھلا کر خوش ہوا کرتے تھے۔اچھی چیزوں کے شوقین ہونے کے ساتھ ساتھ کم خرچ کو ترجیح دیتے۔اپنی اسی عادت کی وجہ سے کم آمدنی میں بھی آرام سے رہتے اور دوسروں کو بھی تحفے تحائف بھیجتے رہتے تھے۔حالی حُسنِ اخلاق کا ایک ایسا پیکر تھے جس کا اعتراف ان کے مخالفین بھی کرتے تھے۔ حسبِ مراتب سب کی عزت کرتے۔حالی کی مہمان نوازی بھی مشہور ہے۔وہ اپنی مصروفیتوں کے باوجود خاندان والوں کے لئے وقت نکالتے

اوران کی ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے۔حالی نے اپنی زندگی میں بہت سے اسفار کیے۔دلی،علی گڑھ،الٰہ آباد، بھوپال،حیدرآباد،کراچی،بمبئی اورشملہ کا سفر کیا۔سفر سے ہمیشہ تحفے لایا کرتے اورانہیں عزیز واقارب کے درمیان تقسیم کرکے خوش ہوتے۔

حالی کا سلوک اپنے ملازمین سے بھی بہت اچھا تھا۔اپنے بچوں کو وہ ان کی عزت کرنا سکھاتے تھے۔ان کے دو بے حد عزیز ملازم تھے۔ایک نانوں دوسرا عطاء اللہ۔ملازموں سے کبھی کسی چیز کا حساب نہیں لیتے۔حالی کی وفات کے بعد عطاء اللہ کو خواجہ سجاد حسین نے بڑی عزت سے اپنے پاس رکھا۔حالی دوسروں کی مصیبت دیکھ کر پریشان ہوجاتے تھے۔جنگ بلقان ہو یا حیدرآباد کا سیلاب یا کوئی اور مصیبت، حالی کی تڑپ دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔بقول مولوی عبدالحق حالی کی سیرت میں دونمایاں خصوصیتیں تھیں سادگی اور دردِ دل۔

حالی حنفی سنّی مسلمان تھے۔اُنہوں نے نام وَر علماے دین سے علم حاصل کیا تھا۔مذہب کی سچی محبت نے انہیں انسانیت کا سچا ہم دَرد بنا دیا تھا۔وہ سرسید کی طرح رسمی اور رواجی مذہب کے خلاف تھے۔ہر چند کہ وہ کٹر مذہبی خیال کے انسان تھے لیکن دیگر مذاہب کا احترام کیا کرتے تھے۔ان کے نزدیک مذہب کو مان لینا کافی نہیں تھا بلکہ اس پر غور وفکر لازمی تھا۔حالی ایک سچے عاشقِ رسول ﷺ ہونے کے ساتھ اہلِ بیت پاک اور حضرتِ علی رضی اللہ عنہ سے بھی گہری عقیدت رکھتے تھے۔مسدّسِ حالی کے چند نعتیہ بند اردو کے تمام نعتیہ کلام پر بھاری ہیں۔ ۱۹۰۳ء میں مولانا حسرت موہانی نے علی گڑھ سے ''اردوئے معلّٰی'' جاری کیا اور حالی پر اعتراضات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ چھیڑ دیا۔حالی اس رسالے کو باقاعدگی سے پڑھتے لیکن کبھی اس کا جواب نہیں دیا۔حالی پر عتاب نازل ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ سرسید تحریک کے ایک اہم علم بردار تھے۔

حالی نے عملی طور پر بھی علی گڑھ اور مدرستہ العلوم کی خدمت کی۔حالی سرسید کے رفیق تھے لیکن جب سرسید کے بعد کالج کے سکریٹری کے انتخاب کی بات آئی اور سرسید نے سید محمود کو اپنا جانشیں بنانا چاہا تو لوگوں نے اس جانشینی کو درست نہ سمجھا۔حالی بھی اس بات پر سرسید سے متفق نہ تھے۔سرسید کی وفات کے بعد سید محمود سکریٹری بنے اور ان کی وفات کے بعد محسن الملک کو سکریٹری بنایا گیا۔جب انگریزی حکومت کالج کے معاملات میں دخل اندازی کرنے لگی تو حالی نے اس کی مخالفت کی۔محسن الملک کے بعد جب وقار الملک کالج کے سکریٹری ہوئے تب بھی کالج کے ساتھ حالی کی ہم دَردی جاری رہی۔حالی کے نزدیک عورتوں کی تعلیم بے حد ضروری تھی۔اُنہوں نے خود اپنے خاندان کی عورتوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا۔ ۱۸۹۴ء میں اُنہوں نے پانی پت میں لڑکیوں کا ایک پرائمری اسکول کھولا جہاں ان کے عزیزوں اور دوستوں کی بچیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔حالی نے اپنی نظموں میں بھی عورتوں کے حقوق کی حمایت کی ہے۔نظم ''چپ کی داد'' اس کی مثال ہے۔بیوہ عورتوں پر انہوں نے ''مناجاتِ بیوہ'' لکھی۔عورتوں کی تعلیم اور بچوں کی پرورش کے اُصولوں پر حالی کی تصنیف ''مجالس النساء'' ایک اہم کتاب ہے۔

حالی کی سیرت کی اہم خوبی یہ ہے کہ وہ ہر طرح کی عصبیت سے پاک تھی۔''مقدمہ شعروشاعری'' میں اُنہوں نے اس بات پر زور دیا کہ اردو کے مصنّفین کو سنسکرت یا ہندی بھاشا جاننا ضروری ہے۔ان کے مطابق ہندی کے آسان الفاظ کو اردو میں داخل کرنا چاہیے۔حالی کے نزدیک وطن کی محبت وہ ہے جو اہلِ وطن کے لئے ہو یعنی اہلِ وطن کی ترقی،عزت اور اصلاح کے ساتھ انہیں ذلت اور گم راہی سے نکالا جائے۔

حالی پر یہ بھی اعتراض ہے کہ وہ مغرب پرست تھے لیکن یہ تصویر کا ایک رُخ ہے۔ دوسرا رُخ یہ ہے کہ وہ مغربی علوم کی اہمیت کے قائل تھے اور مسلمانوں کی ترقی میں انگریزی تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔

حالی نے جب ہوش سنبھالا تو ملک میں ہر طرف غارت گری کا بازار گرم تھا انگریزوں کی حکومت تھی۔ حالی نے محسوس کیا کہ یہ وقت کا تقاضہ ہے کہ انگریزی تعلیم حاصل کی جائے ورنہ مسلمان پیچھے رہ جائیں گے۔ انہیں یہ احساس تھا کہ انگریز قوم ہندوستان میں بس کر ہندستانی ہو جائے گی اسی لئے وہ ان حامی تھے لیکن جب ان پر یہ بات روشن ہوگئی کہ یہ حکومت مشرقی قوموں کی اخلاقی حالت کو بھی بدتر بنا رہی ہے تو وہ اس سے بددل ہو گئے۔ اُنہوں نے مغربی علوم کی ضرور حمایت کی لیکن مشرقیت کو اپنا بیش بہا قومی سرمایہ سمجھا۔

﴿۳﴾ ''برگ وبار''

حالی کے اندر شاعر کا مادہ قدرتی ہے۔ بچپن سے زندگی میں درد اُٹھائے تھے۔ ان کے استاد صوفی صافی تھے اور فارسی و عربی شاعری پر عبور رکھتے تھے۔ حالی کے اندر شاعری کا شوق پیدا کرنے میں ان کے استاد کا ہاتھ ہے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ دلی پہنچے تو وہاں بھی شعر و شاعری کا چرچہ تھا۔ غالب، ذوق، مومن جیسے باکمال شعرا کی تفہیم کرواتے۔ ایسے میں شاعری کی آگ خود بخود بھڑک اُٹھی۔ حالی نے جب چند غزلیں لکھ کر غالب کو دکھائیں تو اُنہوں نے اس کی تعریف یوں کی کہ اگر حالی شعر نہ کہیں گے تو گویا خود پر ظلم کریں گے۔

حالی کی زندگی کا ابتدائی زمانہ وہ تھا جو ہندستان کی پستی اور تنزّلی کا دَور تھا۔ شاعری میں عشق و عاشقی کے موضوعات تھے۔ حالی بھی غزلیں کہنے لگے۔ ان کی غزلوں میں سادگی، اصلیت اور حقیقت کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ وہ جذبات اور احساسات کو اس ڈھنگ سے بیان کرتے ہیں کہ ان کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔

دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا

حالی کے کلام میں تصوّف کے اشعار بھی ملتے ہیں۔ حالی کے دوسرے دَور کے کلام میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے وہ اخلاقی اصلاح کا کام لینا چاہتے تھے۔ حالی کے ابتدائی دَور کی شاعری کے دوران ہی غدر کا سانحہ پیش آیا جس نے سب کچھ برباد کر کے رکھ دیا۔ مغربی ادب اور مغربی تہذیب مشرقیت پر حاوی نظر آنے لگی۔ ایک نئے دَور کا آغاز ہو رہا تھا جس میں مغربی علوم لازمی نظر آنے لگے۔ ایسے وقت میں زمانے کے ساتھ چلنا ہی عقل مندی کی نشانی تھی۔ حالی کا ذہن غیر محسوس طور پر انقلاب کے لئے تیار ہونے لگا۔ وہ دلی کی تباہی اور بربادی کا درد اپنے دل میں محسوس کرنے لگے اور بے اختیار چیخ اٹھے۔

جتنے رمنے تھے ترے ہوگئے ویراں اے عشق
آ کے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز

اس زمانے کی یادگار ''غالب کا مرثیہ'' شاہ کار کی حیثیت رکھتا ہے۔ حالی چار سال تک لاہور میں انگریزی کتابوں پر نظرِ ثانی کا کام کرتے تھے جس سے ان کے مطالعے میں وسعت پیدا ہوئی۔ مولوی محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کا مشاعرہ منعقد کروایا تو حالی نے چار معرکۃ الآرا نظمیں لکھیں۔ ''برکھارت، نشاطِ امید، مناظر رحم وانصاف اور ''حُبِ وطن''۔ حالی نے اردو میں نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی۔

﴿۴﴾ مسدّسِ حالی

جس وقت حالی ذہنی کش مکش میں مبتلا تھے ان کی ملاقات سرسید احمد خان سے ہوئی۔ سرسید تقریباً بیس سال سے اپنی شکست خوردہ قوم کی کشتی کو پار لگانے میں لگے ہوئے تھے۔ قوم کے اندر بیداری کرنا چاہتے تھے۔ حالی سرسید سے بہت متاثر ہوئے۔ انہیں لگا کہ انہیں بھی اپنی قوم کے لئے کچھ ایسا کرنا چاہیے جس سے قوم میں نئی روح آجائے۔ خرابیِ صحت کے باوجود انہیں ایک نیا نصب العین اور جوش ملا جس کی بدولت اُنہوں نے ''مسدّسِ حالی'' لکھی۔

حالی کو اس بات کا احساس تھا کہ قدامت پرست لوگ ان کی اس کتاب پر نکتہ چینی کریں گے اس لئے اُنہوں نے لکھا کہ یہ نظم لطف اُٹھانے کے لئے نہیں لکھی گئی بلکہ یہ عزیزوں اور دوستوں کو غیرت اور شرم دلانے کے لئے لکھی گئی ہے۔ ۱۸۷۹ء میں مسدّسِ حالی پہلی بار عوام کے سامنے آیا تو ایک ہلچل سی مچ گئی۔ ایک گروہ نے اس کی پرزور مذمت کی تو دوسرے گروہ نے اس کی حمایت کی۔ دھیرے دھیرے سب اس کی اہمیت کے معترف ہو گئے۔ اس کے نعتیہ کلام مجالس میں پڑھے جانے لگے۔ بہت ہی کم عرصے میں اس نظم نے وہ مقبولیت حاصل کر لی جو اردو ادب کی تاریخ میں شاید ہی کسی نظم کو ملی ہو۔ اس شہرہ آفاق نظم کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ حالی نے اس نظم کی زبان نہایت سادہ اور سلیس رکھی تاکہ ہر کس و ناکس اسے پڑھ کر سمجھ سکے۔ رام بابو سکینہ کا قول ہے کہ ''یہ ایک الہامی کتاب ہے۔'' حالی کے نزدیک اس کتاب کا مقصد مسلمانوں کی حالتِ زار اور ان کی اصلاح تھا۔ اُنہوں نے عروج و زوال کی جو داستان پیش کی ہے وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے اور ہر قوم اس سے فائدہ اُٹھا سکتی ہے۔

﴿۵﴾ حالی کی مثنویاں اور دیگر نظمیں

مسدّسِ حالی کے بعد حالی نے سرسید کے ساتھ خود کو قومی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ ان کی نظر میں سرسید کی تعلیمی تحریک کی حمایت کرنے میں قومی خدمت ہوگی کیوں کہ قوم کو تعلیم کی طرف متوجہ کرنے اور زمانے کے ساتھ چلنے کی تلقین سے ہی قوم کی ترقی ہوگی۔ اس سلسلے میں حالؔی نے کئی نظمیں لکھیں۔ ان کی شاعری ارادی طور پر بامقصد شاعری بن گئی۔ ادب برائے ادب کے قائل لوگوں نے ان پر اعتراضات کیے لیکن حالی نے یہ ثابت کر دیا کہ اُنہوں نے جو راستہ اختیار کیا تھا، وہ صحیح تھا۔ معاشرتی اصلاح میں وہ عورتوں کی سماجی حالت کو بہتر بنانے پر زور دیتے ہیں۔ حالی نے اردو شاعری سے عورتوں کو ایک خاص مقام عطا کیا۔ حالی ہندستانی عورت کا ذکر کرتے ہیں اور اسے انسانیت کے بلند ترین مقام پر جگہ دیتے ہیں۔ ''چپ کی داد'' حالی کی نہایت مشہور و مقبول نظم ہے جس میں ہندوستانی عورت کی حق تلفی اور محرومی کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کی سیرت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کی مثنویوں میں سب سے دل گداز اور پر اثر نظم ''مناجاتِ بیوہ'' ہے جو زبان کی سادگی، روانی اور دل کشی کا ایک اچھوتا نمونہ ہے۔ ''تاریخِ ادب اردو'' میں رام بابو سکینہ نے لکھا ہے کہ ''اس کو پڑھ کر دل پھٹ جاتا ہے۔'' یہ نظم ہندستان کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کی جا چکی ہے۔

''کلمۃ الحق'' ان کی ایک اہم نظم ہے۔ اس نظم میں حالی نے یہ دکھایا ہے کہ حق گو ہمیشہ مصیبت جھیلتے ہیں لیکن کبھی حق کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ حالی جدید نظم کے بانی ہیں۔ اُنہوں نے کبھی مغرب کی تقلید نہیں کی۔ حالی نے اپنی نظموں میں جن موضوعات کو پیش کیا ہے، ان کے

ساتھ بھرپور انصاف کیا ہے اور ہمیشہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے ہیں۔ دراصل حالی کی اہمیت بنیاد کے اس پتھر کی طرح ہے جس پر جدید اردو نظم کی عمارت تعمیر ہوئی۔

﴿۶﴾ رباعی

حالی میر انیسؔ سے بہت متاثر تھے۔ انیسؔ ہی کی طرح حالی نے بھی رباعی میں ہر قسم کے اخلاقی مضامین کو جگہ دی ہے۔ سماج اور معاشرے کی اصلاح کو بھی موضوع بنایا ہے۔ انیس کے بعد اردو رباعی میں حالی کا ہی درجہ بلند ہے۔ اگر چہ ان کی رباعیوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں لیکن ہر موضوع پر بلند پایہ رباعیاں ملتی ہیں۔ وہ جو کہنا چاہتے ہیں، چار مصرعوں میں بخوبی کہہ دیتے ہیں گویا دریا کو کوزے میں بند کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

طوفاں میں ہے جب جہاز چکر کھاتا
جب قافلہ وادی میں ہے سر ٹکراتا
اسباب کا آسرا ہے جب اُٹھ جاتا
واں تیرے سوا کوئی نہیں یاد آتا

﴿۷﴾ قصیدہ، مرثیہ، نعت

حالی نے قصیدہ اور مرثیہ پر زیادہ طبع آزمائی نہیں کی ہے۔ اردو میں حالی نے صرف تین مراثی لکھے ہیں۔ غالب کا مرثیہ حکیم محمود خاں کا مرثیہ اور خواجہ امداد حسین کا۔ سرسید کا مرثیہ فارسی میں ہے۔ غالب کا مرثیہ ۱۸۶۹ء میں لکھا جو بہت خوب ہے۔ اپنے بھائی کی وفات پر جو مرثیہ لکھا وہ طویل بحر میں ہے۔ بھائی کے سانحۂ ارتحال پر زخموں سے چور ہو کر اُنہوں نے جو مرثیہ لکھا اس میں درد کرب کی مکمل عکاسی ملتی ہے۔ فارسی زبان میں سرسید کا مرثیہ فن شاعری کا حسین نمونہ ہے۔ اس میں جہاں شاعری کی سرسید کے تئیں عقیدت اور محبت اور ان کی وفات پر غم و اندوہ کا اظہار ہے، وہیں سرسید کی صفات، خدمات اور قوم مسلم پر ان کے احسانات کو بھی بھرپور طریقے سے قلم بند کیا گیا ہے۔

حالی کو قصیدے سے بہت کم دل چسپی تھی جس کی وجہ سے اُنہوں نے زیادہ قصیدے نہیں لکھے۔ بعض قصیدے نامکمل ہیں۔ اُنہوں نے قصیدے میں بے جا مبالغہ سے پرہیز کیا ہے۔ قصیدوں میں ممدوح کی تعریف اسی حد تک کی ہے جو صفات اس میں موجود تھی۔ حالی نے سر آسماں جاہ بہادری کی شان میں تین قصیدے لکھے ہیں جن میں دو نا تمام ہیں۔ ان میں ممدوح کی حقیقی صفات سے آگے قدم نہیں بڑھایا ہے۔ ان کے دو نعتیہ قصیدے ہیں جن میں قصیدے کی روایتی شان ملتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی شان میں لکھتے ہوئے حالی کی زبان میں بلند آہنگی، شان و شوکت از خود پیدا ہو جاتی ہے جو ان کے کلام کی عام سادگی سے مختلف ہے۔ عام طور پر حالی کے قصیدوں میں وہ فنی کمال نظر نہیں آتا جو ان کی اور نظموں میں ملتا ہے۔ حالی کی ایک دعا ''عرضِ حال'' بہت مشہور ہے۔ اس میں شاعر رسول اکرم ﷺ سے التجا کرتا ہے کہ اپنی اُمت کا حال دیکھیے۔ اس دعا کا ہر شعر قلبِ مومن کے اندر ایک نئی تازگی اور حرکت پیدا کرتا ہے۔

﴿۸﴾ حالی کی شاعری کی خصوصیات

حالی کے زمانے تک اردو شاعری صرف ذہنی آسودگی کا ذریعہ تھی اور فن برائے فن کے قائل تھے۔ حالی نے سب سے پہلے یہ محسوس کیا

کہ شاعری کو کسی مقصد کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔اسے حقیقی زندگی کا ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ اصلاح کے لئے استعمال کرنا چاہیے۔''مقدمہ ٔشعروشاعری'' لکھنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ شعرا کو ان کا اصلی مقام اور ذمہ داری سمجھائی جائے۔

اردو شاعری کی نئی راہیں حالی نے ہی کھولی ہیں۔ترقی پسند شاعری کی بنیاد بھی حالی کی رکھی ہوئی ہے۔حالی سادہ اور حقیقت نگار شاعر ہیں اور اپنا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔حالی کے کلام کی نمایاں خصوصیات سادگی، اصلیت، جوش اور حقیقت پسندی ہے۔حالی کی شاعری کا مقصد اپنے سادہ اشعار سے دل و دماغ کو متاثر کرنا تھا۔دل گدازی اور سادگی حالی کے اشعار کی جان ہیں۔وہ جو بات کہتے تھے لوگوں کے دلوں میں اُتر جاتی تھی۔حالی کا کلام قوم کے نام ایک حیات بخش پیام تھا جو لوگوں تک پہنچا اور قبولیت کی منزل بھی اسے ملی۔یہ اردو زبان اور ہندستانی تہذیب کا وہ سرمایہ ہے جس سے اہلِ دل اور نظر استفادہ کرتے رہیں گے۔

﴿۹﴾ حالی کی نثر

حالی سے پہلے اردو نثر کا موضوع محدود تھا۔حالی کے ابتدائی نثر کے نمونے مذہبی یا نیم مذہبی ہیں۔حالی نے نثر نگاری میں دو خاص موضوع منتخب کیے تھے، ادبی تنقید اور سیرت نگاری۔حالی کی نثر میں وضاحت، متانت، استدلال اور توازن پایا جاتا ہے۔حالی کے پاس الفاظ کا ذخیرہ موجود ہے۔حالی ہندی کے نرم شیریں الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ان کی چار نثری کتابیں بہت مشہور ہوئیں یعنی ''یادگارِ غالب''، ''حیاتِ جاوید''، ''حیات سعدی'' اور ''مقدمہ ٔشعروشاعری''۔ان کے علاوہ ''مجالس النساء'' بھی اپنے وقت میں بہت مشہور تھی۔''حیاتِ سعدی'' ۱۸۸۱ء میں، ''یادگار غالب'' ۱۸۹۶ء میں اور ''حیاتِ جاوید'' ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئیں۔سیرت نگاری میں حالی نے ایک نئی راہ نکالی جو بہت مقبول ہوئی۔''حیاتِ سعدی'' شیخ سعدی شیرازی کی سوانح حیات ہے جسے حالی نے نہایت مفصل طریقے سے لکھا ہے۔''یادگارِ غالب'' لکھنے سے حالی کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو ان کے کلام کا صحیح مقام اور اس کی خوبیاں اور خصوصیات سمجھائیں اور ساتھ ہی ساتھ غالب کی سیرت اور حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالیں۔''حیاتِ جاوید'' ایک ہزار صفحات پر مشتمل سوانح ہے جسے حالی نے سات سال کی محنت سے لکھا ہے۔حالی نے اس کتاب میں سوانح عمری لکھنے کے کچھ نئے اصول پیش نظر رکھے ہیں۔''حیاتِ جاوید'' سرسید احمد خان کی سوانح عمری ہے جس میں حالی نے سرسید کی تعریف میں مبالغے سے کام کیا ہے۔اس کی زبان اور طرزِ بیان بہت رواں ہے۔

''مقدمہ ٔشعروشاعری'' کو حالی کی نثری کتابوں میں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔حالی نے جب ۱۸۹۳ء میں اپنی قدیم اور جدید غزلیں متفرق کلام کے مبسوط مجموعے کے ساتھ شائع کیے تو ہر طرف سے شور وتحسین اور غوغائے مخالفت بلند ہوا۔حالی سے پہلے شعر کو عروض کی کسوٹی پر کسنا شعر کی تنقید سمجھا جاتا تھا۔حالی نے شعر کی بنیادی صفات پر بحث کی ہے۔ان کے مطابق شعر کا کام اصلاح کی طرف متوجہ کرنا ہے۔حالی نے شعر کی ضروریات اور تاثیر پر بھی نظر ڈالی ہے۔مقدمہ ٔشعروشاعری اردو میں فنِ تنقید کی پہلی کتاب ہے۔

﴿۱۰﴾ مکتوباتِ حالی

غالب سے پہلے اردو میں خط لکھنے کا رواج زیادہ نہ تھا۔غالب نے خط لکھنے کا ایک نیا انداز اپنایا اور اس بے تکلفی سے خط لکھے کہ ''مراسلے کو مکالمہ'' بنا دیا۔جن لوگوں نے غالب کی سادگی اور بے تکلفی کو اپنایا ان میں حالی بھی شامل تھے۔حالی کے خطوں کا مجموعہ ''مکتوباتِ حالی'' کے نام سے ۱۹۲۵ء میں حالی پریس پانی پت سے شائع کیا گیا جو اَب دَست یاب نہیں۔حالی کا خط لکھنے کا انداز بھی نہایت سیدھا سادہ

تھا۔ بزرگوں اور برابر والوں کو جنابِ من، والا جناب، مخدومی، مکرمی وغیرہ سے مخاطب کرتے تھے۔ بیٹوں، بھانجوں کو ''برخوردار'' لکھتے تھے۔ لڑکیوں سے محبت زیادہ رکھتے تھے۔ بچیوں کو ''نورچشمی، برخورداری'' لکھتے تھے۔ عالم فاضل لوگوں کو خط لکھتے وقت بھی عربی فارسی کے دقیق الفاظ کا استعمال کم کرتے تھے۔ علمی انداز کی جھلک کبھی کبھی نظر آجاتی ہے۔ عورتوں اور بچوں کو خط لکھتے تو ان کی فکری وسعت کے مطابق آسان اور سہل زبان اپناتے جیسے کوئی ان سے باتیں کررہا ہو۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۷﴾ صالحہ عابد حسین نے یادگارِ حالؔی کب لکھی؟

﴿۸﴾ حالؔی کی پیدائش کب ہوئی؟

﴿۹﴾ حالؔی نے فارسی کی تعلیم کس سے حاصل کی؟

11.06 سوانح عمری ''یادگارِ حالی'' کا منتخب متن

پانی پت کے محلّہ انصار میں ایک بزرگ خواجہ ایزد بخش انصاری رہتے تھے۔ ان کے ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تو پہلے ہی سے تھیں۔ ۱۸۳۷ء بہ مطابق ۱۲۵۳ھ میں ایک اور لڑکا پیدا ہوا' جس کا نام الطاف حسین رکھا گیا۔ اسی لڑکے کو آج دنیا حالی کے نام سے جانتی ہے۔ ان کی والدہ سیدانی تھیں اور والد کا شجرۂ نسب حضرت ابوایوب انصاری سے جاملتا ہے۔ ان کے بزرگوں میں بڑے بڑے عالم دین، صوفی اور ادیب و خطیب گزرے ہیں۔ میرک علی شاہ ہرات کا فرماں روا اور بڑا علم دوست بادشاہ تھا۔ اس کے بیٹے خواجہ ملک علی کسی وجہ سے دولت وحکومت چھوڑ کر ہندوستان چلے آئے۔ یہاں غیاث الدین بلبن نے ان کے علم وفضل سے متاثر ہوکر انہیں پانی پت میں زمین وجائداد دی اور ۱۲۷۶ھ میں وہ اس قصبے میں آباد ہوئے جس کے نام کو ان کی اولاد میں سے ایک شخص الطاف حسین حالی نے چار چاند لگائے۔ چنانچہ پانی پت حالی کے بزرگوں کا سات آٹھ سو سال سے وطن تھا اور یہیں ان کی پرورش اور تربیت ہوئی۔

نو برس کی چھوٹی سی عمر میں الطاف حسین کو یتیمی کا داغ سہنا پڑا۔ قدرت جس شخص سے دنیا میں کوئی بہت بڑا کام لینا چاہتی ہے اسے اکثر بچپن ہی میں ماں یا باپ کی آغوشِ شفقت سے جدا کردیتی ہے شاید اس لئے کہ جو بچے بچپن سے مصیبت اور صدمے اُٹھاتے ہیں اکثر ان کے دل دوسروں سے زیادہ نرم اور گداز، احساس اور دردمند اور اسی کے ساتھ مضبوط ہوتے ہیں۔ باپ کے انتقال سے پہلے ہی الطاف حسین ماں کی تربیت سے محروم ہوچکے تھے۔ ان کی والدہ کے دماغ میں کچھ خلل سا آگیا تھا اور اس لئے وہ عرصے سے دنیا کے معاملات سے بے گانہ اور عام طور پر بالکل خاموش رہا کرتی تھیں۔ ماں کے دماغ کی خرابی اور باپ کی بے وقت موت سے الطاف حسین کے ننھے سے دل پر جو چوٹ لگی اس کی بہت کچھ تلافی بھائی بہنوں کی محبت نے کردی۔ بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے چھوٹے بھائی کو اپنے سایۂ شفقت میں لے لیا اور بہنوں نے بھی اس دُرِّ یتیم کی پرورش میں اپنی جان لڑادی۔

پرانے زمانے کے دستور کے موافق ساڑھے چار سال کی عمر میں الطاف حسین کی بسم اللہ ہوئی۔ پانی پت کا ایک پرانا دستور یہ تھا کہ وہاں ہر مسلمان بچہ قرآن شریف کا ایک حصہ ضرور حفظ کرتا تھا اور وہاں کی قرأت سارے ملک میں مشہور تھی۔ الطاف حسین کو پانی پت کے ایک جید قاری حافظ ممتاز حسین کے پاس قرآن شریف کی تعلیم کے لئے بٹھایا گیا۔ ان کو پڑھنے کا بچپن سے بے حد شوق تھا اور حافظہ غیر معمولی طور پر

اچھا تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے جلد ہی قرآن شریف حفظ کر لیا۔ وہ بچپن سے قرآن پاک اس قدر خوش الحانی اور صحت کے ساتھ پڑھتے تھے کہ بڑے بڑے قاری اور عالم تعریف کرتے تھے۔ ان کا اپنا بیان یہ ہے کہ اس کے بعد سے پھر کبھی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن طبیعت کو علم سے فطری طور پر لگاؤ تھا اس لئے یہ سلسلہ کسی نہ کسی طرح چلتا رہا۔ حفظِ قرآن کے بعد فارسی کی تھوڑی سی تعلیم سید جعفر علی سے حاصل کی جو فارسی کے بہت اچھے ادیب اور سخن فہم سمجھے جاتے تھے۔ ان کے فیضِ صحبت سے الطاف حسین کو اسی وقت سے نہ صرف فارسی زبان اور ادب سے دل چسپی پیدا ہوگئی بلکہ ان کی طبیعت میں شاعری کا جو فطری مادہ تھا اسے بھی جلا ملی۔

فارسی کے ساتھ ساتھ انہیں عربی کا بھی شوق پیدا ہوا۔ پانی پت کے ایک نوجوان حاجی ابراہیم صاحب اسی زمانے میں تحصیلِ علم کے بعد مجتہد بن کر واپس آئے تھے۔ الطاف حسین نے ان سے عربی سیکھنی شروع کی اور صرف ونحو کی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ اپنی تعلیم کو تکمیل کے درجے تک پہنچائیں لیکن ابھی عمر کی صرف سترہ ہی منزلیں طے کی تھیں کہ خاندان کے بزرگوں کو یہ شوق پیدا ہوا کہ ان کی شادی کر دیں۔ الطاف حسین کو اس وقت شادی کی ذرا بھی خواہش نہ تھی۔ ابھی اُنہوں نے علم کے دریا سے ایک چلو ہی پیا تھا اور جی بھر کر سیراب ہونا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر شادی ہوگئی تو تعلیم کو ترک کر کے روزی کمانے کی فکر کرنی ہوگی لیکن بزرگوں کو اس کی کیا پروا کہ خود الطاف حسین کے لئے بھائی کا حکم گویا باپ کا حکم تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نوجوان اکثر اپنی بڑی خواہش اور آرزو کو بزرگوں کے حکم پر قربان کر دیتے تھے اور ماتھے پر بل تک نہ لاتے تھے۔ الطاف حسین بچپن سے دیکھتے آئے تھے کہ بزرگوں کی رائے سے اختلاف کرنا یا ان کے حکم سے انکار کرنا خاندانی روایات اور آدابِ شرافت کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے بھائی کو بہت چاہتے تھے اور ان کی خواہش کو رَد کر کے ان کے دل کو دکھ نہیں پہنچا سکتے تھے۔ لہٰذا وہ سعادت مندی کے تقاضے سے مجبور ہوگئے اور سترہ سال کی عمر میں ان کی شادی رچا دی گئی۔

شادی تو ہوگئی مگر علم کی پیاس کم نہیں ہوئی۔ بیوی خوش حال گھرانے کی تھیں۔ الطاف حسین نے اس کو غنیمت جانا کہ ابھی بیوی کا بار ان کے اوپر نہیں۔ اس فرصت سے پورا فائدہ اُٹھانے کے لئے اُنہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ دلی جا کر جو اُجڑی حالت میں بھی علوم وفنون کا مرکز تھی، تحصیل علم کریں۔ دلی اگرچہ پانی پت سے صرف پچپن میل کا فاصلہ ہے لیکن یہ وہ زمانہ تھا کہ دلی جانا گویا کسی دوسرے ملک کا سفر کرنا تھا۔ ریل اس وقت تک جاری نہیں ہوئی تھی۔ اونٹ گاڑی یا بیل گاڑی پر یا پیدل سفر کرنا ہوتا تھا اور پردیس جا کر جلدی جلدی واپس آنا مشکل ہوتا تھا۔ الطاف حسین جانتے تھے کہ انہیں دلی جانے کی اجازت نہ ملے گی۔ ایک دن جب ان کی بیوی اپنے میکے گئی ہوئی تھیں وہ بغیر کسی سے کچھ کہے سنے اور بغیر کسی سامان کے پاپیادہ دلی کی طرف روانہ ہوگئے۔ شاید راستے میں اونٹ گاڑی یا بیل گاڑی میں بھی کچھ مسافت طے کی ہو۔

علم کا یہ سچا شیدائی جب دلی پہنچا تو بالکل خالی ہاتھ تھا۔ خدا ہی جانے یہ کٹھن زمانہ کس طرح کاٹا۔ کیسے گزر بسر کے قابل پیسہ کمایا۔ اس زمانے کا مفصل حال کہیں دَست یاب نہیں ہوتا۔ اتنا البتہ معلوم ہے کہ جامع مسجد کے قریب حسین بخش کا مدرسہ تھا جس میں مشہور فاضل اور واعظ مولوی نوازش علی درس دیتے تھے۔ الطاف حسین اس میں داخل ہوگئے اور بہت عسرت کے ساتھ اور تکلیف اُٹھا کر علم کی دولت حاصل کرنی شروع کی۔ انہیں طلب علم کی دھن میں آرام وآسائش کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔ تکیہ نہ ہوتا تو سر کے نیچے اینٹیں رکھ لیتے کھانے کو نہ ملتا تو رات کو بھوکے سو رہتے۔ روح کی بھوک اور دل کی پیاس بجھانے میں ان چیزوں کی طرف دھیان ہی نہ جاتا تھا مولوی نوازش علی کے علاوہ دلی کے زمانۂ قیام میں اُنہوں نے مولوی فیض حسن، مولوی میر احمد اور شمس العلما میاں سید نذیر حسین کے درس سے بھی استفادہ کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندستان میں انگریزی تعلیم کا چرچا تھوڑا بہت شروع ہو چکا تھا اور قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا مگر حالی اس دنیا سے بالکل بے خبر تھے۔ ان کے وطن پانی پت میں انگریزی تعلیم کو گناہ اور بدعت سمجھا جاتا اور انگریزی مدرسوں کو ''مجہلے'' (جہالت کی جگہ) کہا جاتا تھا۔ دلی آئے تو جس مدرسے میں پڑھنا شروع کیا وہاں بھی انگریزی پڑھنے کو عیب اور انگریزی دانوں کو جاہل سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے اگرچہ الطاف حسین ڈیڑھ برس دلی میں رہے اور ان کے دل میں علم کی سچی لگن موجود تھی لیکن کبھی بھول کر بھی انگریزی مدرسے میں پڑھنے یا اسے جا کر دیکھنے تک کا شوق نہ پیدا ہوا۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں اُنہوں نے محض انگریزی کتابوں کے ترجمے پڑھ کر وہ کچھ حاصل کر لیا جو لوگ انگریزی تعلیم میں ساری زندگی کھپانے کے بعد بھی نہیں پا سکتے۔

دلی کے زمانۂ قیام میں جب ان کی عمر غالباً اٹھارہ سال کی تھی، اُنہوں نے عربی میں ایک چھوٹی سی کتاب لکھی۔ یہ ان کی سب سے پہلی تصنیف تھی۔ مصنّف کو اپنی پہلی تصنیف سے جو محبت ہوتی ہے، اسے کون اہلِ قلم نہیں جانتا۔ پہلی تصنیف اس کی ادبی زندگی کا سنگِ بنیاد ہوا کرتی ہے اور اس موقعے پر اس کو قدر دانوں کی حوصلہ افزائی کی بہت ضرورت ہوتی ہے لیکن ان کی پہلی تصنیف کا جو نہایت محنت اور خوبی سے لکھی گئی تھی، جو حشر ہوا وہ قابلِ ذکر ہے۔ خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں اس کا ذکر یوں لکھا ہے:

> ''غدر سے دو تین سال پہلے مولانا دہلی میں زیرِ تعلیم تھے۔ اس زمانے میں ایک عربی رسالہ آپ نے تصنیف کیا جس میں منطقی مسئلہ مولوی صدیق حسن خان بہادر کی تائید میں تھا جسے ان کے استاد نے پڑھ کر نہایت ناراضی کا اظہار کیا یہاں تک کہ اسے چاک کر دیا۔ مولانا کو قدرتی طور پر رنج ہوا لیکن استاد نے جو مشہور حنفی عالم تھے اور حسین بخش کے مدرسے میں پڑھاتے تھے کہ کہ رسالہ اگرچہ نہایت لیاقت سے لکھا گیا تھا مگر چوں کہ ایک وہابی مولوی کی تائید میں تھا اس لئے چاک کر دیا گیا۔''

اس زمانے میں علم وفن کی شمع دلّی میں بجھنے سے پہلے بھڑک اٹھی تھی۔ علاوہ اور علوم وفنون کے شاعری بھی فروغ پر تھی۔ الطاف حسین کو بھی اکثر مشاعروں میں شرکت کا اتفاق ہوتا۔ فطرت نے جو خداداد جوہر ان کو ودیعت کیا تھا وہ اُبھرنے لگا خوش قسمتی سے ان کی ملاقات مرزا غالب سے ہوگئی۔ اس زمانے میں غالب کا کلام عام طور پر مقبول نہ تھا لیکن خاص خاص لوگ اس کی بے حد قدر کرتے تھے۔ الطاف حسین کو مرزا کا کلام دل سے پسند آیا۔ وہ اکثر ان کے پاس جاتے اور ان کے اردو فارسی کے مشکل شعروں کا مطلب خود ان سے سمجھا کرتے۔ اسی سلسلے میں اُنہوں نے ایک آدھ غزل اردو اور فارسی میں لکھ کر مرزا غالب کو دکھائی۔ غالب بڑے سخت نقاد تھے اور اس پر بہت خفا ہوا کرتے تھے کہ ہر کس وناکس شعر کہنا شروع کر دیتا ہے لیکن اس سترہ اٹھارہ سال کے لڑکے کے ابتدائی کلام کو دیکھ کر وہ پھڑک گئے۔ اُنہوں نے وہ جوہرِ قابل پرکھ لیا جو آگے چل کر ایک دنیا کو مسحور کرنے والا تھا۔ اُنہوں نے حالی سے کہا:

> ''میں کسی کو فکرِ شعر نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔''

الطاف حسین کو اپنے تعلیمی مشاغل سے بہت کم فرصت ملتی لیکن غالب کی ہمت افزائی کی بنا پر اُنہوں نے شعر گوئی کی تھوڑی بہت مشق جاری رکھی۔ اس زمانے میں خستہ تخلص کرتے تھے۔

الطاف حسین دل لگا کر تعلیم پا رہے تھے اور ساتھ ہی شعر وسخن کی محفلوں سے بھی لطف اُٹھا رہے تھے اور شعر گوئی بھی شروع کر دی تھی کہ ان کے دلّی میں موجود ہونے کی خبر پانی پت میں پہنچ گئی۔ خاندان والے سن کر بے قرار ہو گئے۔ بڑے بھائی اور کئی دوسرے عزیز دلی آئے اور انہیں مجبور کیا کہ گھر واپس چلو۔ اگر چہ ان پر تعلیم چھوڑ نا سخت شاق تھا مگر بڑے بھائی کی بات کو ٹال نہیں سکتے تھے۔ بادلِ ناخواستہ ۱۸۵۵ء میں پانی پت واپس آ گئے مگر یہاں پہنچ کر پھر تحصیل علم میں اس طرح محو ہو گئے کہ کسی چیز کی خبر نہ رہی۔

الطاف حسین کو گھر آئے ڈیڑھ برس گزر گیا۔ وہ اپنے مطالعے میں مصروف تھے لیکن عزیزوں اور دوستوں کا مسلسل اصرار تھا کہ فکرِ معاش کرو۔ اس عرصے میں غالباً ایک بچہ بھی ہو چکا تھا۔ جب لوگوں کا اصرار بہت بڑھ گیا تو مجبوراً اپنی تعلیم کو چھوڑ کر ۱۸۵۶ء میں تلاشِ معاش میں گھر سے نکلے۔ اور آخر کار حصار میں انہیں تھوڑی سی تنخواہ پر ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں جگہ مل گئی۔ الطاف حسین نوکر تو ہو گئے مگر انہیں اطمینان سے کام کرنا یہاں بھی نصیب نہ ہوا۔ یہ زمانہ ہی انتشار اور پریشانی کا تھا۔ ملک میں ایک طرف انگریزی حکومت کا تسلط رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا، دوسری طرف اس حکومت کے خلاف لوگوں کے دلوں میں بغاوت کے جذبات اندر ہی اندر نشو نما پا رہے تھے جو ایک دَم آتش فشاں مادّے کی طرح پھٹ پڑے اور ۱۸۵۷ء میں ہنگامہ شروع ہو گیا جسے غدر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جو کہ غلط ہے۔ سارے ملک میں خصوصاً شمالی ہند میں ایک قیامت برپا تھی۔ کسی کو اپنا جان و مال محفوظ نظر نہ آتا تھا حصار میں بھی جہاں الطاف حسین نوکر تھے سخت گڑبڑی مچی ہوئی تھی۔ ایسے وقت پر ہر شخص کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے وطن میں عزیزوں کے ساتھ ہو۔ الطاف حسین نے اللہ کا نام لیا اور جان ہتھیلی پر رکھ کر حصار سے پانی پت روانہ ہو گئے۔ راستے میں ان پر جو کچھ گزری اس کا اندازہ آپ کو ان کے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین کے بیان سے ہوگا:

> ''والد جس گھوڑی سے سفر کر رہے تھے وہ بھی ڈاکوؤں نے چھین لی اور آپ کے پاس صرف ایک حمائل (چھوٹا قرآن شریف) باقی رہ گئی تھی۔ جب پانی پت پہنچے تو پیدل سفر کی صعوبت اور راستے میں ناموافق اور ناوقت غذاؤں کی وجہ سے آپ کو اسہال کی شکایت ہو گئی جو ایک سال سے زیادہ رہی اور آخر پانی پت کے مشہور طبیب حکیم خورشید صاحب مرحوم نے والد کو گڈّیوں (بکرے کی گھٹنے کی ہڈی) کا پلاؤ بتایا اور اس سے مرض کا ازالہ ہو گیا۔ جوانی میں والد مرحوم کے قویٰ بہت اچھے تھے اور آپ کو کسرت کا بھی شوق تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس حصار میں پانی پت تک کے سفر میں جو تکلیف اُٹھائی اس نے ان کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا اور آپ اکثر معدے اور سینے اور پھیپھڑے کے امراض میں مبتلا رہنے لگے باوجود انتہائی احتیاط کے جو آپ کی عادت تھی۔''

بہر حال وہ کسی نہ کسی طرح پانی پت پہنچ ہی گئے۔ عزیز و اقارب نے زندہ سلامت دیکھا تو جان میں جان آئی۔ پانی پت اگر چہ فتنہ و فساد سے بچا رہا لیکن اس وقت تک لوگوں کو سخت خطرہ تھا، دلّی جہاں یہ قیامت بپا تھی پچیس کوس ہی تو تھی! وہاں کے تباہ حال خاندانوں میں سے بہت سے لوگوں نے پانی پت کو منتخب کیا اور دلّی سے بھاگ بھاگ کر یہاں آ گئے۔ پانی پت والوں نے اس وقت سچی انسانی ہم دَردی کا ثبوت دیا اور اپنے گھروں کے دروازے ان مصیبت زدوں کے لئے کھول دیے۔ الطاف حسین اس وقت بیس سال کے نوجوان تھے مگر تجربہ، متانت اور زمانہ شناسی بوڑھوں جیسی تھی۔ دل ایسا دردمند اور حساس پایا تھا کہ چیونٹی کی تکلیف پر بھی دکھ جاتا تھا پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ مصیبت زدہ

بھائیوں کی مدد نہ کرتے۔ دوسروں کے ساتھ وہ بھی اسی کام میں لگ گئے۔ الطاف حسین کے گھر میں جن لوگوں نے پناہ لی تھی ان میں سے بعض یہیں کے ہو رہے۔ ایک مصیبت زدہ خاندان کی کفالت ان کے بھائی بھاوج نے ہمیشہ کے لئے اپنے ذمے لی تھی۔ ایک اور اسّی سالہ بوڑھی بی مڑیا کو میں نے خود دیکھا تھا۔ یہ بی بی غدر میں دس سال کی تھیں، عقد ہو چکا تھا، رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ غدر کا ہنگامہ برپا ہوا اور ماں باپ عزیز و اقارب، شوہر سب مارے گئے اور اس کم سن لڑکی نے الطاف حسین کے خاندان میں آکر پناہ لی پھر اپنی ساری عمر انتہائی شرافت اور عزت و خودداری کے ساتھ اس گھر میں گزار دی۔ جب تک ہاتھ پاؤں چلتے رہے سلائی کر کے، چھالیہ کاٹ کے، طرح طرح کے کشیدے کے کام اُجرت پر کرتی اور اپنا خرچ چلاتی رہیں۔ آخر عمر میں مولانا حالؔی کی بڑی پوتی مشاق فاطمہ نے ان کی دیکھ بھال اور خدمت کا بار اپنے ذمے لے لیا تھا اور ان کی وفات تک ان کی ایسی خدمت کرتی رہیں جیسے کوئی بڑی سعادت مند بیٹی اپنی ماں کی کرتی ہے۔ خواجہ الطاف حسین بھی جب تک زندہ رہے بی مڑیا کا بڑا لحاظ اور خیال کرتے تھے۔ عمر بھر بی مڑیا کو یہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ اسی خاندان کی ایک معزز فرد نہیں ہیں۔

غدر کا ہنگامہ ہونے کے بعد بھی برسوں تک ملک کی ایسی حالت رہی کہ ہر شخص گھر سے نکلتے اور باہر جاتے گھبراتا تھا۔ کاروبار، دفتر، اسکول، کالج سب بند تھے۔ جو تھا وہ اپنی جگہ سہما، ڈرا ہوا۔ سرکار انگریزی نے انتقام کے جوش میں دلّی کے بیش تر معزز گھرانوں کو نیست و نابود کر دیا۔ جس کسی پر کسی دشمن نے جھوٹ موٹ کوئی الزام لگا دیا اسے بے تکلف سولی پر چڑھا دیا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ دلی کا کوئی محلّہ نہ تھا جہاں سولی نہ کھڑی کی گئی ہو! اس زمانے میں الطاف حسین کو مسلسل چار سال پانی پت میں رہنا پڑا۔ نوکری چھوٹ چکی تھی، کسی نوکری کا فی الحال کوئی امکان نہ تھا اس لئے غالباً خیر خواہوں نے بھی یہ اصرار کرنا چھوڑ دیا ہوگا کہ ملازمت کرو۔ الطاف حسین نے یہ فرصت کو غنیمت جانا اور پوری توجہ اپنی تعلیم کی طرف کر دی۔ وہ خود اپنی اس زمانے کی تعلیم کا حال یوں لکھتے ہیں۔

> ''اس زمانے میں پانی پت کے مشہور فضلاء مولوی عبد الرحمٰن، مولوی محبّ اللہ اور مولوی قلندر علی مرحومان سے بغیر کسی ترکیب اور نظام کے کبھی منطق، کبھی حدیث، کبھی تفسیر پڑھتا رہا اور جب ان صاحبوں میں سے کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور خاص کر علم و ادب کی کتابیں شرح و لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا۔''

غالباً اسی زمانے میں الطاف حسین نے اپنا مشہور تخلص حالؔی اختیار کیا۔

حالی کے بڑے بیٹے خواجہ اخلاق حسین مرحوم کی پیدائش غالباً اس وقت ہو چکی تھی جس زمانے میں وہ دلّی سے واپس آکر پانی پت میں رہ رہے تھے۔ حالؔی کے بھائی خواجہ امداد حسین نے جو لاولد تھے انہیں اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ حالؔی جب ان کا ذکر کرتے ہیں تو ''برادر زادہ'' کہہ کرتے ہیں۔ اس عرصے میں ان کے کئی اور بچے بھی پیدا ہوئے جس میں بعض مر گئے۔ ان کی بیٹی عنایت فاطمہ جو زندہ رہیں وہ بھی اسی زمانے میں پیدا ہوئی تھی۔ سب سے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین کی ولادت ۱۲۷۸ھ میں ہوئی۔

اب حالؔی کی ذمہ داریاں اور بڑھ گئیں۔ خاندانی جائداد بہت تھوڑی تھی۔ سارے خاندان کا بار بڑے بھائی کی تنخواہ پر تھا۔ آخر حالؔی کو پھر روزی کی فکر میں تعلیم کو خیر باد کہنا پڑا اور وہ تلاشِ معاش میں دلّی روانہ ہوئے۔ دلّی کو غدر نے تباہ و برباد کر دیا تھا مگر اس کے لٹنے کے بعد بھی

اس کی پرانی شان کچھ نہ کچھ باقی تھی۔اب بھی علم وفن اور شعروسخن کا اچھا خاصا چرچا تھا۔حالؔی دلّی آئے تو شعروسخن کا ذوق پھر تازہ ہوگیا اور وہ علمی مجلسوں اور ادبی محفلوں میں آنے جانے لگے۔

دلّی میں ان کی ملاقات نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ سے ہوگئی۔شیفتہؔ اس ذہین، شریف نیک سیرت نوجوان سے جس نے اس کم سنی ہی میں علم وفضل میں غیر معمولی قابلیت پیدا کر لی تھی اور جس کا ذوقِ سُخن نہایت پاکیزہ تھا بہت متاثر ہوئے۔اُنہوں نے حالؔی کو جہانگیر آباد بلا کر اپنے بچوں کی اتالیقی ان کے سپرد کردی۔اور اس طرح آٹھ سال کے قریب حالؔی اور شیفتہؔ ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔شیفتہؔ سے حالؔی کو گہرا تعلق تھا اور وہ ان کی سخن فہمی اور ذوقِ شعر کے بڑے قائل تھے۔ان کا اپنا بیان ہے کہ انہیں غالبؔ کی اصلاح سے وہ فائدہ نہیں ہوا جو شیفتہؔ کی صحبت سے ''نواب مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس دلّی وتعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں حسرتؔی اور اردو میں شیفتہؔ تخلص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجے کا شوق رکھتے تھے شناسائی ہوگئی اور سات آٹھ برس تک بطور مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔

> ''نواب صاحب جس درجے کے شاعر تھے اس کی بہ نسبت ان کا مذاق شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ ترین واقع ہوا تھا۔اُنہوں نے اِبتدا میں اپنا فارسی کلام مومنؔ خاں کو دکھایا تھا مگر ان کے مرنے کے بعد مرزا غالبؔ سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔میرے وہاں جانے سے ان کا پرانا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہوگیا اور ان کی صحبت میں میرا میلان طبعی جواب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اُٹھا۔اس زمانے میں اردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب صاحب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔انہیں کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالبؔ کے پاس بھیجتا تھا مگر درحقیقت مرزا کے مشورے سے اور اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔وہ مبالغے کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق وواقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حُسنِ بیان سے دل فریب بنانا اس کو منتہائے کمالِ شاعری سمجھتے تھے.....ان خیالات کا مجھ پر بھی اثر پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہوگیا۔''

۱۸۶۹ء میں شیفتہؔ کا انتقال ہوگیا اور حالؔی کو پھر معاش کی فکر ہوئی۔اس مرتبہ لاہور میں پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں انہیں ایک جگہ مل گئی۔یہاں ان کے ذمے یہ کام تھا کہ انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی اردو کتابوں پر نظرِ ثانی کریں اور اُن کی عبارت درست کریں۔حالؔی کی زندگی کا رُخ پلٹنے میں اس ملازمت کو بڑا دخل ہے۔وہ چار برس تک لاہور میں یہ کام انجام دیتے رہیں اور اس بہانے قدرت نے انگریزی نہ پڑھ سکنے کی کمی پوری کردی۔حالؔی انگریزی زبان اور ادب کی بہت سی کتابوں کے مطالب سے واقف ہوگئے۔بہت سے وہ خیالات اُن کے اپنے دل کی گہرائیوں میں موجود تھے لیکن وہ ان کو پوری طرح ظاہر نہ کر سکتے تھے اب ان پر واضح ہوگئے، اردو اور فارسی ادب اور شاعری میں جن کمیوں کو وہ محسوس کرتے تھے اب انگریزی ادب کے مطالعے سے ان پر یہ ظاہر ہوا کہ حقیقت میں وہ کیا ہیں۔گویا انگریزی ادب کی تنقیدی کتابیں پڑھ کر اُنھیں یہ محسوس ہوا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔اب انہیں ادب کے صحیح مقام کا اندازہ ہوا اور اُنہوں نے جانا کہ ادب کے ذریعے کس طرح انسانوں کی خدمت کی جاسکتی ہے۔یہ اثر رفتہ رفتہ اتنا بڑھا کہ روز بروز حالؔی کی نظروں میں مشرقی لٹریچر خاص کر فارسی لٹریچر کی

جس سے ادب تک انہیں بہت لگاؤ تھا، وقعت کم ہونے لگی اور مغربی ادب کی طرف رجحان بڑھتا گیا۔ ان پر نہ صرف مغربی ادب کا گہرا اثر پڑا بلکہ انگریزی زبان سے بھی بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ وہ اپنی نثر میں انگریزی الفاظ بے تکلف استعمال کرتے ہیں اور کہیں کہیں تو شعر میں بھی لے آتے ہیں۔

حالؔی لاہور ہی میں تھے کہ مولوی محمد آزادؔ نے جو عرصے سے اردو شاعری کی اصلاح کی فکر میں تھے، اپنا ایک پرانا ارادہ پورا کیا اور ۱۸۷۴ء میں ایک نئے قسم کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں بجائے مصرعِ طرح کے شاعروں کو کوئی موضوع طبع آزمائی کے لئے دیا جاتا تھا کہ وہ جس اُسلوب سے اور جس بحر میں ہوں اپنے خیالات نظم کریں۔

حالؔی تو اس موقعے کے انتظار ہی میں تھے کہ بے مصرف غزل گوئی کو چھوڑ شاعری کی کوئی نئی راہ انتخاب کریں..... چنانچہ بڑی خوشی اور گرم جوشی کہ ساتھ اُنہوں نے اس نئی وضع کے مشاعرے کا خیر مقدم کیا اور اس کے چار جلسوں کے لئے چار مسلسل نظمیں یا مثنویاں لکھیں۔ برکھارت، اُمید، تعصب وانصاف اور حُبِ وطن۔ یہ چاروں نظمیں بڑی دل کش، شیریں اور دل چسپ ہیں۔ خصوصاً حُب وطن اپنا جواب آپ ہی ہے۔ حالؔی سے پہلے اور غالباً بعد میں بھی اس موضوع پر اتنی پُر خلوص پر کیف اور پر اثر نظم کسی نے نہیں کہی۔

لاہور کے قیام کے زمانہ میں حالؔی نے نثر میں کبھی کئی کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب تریاقِ مسموم لکھی جو اپنے ایک ہم وطن مسلمان کی کتاب کے جواب میں تھی جو اس نے عیسائی ہونے کے بعد لکھی تھی۔ ایک جیولوجی کی کتاب کا انگریزی سے ترجمہ کیا اور اس کا حق تصنیف بغیر کسی معاوضے کے پنجاب یونیورسٹی کو دے دیا۔ تیسری کتاب ''مجالس النساء'' لکھی جس میں قصے کے پیرایے میں عورتوں کی تعلیم وتربیت اور بچوں کے پرورش کے بہترین اُصول اور طریقہ دل چسپ انداز میں بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب اس زمانہ میں بہت مقبول ہوئی اور عرصۂ دراز تک پنجاب کے زنانہ اسکول کے نصاب میں شامل رہی اور کرنل ہالرائڈ جو علمی وادبی تصانیف کے بڑے قدر دان تھے اس پر چار سو روپے کا انعام پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے حالؔی کو دلایا تھا۔

حالؔی تقریباً چار سال لاہور میں رہے مگر ان کا دل وہاں نہیں لگا۔ ان کو دلّی سے محبت تھی اور ہونی ہی چاہیے تھی۔ پانی پت ان کا وطن تھا اور دلی ان کا وطن ثانی مگر وطن ثانی کی محبت اصل وطن سے بھی بڑھ گئی تھی۔ ان کا دل دلّی اور دلّی کی صحبتوں کے لئے ترستا تھا۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

رہے لاہور میں آکر سو جانے — یہی دنیا ہے جو دار المحن ہے
یہاں بے گانگی ہے اس قدر عام — کہ بلبل ناشناسائے چمن ہے

برکھارت میں بھی وطن کی یاد اور وطن کی خوب صورت برسات اور صحبتوں کا ذکر بڑے پر اور دل کش انداز میں کیا ہے۔

بے زَار اک اپنی جان وطن سے — بچھڑا ہوا صحبت وطن سے
غربت کی صعوبتوں کا مارا — چلنے کا نہیں ہے جس کو یارا
غم خوار ہے کوئی اور نہ دل جو — ایک باغ میں پڑا لبِ جو
تھا سوز میں کچھ ملا ہوا ساز — پکڑا گیا دل سن اس کی آواز

پھر غور سے اک نظر جو ڈالی
نکلا وہ ہمارا دوست حالؔی

انہیں لاہور کی آب و ہوا بھی موافق نہیں تھی اور وہاں برابر صحت خراب رہتی تھی۔ آخر دلّی جانے کی صورت نکل آئی اور وہ اینگلو عربک اسکول میں مدرس ہوکر یہاں آ گئے۔ وہاں اُنہوں نے کئی سال تک بڑی محنت اور دل سوزی سے طالب علموں کو پڑھایا۔ جن لوگوں نے حالؔی سے درس لیا ہے وہ ہمیشہ ان کے پڑھانے کے معترف اور مدّاح رہے۔

دلّی میں آ کر بھی حالؔی کو دلی سکون نصیب نہ ہوا۔ وہ ایک نئی اُلجھن اور ذہنی کش مکش میں مبتلا تھے۔ نوجوانی کا دَور گزر چکا تھا۔ عشقیہ شاعری کا ولولہ سرد ہو گیا تھا۔ گل و بلبل کی داستان سے جی سیر ہو چکا تھا۔ داخلی زندگی کا وہ دَور جس میں انسان صرف اپنی ذات کو دیکھتا اور خود اپنی پرستش کرتا ہے گزر گیا تھا اور اب اُنہوں نے ایک بہت وسیع دنیا میں قدم رکھا تھا۔ اب بجائے عشق کے روگ کے قوم کا درد اُن کو ستا رہا تھا۔ ملک اور قوم کی زبوں حالی نے ان کے درد آشنا اور حساس دل پر بہت اثر ڈالا۔ شعر و ادب کا موجودہ مذاق اس نازک زمانے میں نکمّا اور فضول معلوم ہونے لگا۔ جب جہاز ڈوب رہا ہو تو مسافروں کا چنگ و رباب پر گانا کیا بھلا معلوم ہو سکتا ہے؟ حالؔی کو اپنا ۲۰-۲۲ سال کا شعری سرمایہ بالکل نکمّا اور بے قدر نظر آیا۔ کسی برتر اور اعلیٰ کام کا ولولہ ان کے دل میں اُبھر رہا تھا۔ شعر و ادب میں اصلاح، قوم کو اُبھارنے کا جذبہ، انسانوں کو انسان بنانے کی تمنا غرض مختلف جذبات تھے جو دل میں موجزن تھے مگر ابھی تک انہیں صحیح راستے کا علم نہ ہو سکا تھا کہ کدھر جائیں..... ان پر ایک افسردگی اور یاس کی کیفیت طاری تھی۔ اس زمانے کے احساسات کو اُنہوں نے مسدّسِ حالی کے دیباچے میں لکھا ہے:

> ''بچپن کا زمانہ جو حقیقت میں دنیا کی بادشاہت کا زمانہ ہے ایک ایسے دل چسپ اور پُر فضا میدان میں گزرا جو کلفت کے گرد و غبار سے پاک تھا نہ وہاں ریت کے ٹیلے تھے نہ خاردار جھاڑیاں تھیں نہ آندھیوں کے طوفان نہ بادِ سموم کی لپٹ تھی۔ جب اس میدان سے کھیلتے کودتے آگے بڑھے تو ایک اور صحرا اس سے بھی زیادہ دل فریب نظر آیا جس کے دیکھتے ہی ہزاروں ولولے اور لاکھوں اُمنگیں خود بخود دل میں پیدا ہو گئیں مگر یہ صحرا جس قدر نشاط انگیز تھا اسی قدر وحشت خیز بھی تھا..... باغ جوانی کی بہار اگرچہ قابلِ دید تھی مگر دنیا کے مکروہات سے دَم لینے کی فرصت نہ ملی نہ خود آرائی کا خیال آیا اور نہ عشق و جوانی کی ہوا لگی۔ نہ وصل کی لذّت اٹھائی نہ فراق کا مزا چکھا۔''

11.07 سوانح عمری ''یادگار حالی'' کے منتخب متن کا خلاصہ

خواجہ الطاف حسین حالؔی کی پیدائش ۱۸۳۷ء میں دلّی کے نزدیک قصبہ پانی پت میں ہوئی تھی۔ ان کے والد خواجہ ایزد بخش انصاری کا انتقال اس وقت ہو گیا جب حالؔی کی عمر صرف ۹ رسال کی تھی۔ ان کی والدہ کا بھی ذہنی توازن کچھ بگڑ گیا تھا۔ ایسے حالات میں حالی کی پرورش اور نشو و نما کی ذمہ داری ان کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے اپنے سر لے لی۔ ساڑھے چار برس کی عمر میں حالؔی کی بسم اللہ ہوئی۔ جلد ہی حالؔی حافظِ قرآن بھی بن گئے۔ حالؔی کو حصولِ تعلیم کا بڑا شوق تھا اور چاہتے تھے کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کریں مگر افرادِ خانہ کو حالؔی کی شادی کی فکر ہوئی اور صرف سترہ سال کی عمر میں حالی کے نہ چاہنے کے باوجود ان کی شادی ان کی ماموں زاد بہن اسلام النساء سے کرا دی گئی۔ حالؔی ایک دن کسی کو

بتائے بغیر دلّی چلے آئے اور جامع مسجد کے قریب مدرسہ حسین بخش میں داخلہ لے لیا۔ اس زمانے میں دلّی میں علوم وفنون کے ساتھ شاعری کا بھی دَور دَورہ تھا۔ یہاں حالؔی کی ملاقات غالبؔ سے ہوئی۔ حالؔی نے اپنے ابتدائی کلام کی اصلاح غالبؔ سے لینا شروع کردی۔ اس زمانے میں حالؔی حسرتؔ تخلص رکھتے تھے۔

کچھ عرصہ بعد حالؔی کے اہلِ خانہ کو ان کی دلّی میں موجودگی کی خبر مل گئی اور وہ حالی کو پانی پت واپس لے گئے۔ گھر پہنچ کر بھی حالی مصروفِ مطالعہ رہتے تھے مگر گھر والوں کا اصرار بڑھتا گیا کہ اب کچھ فکرِ معاش بھی ہونی چاہیے کیوں کہ اس دَوران ان کا ایک بیٹا ہو چکا تھا۔ آخر کار پانی پت چھوڑ کر حالؔی حصار پہنچے جہاں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ایک قلیل تنخواہ کے عوض ملازمت مل گئی۔ حصار سے پھر معاشی ضروریات کی تکمیل کے لئے دلّی تشریف لے گئے جہاں مصطفےٰ خاں شیفتہ سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ اُنہوں نے حالؔی کو اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کردیا۔

۱۸۶۹ء میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے انتقال کے بعد حالؔی نے لاہور کے پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازمت حاصل کی۔ حالؔی کے ذمے انگریزی کتابوں کے مواد کی نظر ثانی کے دَوران حالؔی کو انگریزی زبان وادب سے خاصی واقفیت ہوگئی۔ انگریزی کے وسیع لٹریچر اور اندازِ تنقید نے ان کے دل پر گہرا اثر ڈالا۔ حالؔی کے قیام لاہور کے دَوران ہی مولوی محمد حسین آزاد نے ''انجمنِ پنجاب لاہور'' میں موضوعاتی نظموں کے مشاعروں کی بنیاد ڈالی۔ حالؔی نے چار مسلسل موضوعاتی مظموں یا مثنویوں ''برکھارت، اُمید، تعصب اور حُبِ وطن'' کے ذریعہ ان مشاعروں میں شرکت کی۔

لاہور میں جب حالؔی کی طبیعت لگاتار خراب رہنے لگی تو وہ واپس دلّی آ گئے اور اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرسی اختیار کی۔ دہلی میں چند برس گذارنے کے بعد حالی کی طبیعت رنگین اور عشقیہ شاعری سے اُچاٹ ہوگئی اور اس کی جگہ ان کے ذہن ودل میں اصلاحِ قوم نے لے لی۔ عین اسی وقت حالؔی کی ملاقات سرسید احمد خان سے ہوئی جو علی گڑھ میں کالج کے قیام کے لئے کوشش کررہے تھے۔ سرسید سے ملاقات نے حالؔی کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کردیا۔ حالؔی جہاں ایک طرف علی گڑھ کالج کے قیام کے سلسلے میں سرسید کی معاونت کرنے لگے وہیں دوسری جانب سرسید سے متاثر ہوکر اردو ادب میں نئی اصناف پر طبع آزمائی کرنے لگے۔ حالؔی نے سرسید کی ہی ایما پر ''مدّ وجزرِ اسلام'' نامی شہرہ آفاق نظم لکھ ڈالی جو ''مسدّسِ حالی'' کے نام سے بھی مشہور ہے۔ یہ نظم آج بھی اردو شاعری کا ایک سنگِ میل تسلیم کی جاتی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۰﴾ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ کا انتقال کب ہوا؟

﴿۱۱﴾ دلّی میں حالی کی ملاقات کس شاعر سے ہوئی؟

﴿۱۲﴾ حالؔی کی پیدائش کس قصبے میں ہوئی؟

11.08 خلاصہ

سوانح نگاری ایک اہم ترین صنفِ ادب ہے جس کے مطالعہ سے ہم کسی شخص کی زندگی کے مکمل حالات سے بخوبی واقف ہوجاتے ہیں۔ سوانح نگاری کے ابتدائی نقوش ہمیں اردو تذکروں میں بھی ملتے ہیں اردو میں سوانح نگاری کی دو روایتیں ملتی ہیں۔ ایک کا تعلق تخلیق سے ہے اور دوسرے کا رشتہ تنقید سے ہے۔

کسی شخص کے حالاتِ زندگی سے واقف ہونا اس کی زندگی کی جدوجہد، کامیابی اور ناکامیوں کی داستان سننا، انسان کی فطری عادت ہے۔ سوانح نگاری دنیا کا ایک بہت پرانا طرزِ اظہار ہے اور اس کا وجود اس وقت عمل میں آچکا تھا جب انسان لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا اور نہ ہی طریقۂ تحریر وجود میں آیا تھا۔ اہلِ فن کی آراء کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ سوانح عمری تاریخ کا ایک حصہ ہے جس میں پوری ایمان داری اور سچائی کے ساتھ کسی فردِ واحد کی زندگی اور اس کی زندگی سے جڑے تمام واقعات کا تفصیلی مطالعہ شامل ہوتا ہے۔ سوانح نگاری اردو کے غیر افسانوی ادب کی وہ اہم صنف ہے جس میں کسی شخص کی حیات و کارنامے اور اس کے افکار و اقوال کا تہذیبی و معاشرتی ماحول کے پس منظر میں حقیقی، تاریخی اور ادبی و فنی سطحوں پر بیان ہوتا ہے۔

صالحہ عابد حسین کا نام اردو ادب میں بڑی عزت سے لیا جاتا ہے۔ آپ ایک معزز علمی خانوادے سے تعلق رکھتی ہیں۔ آپ کا ادبی سفر ۹ رسال کی عمر میں شروع ہوا۔ آپ کا تاریخی نام مصداق فاطمہ ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین سے شادی کے بعد آپ اردو کے منظر نامے پر صالحہ عابد حسین کے نام سے متعارف ہوئیں۔ آپ نے مضامین کے علاوہ بہت سے افسانے اور ناول لکھے جن میں اپنے عہد کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی۔ ناول اور افسانے کے علاوہ اُنہوں نے خاکے اور سوانح عمری جیسی اصناف پر بھی طبع آزمائی کی۔

''یادگارِ حالی'' سادہ اور رواں نثر میں لکھی گئی تصنیف ہے۔ صالحہ عابد حسین نے مستند حوالوں سے خواجہ الطاف حسین حالی کی شخصیت، ان کی زندگی کے نشیب و فراز اور ان کے افرادِ خانہ کے ساتھ ساتھ ان کے دوست احباب سب کا ذکر نہایت خوب صورتی کے ساتھ کیا ہے۔ اس سوانح عمری کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ نشو و نما، دوسرا آب و رنگ اور تیسرا برگ و بار ہے۔ پہلے حصے میں خواجہ الطاف حسین حالؔی کی پیدائش سے لے کر شادی اور ادبی سفر کے آغاز کا تفصیلی بیان ملتا ہے۔ دوسرے حصے میں ان کی جوانی کے حالات، واقعات اور سانحات کو سلسلے وار پیش کیا گیا ہے جب کہ تیسرے حصے میں حالی کی شاعری، ان کی اِنشا پردازی اور ان کی تنقیدی بصیرت سے مفصّل بحث کی گئی ہے۔ صالحہ عابد حسین کی یہ تصنیف خواجہ الطاف حسین حالؔی کی مکمل اور مبسوط سوانح عمری تو نہیں کہی جا سکتی لیکن اس حقیقت کا اعتراف ضرور کیا جانا چاہیے کہ موصوفہ نے اس مختصر سی اردو ادب کی اس عہد ساز اور انقلاب آفریں شخصیت کی زندگی کے تمام احوال مستند حوالوں سے قلم بند کر کے حالی کو اردو ادب کے قارئین سے روشناس کرانے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔

11.09 فرہنگ

اتالیق	: بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری انجام دینے والا	صعوبت	: پریشانی، تکلیف
		فراق	: جدائی، علاحدگی
پاپیادہ	: پیدل	ملحد	: دین سے گم راہ فرد
خوش الحانی	: اچھی آواز، مترنم آواز	نیست و نابود	: تباہ و برباد
سخن فہم	: شاعری اور ادب کی اچھی سمجھ	وصل	: ملاقات
شجرۂ نسب	: نسل اور خاندان کی ترتیب وار تفصیل		

11.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : حالی کی شاعرانہ خدمات پر ایک مختصر نوٹ دیجیے۔

سوال نمبر۲ : خواجہ الطاف حسین حالی کی ابتدائی زندگی پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۳ : سوانح کی تعریف کرتے ہوئے اس کے فن پر روشنی ڈالیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : حالی کی ادبی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۲ : سوانح عمری ''یادگارِ حالی'' کا عمومی جائزہ پیش کیجیے۔

سوال نمبر۳ : صالحہ عابد حسین کی سوانح نگاری پر تفصیل سے بحث کیجیے۔

11.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو ادب میں سوانح نگاری کا ارتقا	از	آنسہ الطاف فاطمہ
۲۔ اردو میں سوانح نگاری	از	سیّد شاہ علی
۳۔ فنِ سوانح نگاری	از	ڈاکٹر عبدالواسع
۴۔ فنِ سوانح نگاری ایک منفرد صنف ادب	از	ڈاکٹر قاضی عبدالہادی
۵۔ یادگار غالب	از	الطاف حسین حالی

11.12 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ سوانح نگاری کے مطالعے سے ہمیں کسی شخص کی زندگی کے مکمل حالات سے واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔

﴿۲﴾ سوانح نگاری کسی فرد یا شخص کے اعمال و افکار، تجربات و مشاہدات کے سچے اور ادبی اظہار کا نام ہے۔

﴿۳﴾ زمانہ قدیم میں لوگ اپنے بزرگوں کے کارنامے سینہ بہ سینہ ایک دوسرے میں منتقل کرتے تھے۔

﴿۴﴾ صالحہ عابد حسین کی پیدائش ۱۹۱۳ء میں پانی پت میں ہوئی۔

﴿۵﴾ ان کے افسانوں کا اولین مجموعہ ''نقشِ اول'' کے نام سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔

﴿۶﴾ ''زندگی کے کھیل'' اور ''الجھی ڈور'' صالحہ عابد حسین کے دو ناول ہیں۔

﴿۷﴾ ۱۹۵۰ء میں

﴿۸﴾ ۱۸۳۷ء میں

﴿۹﴾ سید جعفر علی سے

﴿۱۰﴾ ۱۸۶۹ء میں

﴿۱۱﴾ مرزا غالبؔ سے

﴿۱۲﴾ حالیؔ کی پیدائش قصبہ پانی پت میں ہوئی۔

اکائی 12 : یادوں کی برات: جوشؔ ملیح آبادی

ساخت

12.01 : اغراض ومقاصد

12.02 : تمہید

12.03 : سوانح نگاری کا فن

12.04 : شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی کے حالاتِ زندگی

12.05 : خودنوشت سوانح عمری ''یادوں کی برات'' کا عمومی جائزہ

12.06 : خودنوشت سوانح عمری ''یادوں کی برات'' کا اقتباس

12.07 : خودنوشت سوانح عمری ''یادوں کی برات'' کے اقتباس کا خلاصہ

12.08 : خلاصہ

12.09 : فرہنگ

12.10 : نمونہ امتحانی سوالات

12.11 : حوالہ جاتی کتب

12.12 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

12.01 اغراض ومقاصد

دیگر زبانوں کی طرح اردو زبان میں بھی سوانح نگاری کا سرمایہ موجود ہے۔ سوانح نگاری کا تعلق غیر افسانوی ادب سے ہے۔ یہ صنف تاریخ سے بہت قریب نظر آتی ہے۔ اگر چہ اس کی عمر دیگر اصناف کے مقابلے کم ہے لیکن اس کم عمری میں بھی اس صنف نے جس طرح ترقی کے مدارج طے کیے ہیں اس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ فنِ سوانح نگاری کے لئے عمیق مشاہدے، تجزیاتی ذہن اور نکتہ آفرینی کی ضرورت ہوتی ہے اس کے بعد ہی سوانح نگار فن سوانح سے انصاف کر پاتا ہے۔

اس اکائی میں سوانح نگاری کی تعریف پیش کی گئی ہے۔ سوانح نگاری کے موضوع اور لوازمات نیز فنی اُصول ومسائل کا جائزہ لیتے ہوئے جوشؔ ملیح آبادی اور ان کی خودنوشت سوانح ''یادوں کی برات'' پر بحث کی گئی ہے۔

12.02 تمہید

لفظ ''سوانح'' سانحہ کی جمع ہے، یہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ظاہر ہونے کے ہیں۔ بظاہر اس لفظ کی صراحت یوں کی جاسکتی ہے کہ ایک ایسا واقعہ جو وحشت انگیز ہو، سانحہ کہلاتا ہے۔ لیکن سوانح عمری سے مراد ایسا واقعہ ہے جس میں حیاتِ زندگی کی سرگزشت ہو اور اس میں اچھے برے یا تلخ و شیریں واقعات کی آمیزش ہو۔ انگریزی میں یہ لفظ Biography کہلاتا ہے۔ سوانح نگاری کی دو قسمیں ہیں۔ دوسری قسم خودنوشت سوانح عمری ہے جسے انگریزی میں Autobiography کہتے ہیں۔

12.03 سوانح نگاری کا فن

سوانح نگاری نے اردو میں اس وقت فن کی صورت اختیار کی جب سرسید اپنے رفقاء کے ساتھ سیاسی، سماجی اور ادبی فضا کو سنوارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ وہ زمانہ ہے جب فنّی شعور ناپختگی کے دن گزار رہا تھا۔ لہٰذا ابتدائی دنوں میں اس فن نے جو کچھ حاصل کیا وہ عربی اور فارسی کی دین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فن سوانح نگاری کے ابتدائی نمونے کے طور پر سیرت نگاری ہی کو تسلیم کیا جاتا رہا اور یہ سیرت نگاری نبی کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ سے تعلق رکھتی ہے۔ جس میں نبی کریم ﷺ کے اخلاق و عادات کا ذکر ملتا ہے۔

سوانح نگاری کے لئے تین شرائط ہیں۔

﴿۱﴾ صداقت کی تلاش ﴿۲﴾ شخصیت کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھنا۔

﴿۳﴾ موضوع کے انتخاب میں خواص کے ساتھ ساتھ عام انسانوں کے حالات کو بھی جاننا۔

دنیا کا سب سے پہلا سوانح نگار پلوٹارک کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے نزدیک سوانح نگاری دراصل صداقت کی تلاش ہے۔ اس نے اپنی سوانح نگاری میں شخصیت کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے موضوع کا انتخاب کیا ہے۔

سوانح تاریخ سے قریب نظر آتی ہے لیکن بعض خصوصیات اس میں ایسی ہوتی ہیں جن کی بنیاد پر اس کا شمار ادب میں ہوتا ہے جس میں ایک شخص کی ساری زندگی یعنی ماں کی گود سے قبر تک کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس صنف میں سوانح نگار ایک شخص کی شخصیت کی تعمیر اور اس کی مکمل تصویر اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس کی پوری شبیہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ مثلاً عادات و اطوار، اخلاق و معاشرت اور زندگی کے نشیب و فراز۔ گویا کہ سوانح نگار کی نگاہوں سے کوئی چیز اوجھل نہیں ہوتی لیکن سوانح نگار بعض باتوں سے چشم پوشی کرتا ہے کیوں کہ اس کے سامنے وہی باتیں اہمیت رکھتی ہیں جو کسی شخص کی زندگی پر روشنی ڈال سکے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں سوانح عمری کی تعریف یوں کی گئی ہے:

''سوانح عمری ایسا بیانیہ ہے جو کسی فرد کی زندگی اور شخصیت کی بازآفرینی اور اس کے عمل کو شعوری اور فن کارانہ انداز میں قلم بند کرنے کا تقاضہ کرتا ہے۔''

اور انسائیکلوپیڈیا امیریکانا میں سوانح عمری کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

''سوانح عمری کسی شخص کی حقیقی زندگی کا حساب کتاب ہے۔''

اردو کے مشہور ادیب ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے سوانح عمری کی ماہیت اور وسعت کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

''کسی بھی بڑے انسان کی سوانح عمری تنہا اُس کی سوانح عمری نہیں ہوتی۔ اس کا ماحول اور اس کے ماحول سے وابستہ بہت سے افراد اور اشخاص بھی اپنے ذہن اور زندگی کے اعتبار سے اس میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک سوانح عمری کا مطالعہ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی ایک انسان کی ہی زندگی کا مطالعہ نہیں ہے بلکہ اس سے وابستہ بہت سے پہلوؤں کا مطالعہ ہے جس میں تاریخ وتہذیب دونوں ہی سمٹ آتے ہیں۔''

غرض کہ سوانح ایک ایسی صنفِ ادب ہے جس میں کسی شخص کی زندگی کے محاسن اور معائب دونوں بیان کیے جاتے ہیں۔ اس صنف میں اس بات کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ شخصیت کے فرضی واقعات بیان کرتے وقت مبالغہ آمیز اُسلوب سے گریز کیا جائے۔

یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے کہ سوانح نگاری کا موضوع انسان ہے۔ انسان کے قد وقامت، شکل وصورت، عادات واطوار، سیرت وکردار، مشاغلِ زندگی، ظاہر وباطن اور اخلاق ومعاشرت، اعمال وافعال سے بھی کرتا ہے تاکہ انسان کی اندرونی اور بیرونی کائنات قاری کے سامنے پوری طرح واضح ہو سکے۔ معمولی سے معمولی انسان اور عظیم سے عظیم تر شخصیات سوانح کے موضوع بن سکتی ہیں کیوں کہ انتخابِ موضوع ہی اس صنف کے لئے بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ موضوع کے انتخاب کے وقت سوانح نگار دیانت داری اور غیر جانب داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسی شخصیتوں کا انتخاب کرے جس سے قربت یا عقیدت رکھتا ہو تاکہ صاحب سوانح کی زندگی کی سچی اور فطری تصویر قاری کے سامنے پیش ہو سکے۔ یوں تو ہر شخص کی زندگی میں بے شمار حادثات وواقعات رونما ہوتے ہیں لیکن ان میں سے صرف مفید اور کارآمد حادثات وواقعات کا ہی انتخاب ہونا چاہیے جو آسان نہیں ہے کیوں کہ انسان بذاتِ خود نفسیاتی اُلجھنوں اور پیچیدگیوں کی وجہ سے محشرِ خیال واقع ہوا ہے لہٰذا شخصیت کو پرکھنے کا رجحان فن سوانح نے ہی ہمیں دیا ہے۔ چوں کہ سوانح نگار ایک مصوّر رہوتا ہے جو کسی شخص کے ان تمام اوصاف کو شعوری یا لاشعوری طور پر پیش کرتا ہے، جو اس کی نظروں نے دیکھا ہے یا دل ودماغ نے محسوس کیا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ سوانح کا لغوی معنی کیا ہے؟۔

﴿۲﴾ سب سے پہلے سوانح نگار کا نام کیا ہے؟

﴿۳﴾ سوانح نگاری کی تعریف کیجیے۔

12.04 شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی کے حالاتِ زندگی

جوشؔ کا اصل نام شبیر حسن خاں تھا۔ ان کی پیدائش ۱۸۹۶ء میں اَودھ کے ایک جاگیردار گھرانے میں ہوئی۔ جوشؔ کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں زمانہ اور ماحول کے ساتھ خاندان کا بڑا دخل رہا ہے۔ وہ افغانی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا خاندان تلوار وقلم سے بیک وقت دوستی رکھتا تھا۔ ان کے والد نواب بشیر احمد خاں بشیرؔ شعر وادب سے شغف رکھتے تھے۔ گھروں میں مشاعرے ہوا کرتے تھے۔

جوشؔ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اساتذہ سے گلستاں، بوستاں، سکندر نامہ اور دیوانِ حافظ کا درس لیا۔ اردو کی تعلیم مولوی طاہر علی سے اور عربی کی تعلیم مولوی قدرت اللہ بیگ سے فارسی مولوی نیاز علی سے سیکھی اور انگریزی ماسٹر گومتی پرساد سے پڑھی۔ جوش باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر سکے اس کی وجہ غالباً یہ ہوسکتی ہے کہ وہ رئیس زادے تھے اور رئیس زادوں کو اپنے آباواجداد کی عظمت کا جس طرح احساس ہوتا ہے یا ان کی عظمت جس طرح حاوی ہو رہتی ہے ایسی صورت میں باقاعدہ تعلیم حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے لیکن جوشؔ کو اس بات کا احساس تھا بلکہ یہ احساس صدمہ کی حد تک تھا جس کا اظہار اُنہوں نے ''یادوں کی برات'' میں کیا ہے:

''عشق کی طرح مجھے حصولِ علم کا چسکا لڑکپن میں تھا..... میرے دن کتابوں کے مطالعے، شعر کی تخلیق، علما و شعرا کی صحبتوں میں بسر ہوا کرتے تھے۔''

شاعری انہیں وراثت میں ملی تھی۔ ذہین آدمی تھے۔ نو برس کی عمر سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ یادوں کی برات میں لکھتے ہیں۔

''نو برس کی عمر سے ہی شعر کی دیوی نے مجھے اپنی آغوش میں لے کر مجھ سے شعر کہلوانا شروع کر دیا''

جوشؔ نے شاعری ابتدا غزل سے کی تھی مگر غزل ان کی طبیعت کی جولانی کو بہت دیر تک اپنے حدود میں سمیٹنے سے قاصر رہی نتیجتاً نظم کی طرف مائل ہوئے اور جب ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی جس نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو جوشؔ نے ایک حساس شاعر کا ثبوت پیش کرتے ہوئے کئی نظمیں لکھ ڈالیں جن کے مطالعے سے ان کی ذہنی کش مکش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حالاتِ حاضرہ، طوفانِ بے ثباتی، گریۂ حسرت، برقِ عرفاں، دنیا، سانس لو یا خوش رو ہو، انتظار کے آخری لمحے وغیرہ نظمیں مذکورہ خیالات کی ترجمانی کرتی ہیں۔

دھیرے دھیرے حالات نے جب کروٹ بدلے تو جوشؔ کے مزاج میں بھی تبدیلی آئی۔ وہ رومانیت کی طرف مائل ہوئے عشق و عاشقی، گل و بلبل، نیاز مندی اور تمنائے ناز برداری کی منزلوں سے گزرتی ہوئی اپنے فنِ شاعری کی انتہا کو پہنچ گئی، اس سلسلے میں عاشق نواز، چاند کے انتظار میں، جفائے وعدہ پہلی مفارقت وغیرہ کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔

جوشؔ کی زندگی میں ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب اُنہوں نے ملکی اور غیر ملکی مسائل پر توجہ دینی شروع کر دی اور اس طرح کا شعر کہا:

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

جوشؔ نے ۱۵ر مجموعے اردو ادب کو دیے جن میں روحِ ادب، شعلہ و شبنم، نقش و نگار، فکر و نشاط، فنونِ حکمت، کلیم، جنون و حکمت، حرف و حکایات، آیات و نغمات، عرش و فرش، سنبل و سلاسل، سیف و سبو، سرود و خروش، سموم و صبا، قطرہ و قلزم، الہام و افکار ہیں۔ ۲۲ر فروری ۱۹۸۲ء کو جوشؔ ملیح آبادی نے اسلام آباد میں آخری سانس لی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۴﴾ جوشؔ ملیح آبادی کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

﴿۵﴾ جوشؔ ملیح آبادی نے اردو انگریزی کی تعلیم کن سے حاصل کی؟

﴿۶﴾ جوشؔ کے پانچ مجموعہ ہائے کلام کے نام لکھیے؟

12.05 خودنوشت سوانح عمری ''یادوں کی برات'' کا عمومی جائزہ

''یادوں کی برات'' ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ اردو کے مشہور شاعر جوشؔ ملیح آبادی کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ جوشؔ نے اپنی سوانح عمری لکھتے وقت قلم کی پوری طاقت صرف کردی ہے۔ سوانح عمری کا مطالعہ یہ باور کراتا ہے کہ آج تک کسی دوسرے شاعر یا دیب نے اس طرح اپنی زندگی کے حالات کو بیان نہیں کیا ہے جس طرح جوشؔ مختلف جگہوں پر اپنے اُسلوب کی جولانی دکھاتے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے آباواجداد سے لے کر اپنے احباب تک، بچوں سے لے کر بوڑھوں تک، لونڈیوں سے لے کر محلوں تک کا نقشہ کسی جھجک، تکلف اور بلاخوفِ رسوائی کے کھینچا ہے۔ ماہرالقادری نے یادوں کی برات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''جوش صاحب جنسی معاملات، ہوس ناک واردات اور تجربوں کے اظہار میں شرم وغیرت کو بُزدلی اور نامردی سمجھتے ہیں، اس لئے ''یادوں کی برات'' اپنی جگہ عریانی و برہنگی کا کوک شاستر بن گئی ہے۔''

جوشؔ ملیح آبادی نے اس کتاب میں بعض مقامات پر نثر میں شاعری کی ہے۔ ان کا اُسلوب صاحبِ ذوق کے اندر تجسس کے مادہ کو جنم دے گا۔ کس بات کو کس سلیقے سے ادا کرنا چاہیے، کن الفاظ کی مدد لینی چاہیے، کون سا جملہ کہاں اور کیسے لکھنا چاہیے، یہ تمام باتیں جوشؔ صاحب خوب جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اُسلوب نگارش نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کتاب میں لکھنؤ کی تہذیب، معروف وغیر معروف اشخاص کا تعارف جس طرح اُنہوں نے کرایا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔

صاحبِ کتاب نے بعض جگہوں پر ایسے محاوروں اور کہاوتوں کا برمحل استعمال کر کے نئی نسل کو گمراہ ہونے سے بچالیا ہے جسے ہماری نسل بھولتی جارہی تھی۔ بعض جگہوں پر اُنہوں نے تیوہاروں، کھیلوں، مٹھائیوں، سواریوں، زیوروں اور کپڑوں کے ناموں کا استعمال کر کے اس کتاب میں جان ڈال دی ہے۔ دراصل ان کا تعلق جاگیردارانہ گھرانے سے تھا ظاہر ہے کہ گھروں میں جس طرح کا ماحول تھا جس طرح کی زندگی تھی اس کا اظہار ناگزیر تھا۔ کہیں کہیں اُنہوں نے مبالغے سے بھی کام لیا بعض واقعات کو پیش کرنے میں نمک مرچ کا بھی سہارا لیا ہے۔ مثلاً جن عورتوں سے ان کا سابقہ پڑتا ہے ان میں کوئی حور ہے، کوئی پیکرِ مجسمۂ حُسن، کوئی ماہتاب ہے تو کوئی آفتاب۔ ان کے محبوب کے حُسن و جمال کو دیکھ کر یا محسوس کر کے ایسا لگتا ہے کہ اُنہوں نے خودنوشت سوانح عمری نہیں لکھی بلکہ داستان لکھی۔ کیوں کہ کوئی جوشؔ کے فراق میں زہر کھاتی ہے تو کوئی سمندر میں ڈوب کر جان دے دیتی ہے۔ اسی طرح بہت سارے واقعات ہیں جن کا اظہار جوشؔ نے اپنے قلم سے کیا ہے۔ مبالغے کی ایک مثال دیکھیں۔ لکھتے ہیں:

> ''جوش صاحب کے والد بزرگوار کے یہاں بٹیر پالنے پر سپاہی مامور تھے۔''

مزید ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> ''علی گڑھ یونیورسٹی تھی دو انٹرمیڈیٹ کالج اور کئی ہائی اسکول تھے.....مگر قصبہ ملیح آباد میں اب سے پچاس سال قبل موٹر ٹیکسیاں چلتی تھیں۔''

یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ جوشؔ کی خودنوشت سوانح عمری ایک شان دار نثری قصیدہ ہے جسے مصنّف نے خود لکھا ہے مبالغہ آرائی، ملمّع سازی کی بہتات ہے۔ کتاب ۸۲۷ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے جس میں جوشؔ کی رنگین مزاج طبیعت ہر جگہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہتی ہے۔

12.06 خودنوشت سوانح عمری ''یادوں کی برات'' کا اقتباس

(میرے عنفوانِ شباب تک کا ہندوستان)

میرے حالات کے ساتھ ساتھ۔ میرے اس ہندوستان کے تہذیبی و معاشرتی حالات بھی سن لیجیے، جس نے مجھ کو متاثر کیا اور سانچے میں ڈھالا تھا۔

تہذیبی اعتبار سے اس وقت ہندوستان دوراہے پر کھڑا ہوا سوچ رہا تھا، کہ مشرقیت پر قائم رہے یا مغربیت کی طرف مڑ جائے؟ ملک اس وقت ''خالص مشرقی''، ''نیم مشرقی'' اور ''مغربی'' ان تین گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔

خالص مشرقی گروہ کے چہروں پر لانبی خشخشی داڑھیاں تھیں اور سروں پر پٹے، پٹوں پر عمامے، دستاریں، شملے یا دو پلی اور چوگوشیا ٹوپیاں۔ پاؤں میں گھتلے یا سلیم شاہی جوتے۔ بڑے پائینچو کے پائجامے یا اوربی گھٹنے۔ عبائیں قبائیں، انگرکھے، دگلے، شانوں اور کمروں پر بڑے بڑے رومال، چکن کے کُرتے، روئی کی صدریاں اور ہاتھوں میں خاکِ شفا کی تسبیحیں، انگلیوں میں فیروزے کی انگوٹھیاں۔ ہولا اور شام لگی جرابیں۔

نیم مشرقی گروہ داڑھی منڈاتا، شیروانیاں، چست پائجامے، پمپ جوتے استعمال کرتا اور جیبوں میں گھڑی رکھتا تھا، جن کی زنجیریں دونوں جیبوں کے درمیان لٹکتی رہتی تھیں۔

اور مغربی گروہ سوٹ بوٹ اور ہیٹ میں غرق رہتا تھا لیکن داڑھی کے ساتھ مونچھیں نہیں منڈواتا تھا۔

فرنگیوں کے نقیب پنڈت مدن موہن مالویہ اور سرسید احمد خاں اپنے اپنے چیلے چاپڑوں کے ساتھ مغربیت کے فروغ کی سعی کر رہے تھے لیکن اس وقت تک مشرقیت اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ مغربیت ہر چند اُبھرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی، مگر قومی مشرقیت اس کا گلا دبائے ہوئے تھی اور سوٹ پہننے والوں کو ''پلپلی صاحب'' کہا جاتا تھا۔

کھیلوں میں بھی ہندوستانی کھیل، یعنی گلّی ڈنڈا، پتنگ، آتی پاتی، چھلچلی، کبڈی، آنکھ مچولی، ست گھڑا، گپّل، گولیاں، اندھا مرغا، للّی گھوڑی، شطرنج، چوسر..... تیرا کی، بانک، بنوٹ، پٹا، کشتی، ڈنڈا اور مگدر..... مرغ بازی، بٹیر بازی اور تیتر بازی کا عام رواج تھا اور فٹ بال، ہاکی، ٹینس، پنگ پانگ، بیڈمنٹن، تاش اور کرکٹ کو کوئی منھ نہیں لگاتا تھا۔

اسی طرح ڈولیوں، پالکیوں، نالکیوں، فنسوں، میانوں، ہواداروں، گھوڑوں بند گھوڑا گاڑیوں اور ہاتھیوں کی سواریوں کے آگے لینڈوئیں، ٹمٹمیں، فٹنیں، موٹریں اور سائیکلیں غیر ثقہ سواریاں سمجھی جاتی تھیں۔ مشرقی و مغربی لوگوں کی راتیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی تھیں..... ادھر شام ہوتے ہی نوابوں اور رئیسوں کے محلوں میں جھاڑ فانوس، شمعیں اور اِسّے روشن کر دیے جاتے۔ عود سلگتا، عطردان کھلتے، خاص دانوں میں گلوریاں آتیں، چاندی سونے کی چمیٹوں سے اٹھا اٹھا کر پان کھائے جاتے معطر حقے اور سٹکیں گڑگڑاتی..... علمی مباحث، مشاعرے اور مجرے ہوا کرتے تھے۔

ادھر کلبوں میں تاش کھیلے جاتے، بیڈمنٹن کی اچھل کود ہوتی، پیانو بجتا، گراموفون گھڑگھڑاتا، سگرٹوں کی بو اُڑتی..... کالی پیلی مِس ''سِکورا'' یا ''مسز لیچر'' مغربی دھنوں میں شور غوغا کیا کرتیں اور جب پیڑو سے پیڑو رگڑواتا ڈانس شروع ہوتا تو بینڈ چیخنے لگتا اور عمدہ بجانے

والے کو زور زور سے تالیاں بجا کر داد دی جاتی تھی اور ہماری زبان میں وہ سب تالی پٹے ہوئے، لونڈے گھیرے بن جایا کرتے تھے۔ اِدھر، فرش یا چوکیوں پر دسترخوان بچھا کر ہاتھوں سے اور اُدھر میزوں پر، کانٹے چھری رکھ کر، چھری کانٹے سے کھانا کھایا جاتا۔ چوں کہ فرنگی تہذیب اس وقت تک مغرب پرستوں کو بھی ہضم نہیں ہوسکتی تھی، اس لئے چھری کانٹوں سے برابر کھٹ کھٹ کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ گاہ گاہ وہ آلاتِ خوراک تڑ سے فرش پر بھی گر جایا کرتے تھے۔ یا بے گلی مرغ کی ٹانگ اُڑ کر کسی کی ناک سے ٹکرا جایا کرتی تھی۔ دونوں کے کھانوں میں بھی زمین آسمان کا فرق تھا۔ اِدھر کے کھانے تھے۔

﴿۱﴾ قورمہ، قلیا، کوفتے، شامی کباب، سیخ کباب، بوٹی کباب، لگن کباب، آنت کباب، مچھلی کباب، دَم پُخت کباب، نرگسی کباب، ران کباب، مرغ، تیتر، کبوتر، بٹیر، شب دیگ، کلّے پائے، کھیری، سری، بھیجا، کلیجی، گردے، دَم پُخت بکرے، قیمہ، قیمہ بھرے کریلے، دھوئی ماش کی دال، کھڑے مسور کی دال، خاگینہ، چلّے، ستارے، بھنی رانیں، بریانی، پلاؤ، مرغ پلاؤ، تیتر پلاؤ، بٹیر پلاؤ، بوٹ پلاؤ، چکتی پلاؤ وغیرہ۔

﴿۲﴾ مٹھائیوں میں حبشی حلوا، سوہن پپڑی، حلوا سوہن، زردہ، انار کا زردہ، پستے بادام کا زردہ، مزعفر، کھیر، شیر خرما، لچھّے، بالائی، میٹھے سموسے، قلفیاں، بالائی کے آبخورے، نمش، پنڈیاں، رساوَل، گڑ مبا، پیوسی، برفی، جلیبیاں، امرتیاں، لڈو، باجرے کا ملیدہ، قلاقند، گلاب جامن، پیڑے، بیٹھا، اندرسے، دندان مصری، شکر پارے، لوز، چٹنیا اور مربّے،

﴿۳﴾ دہی، رائیتا، پھلکیاں، دہی، دہی برے، تلی دالیں..... چلّے، تکونے، سموسے، سُہال، پاپڑ، نمک پارے، کھچڑیاں، دال موٹ، سیو، تلی اَروی، بھرتے ساگ، مہری، قبولی، خشکہ، گوجھے، منگچیاں اور کھوٹے۔ چپاتی، ورقی چپاتی، دہری چپاتی، پھُلکے، گردے، خمیری، شیر مال، دوسے لے کر اٹھارہ اٹھارہ پرتوں کے پراٹھے، روغنی روٹی، بیسنی روٹی، باقرخوانی۔

اور ادھر کا کھانا تھا۔ سوپ، چاپ، کٹلٹ، اُبلی مچھلی، اُبلا مرغ، اُبلے آلو، اُبلا مٹر، اُبلی ترکاریاں ڈبل روٹی، مکھن، پڈنگ، پیسٹری، آئس کریم جیلی، ساس اور کیک۔ بس اللہ اللہ خیر سلا۔

ہر چند سر سید گزیدہ انگریزی خوانوں میں فرنگی کی نقالی اور پرستاروں کا ذوق روبہ ترقی تھا مگر ان کی عورتیں ٹھیٹھ ہندوستان تھیں اور موئے کالا پانی پینے والوں سے ان کو شدید نفرت تھی۔

گھروں میں مغربی فرنیچر کا کہیں نام بھی نہیں تھا۔ وہی پرانے زمانے کی مسہریاں، وہی چھپر کھٹ، وہی نیچے پایوں کے تختوں کے چوکے، چوکوں پر مسندیں، قالین، چاندنیاں، گاؤ تکیے، میر فرش، اُگالدان، الائچی دان، پاندان اور خاص دان، لباس میں بھی وہی قدیم تراش خراش قائم رہی۔ وہی پائینچوں کے کلی دار پاجامے، جن کے گوشے چلتے وقت خادمائیں اُٹھا لیتی تھیں، وہی انگیا، وہی کرتی، وہی انگیاؤں کی چڑیاں، وہی شلوکے، وہی دوپٹے، وہی دلائیاں اور وہی رضائیاں، وہی پرانا تیل پھلیل تھا، وہی کاجل، وہی مسّی، وہی سرمہ، وہی مہندی اور وہی افشاں چلی آرہی تھی..... صابون کا استعمال بہت کم تھا، کھلی بیسن اور اُبٹن سے کام لیا جاتا تھا۔

کنواریوں کو، بے کلیوں کے سیدھے پاجامے پہنائے جاتے تھے۔ ان کی ناک میں، ایک موتی کی چھوٹی سی نتھنی ہوتی یا نیم کا تنکا۔ ان کو پان کھانے، مسی لگانے اور افشاں چھڑکنے کی عادت نہیں تھی اور مانگ نکالنے کے بدلے ان کے سروں پر بینڈھیاں گوندھی جاتی تھیں (جس سے چوخانہ سا بن جاتا تھا۔)

اس دَور کے زیوروں کے بھی نام سن لیجیے۔

(۱) سر پر: چھپکا (۲) ماتھے پر: سراسری، ٹیکا سمیت (۳) کانوں میں: پتے، بالیاں، جھمکے، بالے، بجلی، مگر، بُندے، جھالے، انتیاں اور کرن پھول (۴) ناک میں: نتھنی، بلاق اور کیل (۵) گلے میں: طوق، گلوبند، بدھی، زنجیر، چنن ہار، دھدکی، چمپا کلی اور ہیکل (۶) بانہوں میں: جوشن، نونگے، بازوبند، اکا اور چھوٹا سا عطردان (۷) کلائیوں میں: کڑے، چوہے دنتیاں، بانکے، چوڑیاں، کرملیاں پہنچیاں، سمرنیں، کنگن اور جہاں گیریاں (۸) انگلیوں میں چھلے، انگوٹھیاں، آرسی اور علی بند (جس میں سونے اور چاندی کی زنجیریں ہوتی تھیں) (۹) پاؤں میں: چھاگل، جھانجنیں، رام جھول، بچھوے، کڑے، چھڑے، لچھے اور پازیب (۱۰) پاؤں کی انگلیوں میں: چھلے (جن میں انگوٹھے سے لے کر چھنگلیا تک سونے یا چاندی کی زنجیر ہوتی تھی)۔

نواب صاحب کی بیگم ہوں یا بیرسٹر صاحب کی بیٹر ہاف (Better Half) دونوں بڑی سختی کے ساتھ، پردے کی پابند تھیں، ڈولی اور پالکی کے سوا، کوئی بی بی گھر سے باہر قدم نہیں رکھتی تھی۔ اور تو اور عورتوں کی آوازیں اور ان کا وزن بھی پردہ نشیں تھا، یعنی کوئی بی بی اس قدر زور سے نہیں بولتی تھی کہ مردانے تک اس کی آواز جا سکے، اور جب کوئی خاتون پالکی میں سوار ہوتی تھیں تو پتھر کا ٹکڑا یا سِل پالکی میں رکھ دی جاتی تھی کہ کہاروں کو اس کے جسم کا اندازہ نہ ہو سکے اور بیبیاں، مامائیں، اصیلیں اور لونڈیاں باندیاں تک پردے کی پابند تھیں۔

زنانے میں آنے جانے والے بیرونی بچوں سے بھی جب وہ دَس گیارہ سال کے ہو جاتے تھے، پردہ شروع کر دیا جاتا تھا اور مشکوک چال چلن کی عورتوں سے بھی پردہ کیا جاتا تھا اور تو اور باپ، دادا، نانا، چچا اور پھپا کے سامنے بھی عورتیں سروں پر پلّو ڈال کر جایا کرتی تھیں اور کسی عورت کی یہ مجال نہیں تھی کہ وہ اپنے بزرگوں کی موجودگی میں اپنے بچے کو گود میں لے لے۔

اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ملیح آباد کے ایک صاحب کے لڑکے کی شادی میں ناچ ہو رہا تھا کہ بالا خانے سے ایک عورت جھانک کر ادھر دیکھنے لگی۔ اور صاحبانِ محفل میں سے ایک صاحب نے اس کو بندوق ماردی، صاحبِ خانہ دیگوں کے حلقے میں کھڑے تھے کہ اُنہوں نے گولی چلنے کی آواز سنی اور دَوڑے ہوئے محفل میں آئے۔ گولی مارنے والے خاں صاحب نے ان سے کہا ''بھائی! آپ کی بیوی اوپر سے جھانک رہی تھی مجھ سے یہ بے حیائی برداشت نہیں ہوئی۔ میں نے گولی ماردی۔'' صاحبِ خانہ نے ان کی پیٹھ ٹھونک کر کہا ''بہت اچھا کیا آپ نے'' اور فوراً اندر چلے گئے اور تھوڑی دیر میں ایک لاش گھسیٹتے ہوئے آئے اور کہا ''بھائی دیکھ لیجیے میری بیوی نہیں لونڈی جھانک رہی تھی۔ اللہ نے میری آبرو اور میری جان دونوں چیزیں بچالیں۔

سیاسی اعتبار سے اس وقت سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پو پھٹنے میں بہت دیر تھی۔ رات کے دو یا تین بجے کا وقت تھا۔ لوگوں کی اکثریت خرّاٹے لے رہی تھی۔ کچھ دیر بستروں پر پڑے کروٹیں لے اور کنمنا رہے تھے اور بہت تھوڑے لوگ تِلک اور گوکھلے کے گجرسن کر بیدار ہو گئے اور دھیمے سروں میں آزادی کے چرچے کر رہے تھے۔ اور بھارت ماتا چوکنا ہو کر اور اِدھر اُدھر دیکھ کر، دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ ع

از کجا می آید ایں آواز دوست

فرنگی کے کان تک بھی وہ آوازیں پہنچ رہی تھیں لیکن اس کا غرور کہہ رہا تھا کہ

یہ ہوا، میرے چراغوں کو بجھا سکتی نہیں

لیکن مہاتما گاندھی جس وقت لنگوٹ باندھ کر میدان میں کود پڑے تو پو پھٹ گئی اور ہر طرف سے یہ آوازیں لگیں کہ تخت یا تختہ..... آزادی یا موت..... یا ایوانِ فرنگی مسمار، یا تختۂ دار۔

گاندھی کی آندھی نے حکومت کے اوسان اُڑا دیے۔ حکومت یہ سوچ کر ہاتھ ملنے لگی کہ ہم نے مسلمانوں کے ایک فرقے کو دوسرے فرقے، اور ہندوؤں کے ایک فرقے کو دوسرے فرقے اور پھر بحیثیت مجموعی، ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا دینے کے سلسلے میں جو لاکھوں روپیہ، پانی کی طرح بہا دیا، وہ بے کار گیا اور سارے مسلمان اور ہندو مل کر آج ہمارے مقابلے کے واسطے آ گئے۔ یہ علامت نہایت خطرناک ہے۔ کیا تدارک کیا جائے اس فتنۂ عظیم کا؟

آخر کار حکومت نے ایک منصوبہ تیار کر لیا۔ پولیس اور فوج کے حلقے میں بگل بجا دیا گیا۔ ایک طرف تو جیلوں کے دروازے کھول دیے گئے۔ لاٹھیاں برسنے اور گولیاں چلنے لگیں اور دوسری طرف پکڑ بلوایا گیا ہندوؤں اور مسلمانوں کے دینی رہنماؤں، یعنی مہامہوپدھیاؤں، اور شمس العلماؤں کو، جن کو ہندو مسلم فسادات برپا کرا دینے کے لئے برسوں سے گھر بیٹھے وظیفے مل رہے تھے اور بری طرح پھٹکارا گیا ان کو، کہ اُنہوں نے ایسی غفلت کیوں برتی کہ ہندو مسلم اتحاد کا فتنہ برپا ہو گیا اور اس کے ساتھ ساتھ پکارا گیا ان تمام نوابوں، رائٹ آنریبلوں، خان بہادروں، رائے بہادروں، رئیسوں، تاجروں، سیٹھوں، سودخوروں، زمین داروں، جاگیرداروں، تعلقہ داروں اور دیسی ریاستوں کے شہر یاروں کو، جن کو حکومت سانڈوں کی طرح پالے تھی..... کہا کہ اے پٹھوؤ کانگریس کی طرف اپنی توپوں کے منہ موڑ دو اور آزادی کے دیوانوں پر اپنے کتے چھوڑ دو۔

اب کیا تھا، ہر طرف پکڑ دھکڑ کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ جیلیں بھری جانے لگیں، سولیاں کھڑی کر دی گئیں اور ہر جانب سے غلغلے بلند ہونے لگے کہ خاک میں ملا کر رکھ دیا، انگریز بہادر کے غداروں کو۔ یہاں تک کہ آگے چل کر جلیاں والے باغ کی زمین خون میں ڈوب گئی اور تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہونے لگیں لاشیں محبانِ وطن کی اور آسمان سے آنے لگیں صدائیں۔

کسے نہ ماند کہ او را تیغ ناز کشی مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۷﴾ ہماری نسل ادب کی کون سی چیز بھولتی جا رہی ہے؟ جسے جوشؔ نے ''یادوں کی برات'' میں لکھا ہے؟

﴿۸﴾ ''یادوں کی برات اپنی جگہ عریانی اور برہنگی کا لوک شاستر بن گئی ہے۔'' یہ کس کا قول ہے؟

﴿۹﴾ ''نیم مشرقی گروہ داڑھی منڈاتا' شیروانیاں، چست پائجامے پہنتا اور جیبوں میں گھڑی رکھتا تھا۔''
اِس میں کس دَور کی منظر کشی ہے؟

12.07 خودنوشت سوانح عمری ''یادوں کی برات'' کے اقتباس کا خلاصہ

اس اقتباس میں اُردو کے مشہور شاعر اور ادیب جوشؔ ملیح آبادی جن کی خودنوشت سوانح عمری ''یادوں کی برات'' ہے میں ایسا نقشہ کھینچتے ہیں کہ آزادی سے قبل کا ہندوستان آنکھوں کے سامنے رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس ہندوستان کا ذکر ہے جس پر مغربی افکار حاوی ہے۔ ہندوستانیوں میں بالخصوص مسلمانوں اور پنجابیوں اور غیر ملکیوں میں انگریزوں کا ذکر ملتا ہے۔ تینوں اقوام کی نشان دہی ان کے لباسوں، کھیلوں

اور کھانوں سے کی گئی ہے۔ لباس کا ذکر ہو رہا ہے تو ہر طرح کے لباس موجود ہیں جیسے چکن کے کرتے، شیروانیاں، چست پائجامے، پمپ جوتے، سوٹ بوٹ وغیرہ۔ کھیلوں کا ذکر کرتے ہیں تو گلی ڈنڈا، پتنگ، کبڈی، آنکھ مچولی، شطرنج اور چوسر.....مرغ بازی، بٹیر بازی اور تیتر بازی.....فٹ بال، ہاکی، ٹینس، بیڈمنٹن، تاش اور کرکٹ وغیرہ۔ دسترخوان کا اس طرح ذکر کرتے ہیں: قورمہ، قلیا، کوفتے، شامی کباب، بوٹی کباب، مرغ، تیتر، بٹیر، کلیجی، گردے، قیمہ بھرے کریلے، مرغ پلاؤ، بوٹ وغیرہ۔ سوپ، چاپ، کٹلٹ، اُبلا مرغ، ڈبل، روٹی، مکھن، پیسٹری، آئس کریم وغیرہ۔

جوشؔ نے یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس زمانے میں عورتیں گھر کی زینت ہوا کرتی تھیں۔ پردے کا سختی سے انتظام ہوتا تھا۔ ڈولی اور پالکی کے بغیر کوئی عورت گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی تھی۔ عورتوں کی آواز گھر کی چہار دیواری سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔ زنان خانے میں آنے والے ان بچوں سے بھی پردہ کیا جاتا جو عنفوانِ شباب کو پہنچنے والے ہوتے تھے۔ باپ، دادا اور چچا سے پردہ لازمی تھا۔

یہ تمام واقعات جلیاں نوالہ باغ سے قبل کے ہیں۔ ہر طرف آزادی کے متوالے اپنی آزادی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ حکومتِ وقت کی نیند غائب ہو چکی تھی۔ چاروں طرف منصوبے بنائے جا رہے تھے۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کو جیلوں میں بھرنے کی سازش شروع کر دی۔

انگریزوں نے ہندوستانیوں پر ظلم کے بادل گہرے کر دیے۔ جلیاں والا باغ میں ہندوستانی جمع تھے، جنرل ڈائر کے اشارے سے معصوم ہندوستانیوں کے خون سے انگریز قوم نے ہولی کھیلی۔

یہاں جوشؔ کے انداز بیان کی ہر وہ شخص داد دے گا جو اہل قلم زبان کے مزاج کے اُصولوں اور نزاکتوں کو سمجھتا ہے اس میں لکھنو کی تہذیب بھی ہے اور زبان بھی۔ اشخاص کے تعارف بھی اور تیوہاروں، کھانوں اور سواریوں کی اقسام بھی۔ غرض کہ جوشؔ نے اس کتاب کو لکھنے میں جس ریاضت، محنت اور عزم و خود و اعتمادی کا ثبوت دیا ہے یہ ان کی صلاحیت پر دال ہے۔

12.08 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے سوانح نگاری کے فن اور ممتاز و معروف شاعر اور ادیب جوشؔ ملیح آبادی کی حیات اور خدمات اور ان کی خود نوشت سوانح عمری سے آپ کو واقف کرایا۔ سوانح، لفظ سانحہ کی جمع ہے یہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ''ظاہر ہونا'' ہے جس کے لئے عمیق مشاہدے اور تجزیاتی ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ فن عربی اور فارسی زبان سے ہوتے ہوئے اردو ادب میں داخل ہوا۔

سوانح نگاری کے لئے تین شرائط ہیں۔

﴿۱﴾ صداقت کی تلاش ﴿۲﴾ شخصیت کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھنا۔

﴿۳﴾ موضوع کے انتخاب میں خواص کے ساتھ ساتھ عام انسانوں کے حالات کو بھی جاننا۔

دنیا کا سب سے پہلا سوانح نگار پلوٹارک تھا اس کے نزدیک سوانح نگاری صداقت کی تلاش ہے۔ اس صنف میں ماں کی گود سے لحد تک کا تذکرہ ہوتا ہے۔ سوانح نگاری کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کے کردار کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ پوری شبیہ سامنے آ جاتی ہے۔ سوانح نگاری کا موضوع چوں کہ انسان ہوتا ہے لہٰذا سوانح لکھتے وقت صاحب سوانح کے عادات و اطوار، سیرت و کردار، ظاہر و باطن

اور اخلاق و معاشرت سے اس کے کردار کی تشکیل ہوتی ہے لیکن ایسا کرتے وقت سوانح نگار کا ایمان دار اور غیر جانب دار ہونا نہایت ضروری ہے۔

اردو میں سوانح نگاری کی باضابطہ ابتدا الطاف حسین حالؔی سے ہوتی ہے اس کے بعد شبلی نعمانی نے اس فن کو تقویت بخشی۔ حالؔی کی سوانح حیات میں حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید ہیں۔ شبلی نے المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم، سیرۃ النبی ﷺ لکھی۔ صالحہ عابد حسین نے یادگارِ حالی لکھی۔

جوشؔ ملیح آبادی کا اصل نام شبیر حسن خاں تھا۔ ان کی پیدائش ۱۸۹۶ء میں ہوئی۔ ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ان کے گھر کا بڑا دخل رہا ہے۔ شاعری انہیں وراثت میں ملی تھی۔ اُنہوں نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی لیکن بہت دنوں تک غزل کے سحر میں خود کو محصور نہ کر سکے لہٰذا نظم کی طرف مائل ہوئے اُنہوں نے ۱۵/ مجموعے ادب کو دیے جس میں روح ادب، شبنم، نقش و نگار، فکر و نشاط، فنون حکمت، جنون و حکمت، حرف و حکایت، آیات و نغمات، عرش و فرش، سنبل و سلاسل، سیف و سبو، سموم و صبا وغیرہ ہیں۔ ۲۲/ فروری ۱۹۸۲ء میں جوش ملیح آبادی نے اسلام آباد میں زندگی کی آخری سانس لی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۰﴾ ''فساد'' کی جمع کیا ہے؟

﴿۱۱﴾ ''اَفکار'' کا واحد کیا ہے؟

﴿۱۲﴾ ''اَقوام'' کا واحد کیا ہے؟

12.09 فرہنگ

بشری	: انسانی	گوشہ	: حصہ
پرستار	: شیدائی	محاسن	: خوبی
تشنہ	: پیاسا	معائب	: عیب کی جمع
تغیر	: تبدیلی	ملحوظ	: لحاظ کی جمع
شبیہ	: شکل	نشیب و فراز	: اتار چڑھاؤ
صداقت	: سچائی		

12.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : یادوں کی بارات کا خلاصہ لکھیے۔

سوال نمبر۲ : جوشؔ ملیح آبادی کی حالات زندگی بیان کیجیے

سوال نمبر۳ : سوانح نگاری کی تعریف مختلف لغات کی روشنی میں کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : سوانح نگاری کے شرائط پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۲ : خودنوشت سوانح عمری ''یادوں کی برات'' کا عمومی جائزہ پیش کیجیے۔

سوال نمبر۳ : ''یادوں کی برات'' کو ادبی اعتبار سے کیا مقام حاصل ہے۔ بحث کیجیے

12.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو ادب میں سوانح نگاری کا ارتقا	از	آنسہ الطاف فاطمہ
۲۔ اردو میں سوانح نگاری	از	سیّد شاہ علی
۳۔ جوشؔ ملیح آبادی	از	ظفر محمود
۴۔ چند ادبی شخصیات	از	شاہد احمد دہلوی

12.12 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ سوانح، سانحہ کی جمع ہے جس کا معنی ''ظاہر ہونا'' ہے۔

﴿۲﴾ پلوٹارک

﴿۳﴾ ایسا واقعہ جس میں زندگی کی سرگزشت ہوں۔

﴿۴﴾ ۱۸۹۶ء میں اودھ کے ایک جاگیردار گھرانے میں

﴿۵﴾ اُردو کی تعلیم مولوی طاہر علی سے اور انگریزی کی ماسٹر گومتی پرساد سے۔

﴿۶﴾ روحِ ادب، شعلہ و شبنم، نقش و نگار، فکر و نشاط، فنون حکمت

﴿۷﴾ محاوروں اور کہاوتوں کا برمحل استعمال

﴿۸﴾ ماہر القادری کا

﴿۹﴾ اس جملے میں جوشؔ کے دَور کی معاشرتی طرز رہائش اور لباس کی منظر کشی ہے۔

﴿۱۰﴾ فسادات

﴿۱۱﴾ فکر

﴿۱۲﴾ قوم

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

Teenpani Bypass Road, Behind Transport Nagar
Haldwani - 263 139, Nainital (Uttrakhand)

Phone: 05946-261122, 261123 Fax No.: 05946-264232
www.uou.ac.in email: info@uou.ac.in
Toll Free No: 1800 180 4025

https://www.youtube.com/@91.2fmhellohaldwani7

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی کا عوامی ریڈیو جس کے ذریعہ طلبا کے لئے مفید پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔

https://www.youtube.com/@uoulive

BAUL(N)-121-1(004006)